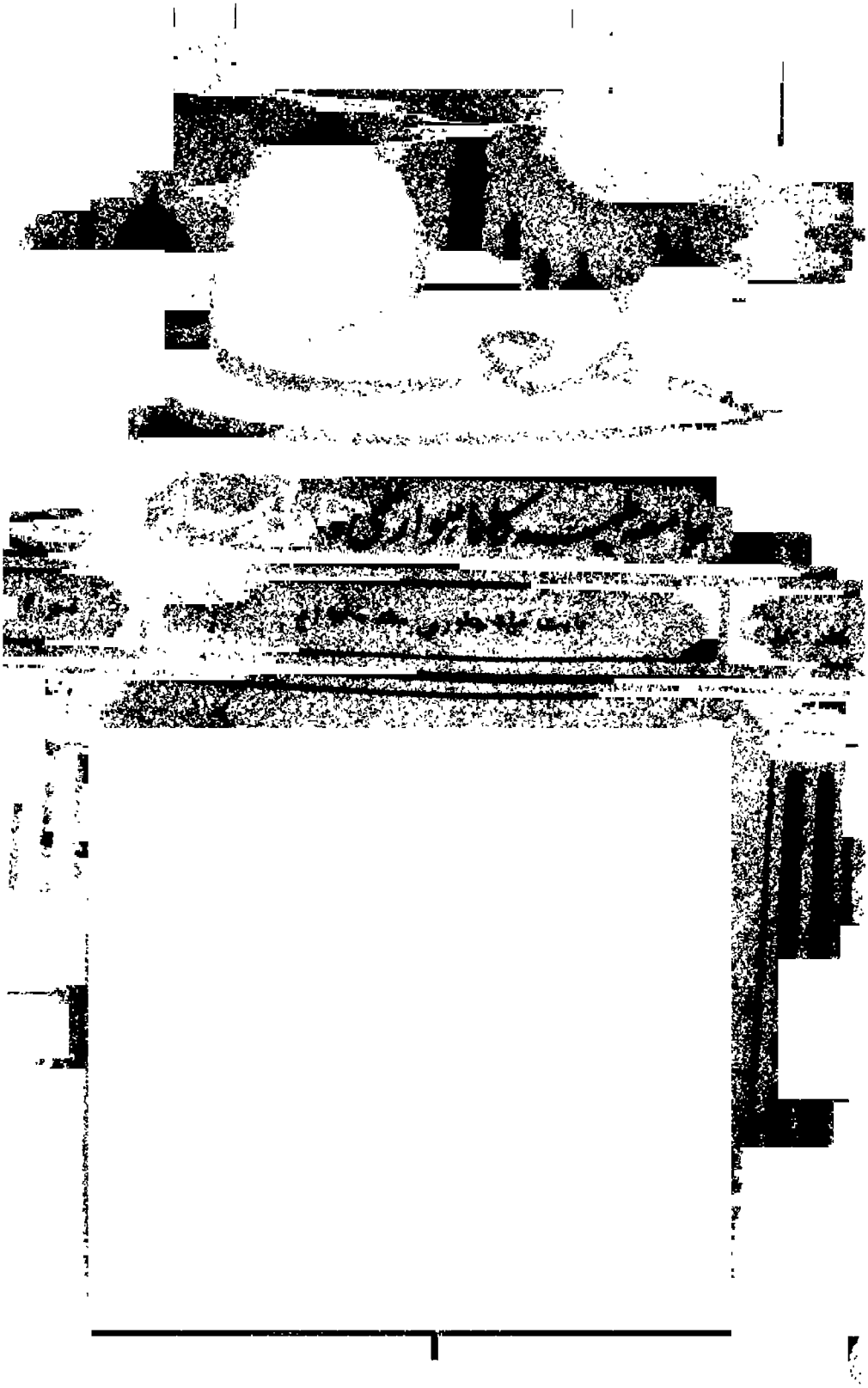

مہاتما گاندھی اور میڈم مانٹیسوری

(راجہ گوپال اچار صاحب اور جج کمارا پا صاحب نے ایک کتاب Nation's Voice. کے نام سے شائع کی ہے۔ اس میں مہاتما گاندھی کی وہ تقریریں ہیں جو انہوں نے انگلستان میں کی تھیں، ان کے سفر کے حالات ہیں، انگلستان کے ممتاز لوگوں سے ان کی ملاقات اور مشہور اداروں میں ان کے جانے کی روداد ہے۔ اس کا ترجمہ "قوم کی آواز" کے نام سے مکتبہ جامعہ ملیہ کی طرف سے وسط ستمبر میں شائع ہوگا۔ اس کا ایک ٹکڑا جس میں مہاتما گاندھی اور میڈم مانٹیسوری کی ملاقات کا ذکر ہے، ناظرین "جامعہ" کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔)

مہاتما گاندھی اور میڈم مانٹیسوری کی ملاقات اہل دل کی روحانی صحبت کا مرقع ہے۔ یہ خاتون اس سے اس درجہ متاثر ہوئیں کہ لکھتی ہیں "گاندھی مجھے انسان نہیں، روح محض معلوم ہوتے ہیں۔ سالہا سال سے ان کا خیال میرے دل میں بسا ہوا تھا۔ میں ان سے دور تھی، مگر میری روح ان کے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ ان کی خوش خوئی اور نرمی کو دیکھ کر دل یہ کہتا تھا کہ دنیا میں درشتی اور سختی کا وجود ہی نہیں ہے۔ وہ اس بے تکلفی سے، ایسے کھلے دل سے ملے۔ گویا ان کے لئے کوئی رکاوٹ کوئی قید نہیں۔ ان کا روحانی اثر سورج کی کرنوں کی طرح بلا واسطہ پڑ رہا تھا اور اس میں وہی گرمی وہی تیزی تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ اس محترم بزرگ سے ان معلموں کو بہت فیض پہونچ سکتا ہے جن کی میں تربیت کر رہی ہوں۔ معلم کے لئے ضروری ہے کہ صاف دل اور عالی ظرف ہو۔ اور طبیعت کو اس طرح بدلے کہ بڑوں کی پرشور دنیا سے، جس میں انسانی زندگی کو قدم قدم رکاوٹوں کا سامنا ہوتا ہے، نکل کر بچوں کی دنیا میں پہونچ جائے۔ خدا کرے ان کی صحبت سے ہمارے معلموں کو اس مقصد میں مدد ملے کہ روحانی وسائل سے انسانوں کے دل میں بچپن کی معصومیت قایم رکھیں"۔

ہم لوگوں کے بیٹھنے کے لئے گدوں اور تکیوں کا انتظام تھا۔ اور اسلنگٹن کے غریبوں کے حلقے کے چھوٹے چھوٹے لڑکے، پیارے پیارے، صاف ستھرے، فرشتوں کی طرح معصوم سادہ لباس پہنے، ننگے پیر، گاندھی جی کو بالکل ہندوستانی طریقے سے نمسکار کر رہے تھے۔ اس کے بعد ان بچوں نے ہمیں نرت کرتب، باجا بجانے، اور توجہ اور ارادے کے چھوٹے چھوٹے کام دکھائے۔ اور پھر خاموشی میں اپنا کمال دکھا دیا۔ جو ان چیزوں سے کم نہ تھا۔ جتنے لوگ موجود تھے سب پر بہت اثر ہوا۔

میڈم مانٹیسوری کو ان بچوں کے مجمع میں، جو تمام مخلوقات سے بڑھ کر اپنے خالق سے قریب بلاتے ہیں، دیکھنے سے بچوں کی ایک آزاد دنیا کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ میڈم مانٹیسوری تعلیم کے جو حوصلے رکھتی ہیں وہ پورے نہ بھی ہوں تو ان کی یہ خدمت نوع انسانی کے لئے کچھ کم نہیں کہ انہوں نے بچوں کو اور والدین کو بچوں کی قابل احترام صفات کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ میم صاحب نے میٹھی اور سریلی اطالوی زبان میں گاندھی جی کا خیر مقدم کیا۔ اور ان کے سکرٹری نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کر دیا۔ اس ترجمے ہی کو پڑھ کر انسان کے دل پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔

"میں اپنے شاگردوں کو اور دوسرے صاحبوں کو، جو یہاں موجود ہیں، مخاطب کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے آپ سے ایک بہت بڑی بات کہنا ہے۔ آج ہمارے درمیان گاندھی کی روح، وہ آتما جس سے ہر شخص خوب واقف ہے، مجسم موجود ہے۔ یہ آواز، جسے سننے کا شرف ہمیں حاصل ہوگا، وہ آواز ہے جو ساری دنیا میں گونجتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں محبت سے کہتے ہیں اور اپنا پیام صرف اسی آواز سے نہیں، بلکہ اپنی ساری زندگی سے ادا کرتے ہیں۔ یہ ایسی انوکھی چیز ہے کہ جب اس کا موقع آتا ہے تو ہر شخص کان لگا کر سنتا ہے"۔

"میرے محترم گرو! مجھے اس بات پر فخر ہے کہ وہ آواز جسے آج آپ کے خیر مقدم

شرف حاصل ہوا ہے، لاطینی نسل کے ایک فرد کی آواز ہے۔ یہ اس عظیم الشان شہر روما کی آواز ہے جو مغرب کے مذہبی خیالات کا گہوارہ ہے۔ کاش، میں یہاں مغرب کے افکار اور زندگی کو مجسم کر کے مشرق کی خدمت میں پیش کر سکتی! اس وقت میں اپنے شاگردوں کو آپ کے سامنے پیش کرتی ہوں۔ ان کے علاوہ ان کے دوست، ان کے دوستوں کے دوست اور عزیز بھی یہاں جمع ہیں۔ میرے شاگردوں میں بہت سی قوموں کے لوگ ہیں۔ یہاں انگلستان کے فراغدل معلم جمع ہیں۔ ہندوستان، اطالیہ، ہالستان، جرمنی، ڈنمارک، سوئیڈن، چکوسلوواکیا، آسٹریا ہنگری، امریکا، آسٹریلیا، نیوزلستان، جنوبی افریقہ، کناڈا اور آئرستان کے طالب علم موجود ہیں ۔

اے میرے گرو! عالمگیر تمدن اور بچوں کی محبت، یہی وہ کڑیاں ہیں جو ہم سب کو جوڑتی ہیں اور جن کی بدولت ہم سب آپ کے سامنے حاضر ہیں۔ ہم بچوں کو زندگی بسر کرنا سکھاتے ہیں۔ وہ روحانی زندگی بسر کرنا جس کے سوا کسی اور چیز پر عالمگیر امن کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ طالب علم یہاں اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ اس شخص کی آواز سنیں جو زندگی کے فن کا اُستاد ہے۔ ہم سب کے لئے جن میں طالب علم بھی شامل ہیں اور ان کے دوست بھی، آج کا دن عمر بھر یاد گار رہے گا۔ یہ چوبیس چھوٹے چھوٹے انگریز بچے، جنھوں نے آپ کے لئے کام کیا ہے۔ اور یاری کی ہے، آنے والی نسلوں کی جیتی جاگتی نشانیاں ہیں۔ ہم سب آپ کی آواز کے منتظر ہیں ۔"

اس تقریر کا یہ زبردست اثر پڑا کہ اس نے مضراب بن کر گاندھی جی کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا۔ جن سے وہ نغمہ پیدا ہوا جو اس موقع کے شایان شان تھا۔ یہ ساری دنیا کے بچوں اور ان کے والدین کے لئے پیام بھی تھا اور آزادی کا منشور بھی۔ میں اسے حرف بہ حرف نقل کرتا ہوں :-

" خاتون محترم، آپ کے الفاظ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ یہ بالکل سچ ہے۔ میں نہایت

عاجزی سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں اپنی ذات کو سراپا محبت بنانے کی بری بھلی کوشش، جو مجھ سے ہو سکتی ہے کرتا ہوں۔ میرے دل سے لگی ہے کہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کروں۔ میرے نزدیک وہ عین حق ہے اور مجھ پر اپنی زندگی کی پہلی ہی منزل میں یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ اگر حق کی معرفت حاصل کرنا ہے تو مجھے چاہیئے کہ محبت کے قانون پر چلوں۔ چاہے اس میں میری جان بھی کام آجائے۔ اور چونکہ خدا نے مجھے بچے عطا کئے ہیں اس لئے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محبت کا قانون جیسی اچھی طرح چھوٹے بچوں سے سیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے کسی اور طریقے سے سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے کامل یقین ہے کہ بچوں میں خلقی طور پر وہ شرارت نہیں ہوتی جو بری کہی جا سکے اگر والدین بچے کی نشوونما کے زمانے میں، یعنی اس کی پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد اچھا سبھاؤ رکھیں تو یہ مانی ہوئی بات ہے کہ بچہ خود بخود حق کے قانون اور محبت کے قانون پر چلے گا۔ میں آپ کے سامنے یہ بیان نہیں کرنا چاہتا کہ میری پرشور زندگی میں کیا کیا دور گذرے ہیں لیکن میں سچائی سے اور عاجزی سے اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ جس حد تک میں نے اپنی زندگی کے اندر خیال، قول اور فعل میں محبت کو برتا اسی حد تک مجھے "وہ سکون قلب جو عقل اور ادراک سے باہر ہے" حاصل ہوا۔ میرے دوست اکثر میرے سکون قلب کو دیکھکر حیران رہ گئے ہیں۔ وہ مجھ پر رشک کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تم نے یہ انمول چیز کیسے پائی۔ میں انھیں اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں بتا سکا کہ جو سکون آپ کو میرے دل میں نظر آتا ہے وہ میری اس کوشش کی بدولت ہے کہ محبت کے قانون پر جو ہماری فطرت کا سب سے برتر قانون ہے، عمل کروں ۔

"مجھے آپ کے کام سے پہلے پہل ۱۹۱۵ء میں، جب میں جنوبی افریقہ سے ہندوستان پہونچا، واقفیت ہوئی۔ ایک مقام پر، جو امریلی کہلاتا ہے، میں نے مانٹیسوری طرز کا ایک چھوٹا سا مدرسہ دیکھا۔ آپ کا نام میں اس سے پہلے بھی سن چکا تھا۔ مجھے فوراً پتہ چل گیا کہ مدرسہ میں آپ کی تعلیم کا ڈھانچہ تو موجود ہے۔ مگر وہ روح سے خالی ہے۔ اگرچہ کوشش کم و بیش دیانتداری

سے ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ظاہری ٹیم ٹام بہت تھی ۔

" اس کے بعد میں نے اس طرز کے اور مدرسے دیکھے اور جوں جوں میرا سابقہ ان سے بڑھتا گیا مجھے یہ اندازہ ہوتا گیا کہ ان کا اصول بڑا اچھا اور بڑا شاندار ہے۔ بہ شرطیکہ بچوں کو قانون فطرت کے مطابق تعلیم دی جائے۔ وہ فطرت جس میں انسانیت کی شان ہے، وہ نہیں، جو بہائم کے اندر پائی جاتی ہے۔ میں نے بچوں کی تعلیم کا طریقہ دیکھ کر خود بخود یہ سمجھ لیا کہ اگرچہ تعلیم جس طرح دی جا رہی ہے قابل اطمینان نہیں ہے لیکن اس کا اصل خاکہ ضرور اس بنیادی قانون کے مطابق ہوگا۔ اس کے بعد مجھے آپ کے کئی شاگردوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جن میں سے ایک نے تو اٹلی کی زیارت کر کے آپ کی قدمبوسی سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ مجھے ان بچوں سے اور آپ سب لوگوں سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ ان چھوٹے چھوٹے بچوں سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے ان کا تھوڑا سا حال پہلے سے معلوم کر لیا تھا۔ جو کچھ میں نے یہاں دیکھا اس کا تھوڑا بہت اندازہ مجھے برمنگھم میں ہو چکا ہے۔ وہاں کے مدرسے میں اور اس مدرسے میں فرق ہے۔ مگر وہاں بھی مجھے یہی نظر آیا کہ انسانی فطرت بیتابی سے اظہار کی راہ ڈھونڈ رہی ہے اور یہاں بھی میں نے یہی چیز دیکھی۔ میرے لئے یہ نہایت مسرت کی بات ہے کہ ان بچوں کو بچپن سے خاموشی کی خوبیاں سمجھائی جاتی ہیں۔ ابھی اپنے معلم کی ایک جنبش لب میں یہ لڑکے کس خاموشی سے ایک ایک کر کے آگے آئے تھے! مجھے ان کے خوشنما نرت کرتب(۱) بہت پسند آئے۔ اور جب میں ان کی یہ خوش فعلیاں دیکھ رہا تھا تو مجھے ہندوستان کے دیہات کے کروڑوں بھوکے بچوں پر بڑا قلق آیا اور میں نے اپنے دل میں کہا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں ان بچوں کو بھی وہ تربیت دے سکوں جو آپ کے طریقے کے مطابق یہاں کے بچوں کو دی جاتی ہے۔ ہم بھی ہندوستان کے غریب سے غریب بچوں کی تعلیم کے تجربے کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں ہمیں

کہاں تک کامیابی ہوگی۔ مقصد تو یہ ہے کہ ہندوستان کے ان بچوں کو جو چوہے کے سے بلوں میں رہتے ہیں، سچی جاندار تعلیم دی جائے۔ مگر اس کے مادی وسائل ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔

لے دے کے ہمیں معلموں کی رضاکارانہ مدد کا آسرا ہے۔ لیکن جب میں معلموں کی تلاش کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت کم ہیں۔ خصوصاً اس قسم کے معلم جن کی ضرورت ہے کہ ہمدردی سے، ہر بچے کی طبیعت کا مطالعہ کرکے، اسے اپنے بل کھڑا کرکے، اسے ذاتی عزت کا احساس دلاکر، اس کی بہترین صفات کو ابھاریں۔ آپ یقین کیجئے سینکڑوں بلکہ ہزاروں بچوں کے تجربے سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ ان کے دل میں مجھ سے اور آپ سے زیادہ، عزت کا احساس ہوتا ہے۔ اگر ہم عجز و انکسار سے کام لیں تو ہم زندگی کے بڑے بڑے سبق سن رسیدہ اور عالم فاضل حضرات سے نہیں، بلکہ انھیں بچوں سے جو نادان کہلاتے ہیں، سیکھ سکتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے اقوال میں یہ قول سب سے بلند و برتر حقیقت رکھتا ہے کہ حکمت شیر خوار بچوں کی زبان سے ظاہر ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ ہے اور میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ اگر ہم شیر خوار کے سامنے عاجزی اور معصومیت کے ساتھ جائیں تو ہم ان سے حکمت کے نکتے سیکھ سکتے ہیں۔

اب آپ کا زیادہ وقت صرف کرنا مناسب نہیں۔ میں نے آپ کے سامنے بس وہی بات کہی ہے جو اس وقت میرے دل میں چبھ رہی تھی یعنی اس نازک مسئلے کے انسانی پہلو کا ذکر کیا ہے کہ ان کروروں ہندوستانی بچوں کی بہترین صفات کس طرح ابھاری جائیں۔ لیکن میں نے اگر کوئی سبق سیکھا ہے تو یہ ہے کہ جو چیز انسان کے نزدیک محال ہے وہ خدا کے آگے بچوں کا کھیل ہے۔ اگر ہم اس خالق پر اعتقاد رکھتے ہیں جو اپنے عاجز سے عاجز مخلوق کی قسمت کا خود فیصلہ کرتا ہے تو یہ بات یقینی ہے کہ دنیا میں سب کچھ ممکن ہے اور اسی آخری امید کے سہارے پر میں جیتا ہوں اور اس کی مرضی پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس لئے میں پھر کہتا ہوں کہ جس طرح آپ بچوں کی محبت میں اپنے متعدد مدرسوں کے ذریعے ان کی بہترین صفات کو ابھارنے کی کوشش کر رہی ہیں اسی طرح خدا چاہے گا تو ہمارے ملک میں نہ صرف دولت مندوں اور خوش حال لوگوں کے بچے، بلکہ

کسانوں کے بچے بھی اس قسم کی تعلیم پا سکیں گے۔ آپ نے بڑی سچی بات کہی کہ اگر ہم دنیا کو حقیقی امن کی تلقین کرنا اور لڑائی کے خلاف سچ مچ لڑائی لڑنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ بچوں سے ابتدا کریں۔ اگر ان کی نشو و نما فطری معصومیت کی حالت میں ہو تو ہمیں نہ اس جدوجہد کی ضرورت ہوگی نہ بیکار ریزولیوشن پاس کرانا پڑیں گے۔ بلکہ ہمارا ہر قدم محبت سے محبت اور امن سے امن کی طرف اٹھے گا۔ اور دنیا میں اس سرے سے اس سرے تک امن اور محبت کا دور دورہ ہو جائے گا۔ جس کی آج ساری دنیا بھوکی ہے، چاہے اسے اس کا احساس ہو یا نہ ہو "

تلاش حق

مہاتما گاندھی کی خود نوشت سوانح حیات کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ۔ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ یہ وہ کتاب ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کیوں دھن کے پکے گاندھی کی ایک آواز نے اکثر دنیا میں ہل چل مچا دی ہے؛ مال و دولت چھوڑ کر عیش و آرام ترک کر کے کیوں لاکھوں انسان جیل کی سختیاں اٹھانے اور لاٹھیوں کی مار کھانے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ یہ وہ خود نوشت حالات ہیں جو خود مہاتما گاندھی نے اپنے اخبار نوجیون میں لکھے تھے اور جس کے انگریزی ترجمہ کی قیمت گیارہ روپے تھی۔ اب مکتبہ جامعہ نے عام فائدہ کی غرض سے اس کا اردو ترجمہ شائع کر کے دونوں جلدوں کی قیمت صرف دو روپے رکھی ہے۔ کتاب کی ضخامت سات سو صفحات سے زیادہ ہے۔ اور زمانہ طالب علمی سے لیکر اب تک کی متعدد تصاویر دی گئی ہیں۔

جلد طلب کیجئے قیمت دو روپے

مولانا محمد علی مرحوم کا ایک خط

قاضی عبدالغفار صاحب کے نام

جیل خانہ بیتول ۲۲ ستمبر ۱۹۱۹ء

برادرم غفار۔ السلام علیکم وعلی من لدیکم

۲۱ اگست کا محبت نامہ ۲۵ کو ملا۔ اس سے ایک روز قبل ہی ایک خط اپنے پیرومرشد کو ارسال کر چکا تھا (اس سے قبل ایک عریضہ لکھا گیا تھا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ ارباب قضا و قدر نے روک لیا تھا) دوسرا تم کو لکھتا مگر کیا کہوں غلطی ہوئی۔ شوکت کے بچوں کو ایک خط بھی نہیں لکھا تھا اور اوس وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ والدہ صاحبہ نے ساری دنیا کو Ultimatum دیدیا ہے کہ ادھر کی دنیا اودھر ہو جائے مگر میں بیتول عید سے قبل ضرور جاؤں گی۔ اور اگر ہیضہ نہیں ہیضے کا باپ ہو، مگر میرا جانا اب نہیں ٹل سکتا۔ چنانچہ باوجود ہماری سخت تاکید کے کہ ابھی کوئی نہ آئے۔ جب بیماری دور ہو جائے گی تو ہم خود تار دے دیں گے۔ ایک خط آیا جس میں پہلے درج تھا کہ ۲۸ کو چل کر ۳۰ کو والدہ اور شوکت کے بچے آجائیں گے۔ مگر راقم الحروف، مولوی منشی محمد صادق علی خاں صاحب سابق منیجر ہمدرد نے مکرر لکھا کہ اب ۱ ستمبر کو روانگی کا قصد ہے۔ مگر اس خط کے بعد کے چلے ہوئے ہر خط میں یہی مذکور تھا کہ جمعرات کو (یعنی ۲۸ اگست) کو چل کر ہفتے بیتول پہونچیں گے۔ تاہم تردید صادق صاحب کی تکرار کی ایک خط میں بھی نہ تھی۔ میں پریشان تھا کہ کب آتی ہیں۔ شوکت سوچ رہے تھے کہ تار دیا جائے کہ بقرید کے بعد تک انتظار کرو۔ قیاس ہے کہ شاید اس سے پیشتر ہم خود ہی چل دیں۔ یہی سوچ بچار تھا کہ بھائی منور علی خاں صاحب کا عنایت نامہ موصول ہوا کہ میں چچی صاحبہ اور بچوں کو لے کر ۲۹ کی صبح کو روانہ ہوں گا۔ چونکہ والدہ کے میر منشی صادق ہیں، اور کبھی کبھی بہن بھی معروف ہوتی ہیں تو اپنی عبارت اون کے زود نویس قلم

سے لکھوا دیتی ہیں۔ اس لئے صادق صاحب کی صداقت پر زیادہ اعتبار کیا گیا۔ اور اون کی کاہلی کے عث متی کا نام نہیں نکالا گیا کہ "تکرار" کی تردید سستی سے نہیں کی۔ غرضکہ باوجود منور علی بھائی کے کارواں سالار ہونے کے اون کے لکھنے کا بھی اعتبار نہ ہوا۔ مگر ڈپٹی کمشنر نے یہاں کے چھوٹے صاحب کو از دو انتظام قیام وغیرہ کے لئے لکھ دیا۔ اور باوجود سخت شبہ کے کہ دو دن بعد چلیں گی یا آج پہونچ جائیں گی، اطلاع ملی کہ والدہ صاحبہ معہ بچوں کے تشریف لے آئیں اور ڈاک بنگلے میں مقیم ہیں۔ سلسلۂ تکلم کی طرف پھر توجہ کرتا ہوں۔ چونکہ خیال نہ تھا کہ ۱ر ستمبر سے قبل چلیں گی اس لئے میں نے ۲۷ کو بجائے تم کو لکھنے کے شوکت کے بچوں کو خط لکھدیا تھا۔ جو تقریباً ضائع گیا ہوگا اس لئے کہ بیگم ..... اور شاہد صاحب سے جو راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں وہ دوسروں کے فہم سے باہر ہوتی ہیں۔ کم از کم دوسروں کو ان میں وہ لطف نہیں مل سکتا۔ یہاں آتے ہی میں نے ان صاحبان کو اطلاع دیدی ہے کہ خطوں کے ضائع ہونے کے باعث ہر جانے کی نالش داغنے والا ہوں، یہیں ڈگری حاصل کر کے قرقی کرالوں گا۔ بہرحال خط یوں ضائع ہوا۔ مگر شکر ہے خداوند کریم کا یہ سب بخیر یہاں تک آگئے اب ۳ر کو میری اہلیہ اور بچے معہ چند اور عزیزوں کے روانہ ہوں گے۔ اور چونکہ اس ہفتہ کا خط اون کو نہیں مل سکتا اس لئے اس جواب کی گنجائش مل گئی۔ اور پیشتر اس کے کہ نئے مہمانوں کی مہمانداری کے انتظامات شروع ہوں جس میں شوکت صاحب کے ذمے احکامات جاری فرمانا اور میرے ذمے اون کی بجاآوری یعنی اپنی طباخی میں انہماک ہوگا یہ خط جلد جلد لکھے دیتا ہوں۔ ورنہ خدا کو معلوم ہے کہ کب فرصت ملتی ہے اور تمہارا قرض کب ادا ہوتا ہے۔ تمہارے خط کی طرف ذرا دیر میں متوجہ ہوں گا۔ پہلے اس مقدمۃ الجیش کی آمد کا حال لکھ دوں۔ والدہ صاحبہ کی قدم بوسی جیل خانہ کے پھاٹک پر کی۔ شاہد اور بچوں کو گلے لگایا۔ بفضلہ تعالیٰ شاہد اپنی Cycle (۱) کے بعد اب قدرے Normal. (۲) حالت میں تھے۔ (جو اون کے مرض کا معمول ہے) مگر والدہ صاحبہ کی حالت نے سخت متردد کر دیا

---

(۱) دورے
(۲) صحت کی۔ طبعی۔

میری عمر میں ان کی یہ کیفیت تھی کہ ایک بڑے بکس میں آم بند کر کے شوکت اور ذوالفقار بھائی کے ساتھ بریلی اسکول کو روانہ کر رہی تھیں۔ یہ دونوں پہلوان زور لگا کر بکس کو اٹھا تو لے گئے مگر سیڑھیوں پر آ کر خود بھی گرے اور آم بھی گرا دیئے۔ والدہ دوڑ کر گئیں اور ایک ایک مکا دونوں پہلوانوں کے رسید کیا اور کہا کہ کھاتے تو اتنا ہو اور بڑے ڈنڈ پیل پہلوان بنے ہو، بوجھ ذرا سا بھی نہیں اٹھایا جاتا یہ کہہ کر صندوق کو اٹھا کر بلا تکلف کوئی پچاس قدم لے گئیں اور زنانہ مکان کے دروازے کے قریب جا کر رکھ دیا۔ کہ نوکر اٹھا کر گاڑی پر لاد دیں۔ لینڈوں پر صبح و شام ہوا خوری کو جاتی تھیں۔ ہاتھ میں ڈنڈا اور کبھی تو ہم میں سے شوکت ساتھ ہوتا۔ کبھی ان کی ایڈی کانگ بخشی مائی، کبھی زاہد یا فقط عابد ہی۔ دو تین میل اس وقت دو تین میل اس وقت پہاڑوں پر چڑھتی اوترتی گھوم آیا کرتی تھیں۔ کچھ تو ڈھائی تین سال ہوئے لکھنؤ کے اسٹیشن پر پلیٹ فارم پر سے گر جانے کی باعث اور زیادہ تر ہماری نظر بندی کے تفکرات کا نتیجہ چھند واڑہ ہی میں اس قدر کمزور ہو گئی تھیں۔ کہ ہوا خوری تقریباً بند کر دی تھی۔ پھر بھی ایک بار تانگہ شہر سے بنگلہ آتے آتے ٹوٹ گیا تھا۔ تو بلا تکلف کوئی آدھے میل چل کر آ گئی تھیں۔ مگر اب یہ حالت ہے کہ جیل خانہ کے دروازے سے اپنے آشیانہ تک لانے میں، جو کلہم اجمعین کوئی پچاس ساٹھ قدم کا فاصلہ ہے، سہارا دینا نہیں، بلکہ بوتھنا پڑا۔ سیڑھیاں تو مطلق نہیں چڑھ سکتیں۔ بخشی مائی نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ دودھ پینا مطلق ترک کر دیا۔ یہ دس بارہ برس سے یہ مجبوری ڈاکٹر کے حکم سے پیتی تھیں۔ گو ہرگز مرغوب طبع نہ تھا۔ ہم ڈانٹ ڈپٹ کر پلوایا کرتے تھے اس پر بھی ہمیشہ فضول خرچی کا الزام دیا کرتی تھیں۔ گویا ان کے اس آدھ سیر دودھ میں دوا نہ نکل جائیگا۔ حالانکہ ہم الٹے ان سے شکایت کیا کرتے تھے کہ ہم کو ضرورت سے زیادہ کھلا دیا کرتی ہیں۔ اور کھانے کا خرچ بڑھا چلا جا رہا ہے۔ الاؤنس پندرہ دن کو بھی کافی نہیں ہوتی۔ اب جب سے ہم قید ہوئے ہیں وہ دودھ بالکل بند ہو گیا۔ ہاضمہ جو پہلے سے خراب تھا اب اس قدر خراب ہے کہ روز دماغ پر گھمنی کا اثر بعد ظہر ہو جاتا ہے۔ یہاں آئیں تو ہم نے بڑی مشکل سے دودھ پلایا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ تین مہینے میں یہ پہلی بار پیا گیا ہے۔ کوئی لاتا ہے تو الٹی اوس پر خفا ہوتی ہیں اور کہتی ہیں۔ کہ

میرے دودھ پلانے والے ہی نہیں رہے۔ طرہ یہ کہ دوسرے دن معلوم ہوا کہ پلنگ پر سونا چھوڑ دیا۔ بارہ تیرہ برس ہوئے۔ معظم کے والد علیل ہوئے تھے تو ہم سب بڑودے سے عیادت کو گئے تھے۔ ذیابیطس میں مبتلا تھے۔ آپریشن ہوئے اور اسی میں انتقال فرمایا۔ نماڑ سے خاص دارالریاست اندور کو پالکی میں لائے گئے تھے۔ یہاں بنگلہ بنوانا شروع کیا تھا۔ Site (۱) ہی پر ڈیرے لگوائے تھے زمین مالوہ کی کالی مٹی تھی جو بارش میں ایندھن کی طرح نرم ہوتی ہے اور بعدہٗ پتھر یا لوہا ہو جاتی ہے والدہ بھی اوس پر بستر کر کے سوئی تھیں۔ عظمت علی خاں بھائی مرحوم نے بے حد اصرار کیا کہ پلنگ موجود ہے۔ فرمایا کہ بھائی اتنے آدمی چار پلنگوں پر کیسے سوئیں گے۔ اور مجھ بوڑھی کو کیا زیبا ہے۔ کہ بچے زمین پر سوئیں اور میں سیج پر سوؤں۔ بھائی مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ ہم سب رام پور واپس آ گئے اوس کے بعد Kidneys (۲) Typhoid (۳) میں مبتلا رہیں Pleurisy (۴) پر علیحدہ اثر ہو گیا یہ زیادہ تر اس زمین پر سونے کا اثر تھا۔ جب سے بیمار ہوئی ہیں تو ہاضمہ خراب ہو گیا۔ حج بیت اللہ شریف میں کئی ہزار روپیہ لے کر گئیں اور سب صرف کر آئیں بلکہ وہاں بھی قرض لیا۔ مگر باوجود تاکید سخت کے Cabin (۵) کا ٹکٹ نہ لیا۔ فرمایا کہ اللہ کے ہزاروں مہمان Deck (۶) پر سوتے ہیں۔ میں ایسی کون سی ولی ہوں کہ پلنگ پر گدا جماؤں اور ٹانگیں پھیلا کر سوؤں۔ تھرڈ کلاس ہی میں سفر کیا اور اونٹ بھی بجائے دو دیے اور پالکی وغیرہ اس میں بندھوانے کے ایک ہی لیا اور اس میں بھی ایک اور کو شریک کر لیا۔ سب روپیہ ناداروں پر صرف کیا۔ اب یہاں بھی تشریف لائیں تو تھرڈ کلاس میں۔ یہاں ہم نے جو حالت دیکھی وہ یہ ہے کہ نظر بندی کا ہر سال پانچ سال کے برابر تھا تو قید کا ہر مہینہ ایک سال کے برابر ہے۔ خدا خیر رکھے۔ دہلی میں جو گفتگو فرمائی تھی اوس کا تو تم کو بھی علم ہو گا بہت

---

(۱) مکان کا موقع، زمین جس پر مکان بن رہا ہو۔ (۴) گردے۔

(۲) پیشاب کا ورم۔ (۵) کیبن، جہاز میں علیحدہ کمرہ۔

(۳) میعادی بخار (۶) عرشہ جہاز۔

اور حوصلہ وہی ہے بلکہ اوس سے بھی زیادہ۔ لیکن غم والم اپنے بس کی چیز نہیں کہ دل سے نکال کر پھینک دیں۔ آنکھ میں آنسو نہیں۔ مگر اب نہ وہ ہنسنا ہے، نہ بولنا۔ مصنوعی دانت جو چند روز ہوئے میں ہمارے سخت اصرار سے بنوائے گئے تھے لگانا چھوڑ دیئے۔ غذا کچھ نہیں ہوتی اور جو کچھ ہوتی ہے وہ ہضم نہیں ہوتی۔ اگر خدانا خواستہ اس صدمہ کا یہی اثر رہا تو۔ . . . . . (آگے خیال بھی نہیں جاتا۔ مگر خدا ہمیں معاف کرے۔ شاید اس جرم کو ہم تو معاف کبھی بھی نہ کریں) یہاں رہنے کی اجازت نہ ہونے سے سخت بے چینی ہے۔ مگر رعایت کی طالب نہیں۔ ذرا اس سفر کی تکان دور ہو تو واپس ہوں۔ آج غالباً یہاں کے سول سرجن دیکھنے جائیں گے۔ میں نے کھانا پکا کر کھلایا تو شکم سیر ہو کر پہلے کی طرح کھایا۔ پلنگ پر آرام بھی نہیں فرماتی تھیں۔ میں خود جاکر پلنگ پر لیٹا تو میری خاطر آ گئیں۔ اور فرمانے لگیں کہ بھائی تیرا کہنا نہیں ٹال سکتی تیرے ساتھ تو برسوں سوئی ہوں (بارہ کی بلکہ اس سے بھی زیادہ عمر تک مجھے ہم بستری کا فخر حاصل ہوتا رہا تھا۔ اور اس کے باعث جو کچھ ایذا اون کو پہنچتی رہی اس کا مفصل حال شوکت صاحب مزے لے لے کر آپ سب صاحبوں کو سنا ہی چکے ہیں) ہماری دوسری درخواست بھی جا چکی ہے۔ دس دن سے زیادہ ہو گئے۔ غالباً شملہ پہونچ گئی ہو۔ بٹلر صاحب بھی وہیں ہیں۔ سرکار سے مل کر گئے تھے۔ سرکار نے، سنا ہے، کہ حقیقت حال سے آگاہ بھی کر دیا ہے اب دیکھئے کیا ہوتا ہے ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

تمہاری رام کہانی اب تمہاری زبانی بھی سن لی۔ مگر امجدی اور معظم اور میری بپتا پہلے ہی لکھ چکی تھیں کہ تمہارا گھر آج سے نہیں بلکہ ہمدرد کی سب اڈیٹری کے زمانے سے چھوٹا موٹا ہسپتال بنا ہوا ہے۔ "حفظان صحت" کے تم Expert (۱) نہ ہو گے تو کیا تعلیم کی طرح یہ بھی ضیاء الدین اور شفیع کا حصہ ہو جائے گا؛ والد ماجد کی علالت اور بے بصری نے (خدا کرے کہ عارضی ثابت ہو) اور بھی نشاۂ غم دا

(۱) ماہر

بنایا ہوگا۔ ایسی حالت میں ہنسنا تو ہنسنا مسکرانا بھی گوارا نہیں۔ مگر تمہارے اس فقرہ پر کہ "Nursing[1] کے متعلق جو تجربات میں نے حاصل کئے ہیں ان کی تفصیل بہت تکلیف دہ ہے" مسکراہٹ تو مسکراہٹ قہقہہ بھی ضبط نہ ہوسکا۔ دہلی کی ایک رات یاد آگئی جس کی تفصیل Delhi Nights Entertainments[2] کے ذیل میں کسی دن شائع جائے گی Nursing کا وہ تجربہ واقعی بہت تکلیف تھا۔ . . . . . +

مراد آباد کے احباب کو طعنہ دینا فضول ہے۔ "احباب" کا لفظ بھی "البشیر کے برادران وطن" کی طرح خود ایک طعنہ سمجھا جانے لگے گا۔ "احباب" "سب" "ناصح" ہوگئے۔ غالب کی طرح اگر خواہش کرتا کہ

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو، اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے جا نہ ہوتا۔ اس مجلس میں یہ تو حاصل ہے مگر دوسرا شعر اگر لکھوں تو فراری کا شبہ ہونے لگے ؎

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے،
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

مدا کے فضل سے دیواریں خاصی بلند اور پائدار ہیں اور پاسبان بہت کافی ہیں۔ ؎

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار،
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

یہ تمہاری سخت ناقدری ہوگی۔ اس لئے کہ تیمارداری کے تم Expert[3] ہو اور "نوحہ خوانی" تو اب شعار قومی ہوگیا ہے۔ اس میں سب کی حق تلفی ہوگی۔ مگر بھائی میرے طعنے "محض شکایت شکم" تھے۔ یعنی آموں کی طلب۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تم نے "خراج" ارسال کر دیا تھا۔ تمہارا کارڈ اور خط

---

(۱) تیمارداری۔
(۲) دہلی کی راتوں کی دلچسپیاں۔
(۳) ماہر۔

اب تک لاپتہ ہیں۔ ایک ٹوکری لنگڑوں کی عید کے قریب آئی تھی۔ مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس کی تھی۔ اب Suspense[1] کھاتے سے نکال کر تمہارے حساب میں جمع کر لی گئی ہے "ظاہر جمع رکھو۔ اگر تمہارا کارڈ P. T. O., P. S.[2] تھا تو آم بھی Prejudicial to Private[3] تھے۔ یعنی میرے ذہابیطس کے مدد و معاون۔ مگر کچھ تو چلنے پھرنے کی معذوری کے باعث ورزش شروع کر دینے سے کہ کچھ تو نعم البدل ہو اور کچھ دوا کے باقاعدہ اور سوا ترا استعمال سے مگر زیادہ تر رمضان المبارک کے فرضی اور اس کے بعد ہفتے کے دو نفلی روزوں کے طفیل سے اور چپاتیوں اور چاولوں کے ترک کر دینے سے صحت خراب نہ ہونے پائی۔ اور آم کھائے اور خوب کھائے۔ اگر وہ پٹاری تمہاری تھی تو صرف اس قدر شکایت ہے کہ بکس کیوں نہیں تھا۔ ریل والے سخت حرامی ہیں (اصل معنی حرامی کے چور اور رہزن کے ہیں) پٹاری ہمیشہ ٹوٹی ہوئی ملی اور آدھے آم ندارد۔ اور اطمینان دہی کے لئے کہ بھیجنے والے نے کمی نہ کی تھی "فرشتے" راستے میں سے لے اڑے۔ چند گٹھلیاں اور چند چھلکے بطور ثبوت کے کہ وقت ضرورت سند ہوں پٹاری میں رکھ دیئے جاتے تھے۔ نبی جاں۔ فجری بھیجے تھے، پٹاری پر ٹاٹ بھی چڑھا ہوا تھا۔ ٹاٹ کو چاقو سے نہایت دیدہ دلیری سے کاٹ آم کچھ تو نکالے اور باقی پٹک پٹک کر سب داغدار کر دیئے۔ ایک بھی کھانے کو نہ ملا۔ ذوالمنہ بھائی نے دو سو لنگڑے اور شربہشت روانہ کئے سب حرامیوں نے حلال کئے۔ بکس میں بند رسیوں سے جکڑ دیا گیا تھا۔ اس لئے بکس اور رسیاں سب غائب۔

تمہارے خط میں شعیب اور سندھی کے سفر کے متعلق درج تھا کہ ۳۰ کو روانہ ہو جائیں اوس سے پتہ نہ چلا کہ بے چارے کمال الدین کے لڑکے تاج الدین کا کیا حال ہے۔ مگر آمنہ کے معلوم ہوا کہ انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بڑا ہونہار لڑکا تھا۔ حق مغفرت کرے۔

---

(۱) گوگو۔

(۲) یعنی امن عامہ میں خلل انداز۔

(۳) ذات کی سلامتی میں خلل انداز۔ Prejudicial public safety.

احباب دہلی میں سے کسی سے ملاقات ہو تو کہہ دینا کہ ہماری طرف سے مرحوم کے والدین سے تعزیت کرلیں۔ کہو بھائی اس غریب کی کیا عمر تھی۔ کون سا مرض ہمیشہ دامن گیر رہتا تھا، کس جرم کا مرتکب تھا کہ سزائے موت کا حکم صادر ہوا۔ پھر جب ان نوجوانوں کا یہ حال ہے تو ہم تو بڈھے ٹھیرے مرنے کے ڈر سے کیوں مرے جائیں۔ میرے شعر شاید تمہیں یاد ہوں ؎

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈر تا ہے یہی ہو سِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
قلزم عشق میں ہیں نفع و سلامت دونوں اس میں ڈوبے بھی تو کیا، پار اترنا ہے یہی

نقد جاں نذر کرو، دیکھتے کیا ہو جوہر
کام کرنے کا یہی ہے، تمھیں کرنا ہے یہی

ڈاکٹر صاحب تیاری سفر میں اس قدر منہمک تھے کہ اقامت گزینوں سے بالکل بیزار تھے۔ مگر یہ تیاری اس شعر کے بالکل برعکس تھی۔ کہ ؎

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

مے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ یہ "سفر صورت سقر" اختیار کیا جائے گا۔ چنانچہ جب خود اون کے خط سے معلوم ہو گیا کہ عزم راسخ فسخ ہو گیا تو یہ تو بقول حضرت علی کرم اللہ وجہ، منہ سے نہ نکلا کہ

عَرَفت رَبّی بفسخ العزائم

(میں نے رب کو اپنے ارادوں کے فسخ ہونے سے پہچانا)

مگر ناظم کا شعر یاد آگیا ؎

عزم حجاز حضرت ناظم سے تھا بعید
سنتا ہوں راستے سے پھر آئے، بھلا ہوا

بھائی حال یہ ہے کہ ہم تو دیوانے ہو کر چھوٹ گئے۔ مگر ہمارے فرزانے کیسے چھوٹیں گے۔ بقول اقبال ؏

تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

اب آپ کی نئی انجمن "انجمن تحفظ خسراں" کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اگر مانو[1] اب تک نہ تجویز ہوا ہو تو خسر الدنیا والآخرہ وہوالخسران المبین۔ تجویز کرتا ہوں۔ سب سسرے ایسے ہی نکلے۔ اچھا ہوا کہ میرا سسر بے چارہ کئی برس ہوئے کہ مر گیا اور اب ساس ہے نہ سسرا۔ ایک سالا ہے، سو بار بار اپنا اثر اسی پر ڈالتا تھا اور

اپنے سائے سے میں کہتا تھا کہ تو ہی ہنس بول
کچھ تو بہلے شب ہجراں میں طبیعت میری

داغ کے دیوان میں "سایہ" کا لفظ قطعاً غلط ہے۔

(۲) Just like Indians' to catch at the "Shadow" leave" the substance.

میرا سالا بیچارہ سخی آدمی ہے۔ اپنے کالج کی کشتی کا Cox[3] تھا۔ کچھ بھاری بھرکم Man of substance[4] نہیں تاہم سایہ سے زیادہ Substantial[5] تھا۔ مگر ان احباب نے اس بے چارے کو اپنا سایہ بنا لیا تھا۔ نہ معلوم اب کیا حال ہے۔ یہاں اگر تو بے حد ناراض ہوا تھا۔ ڈپٹی کمشنر اور Officiating Indian D. C.[6] پر اظہار غم و غصہ کیا گیا تھا۔ اب جا کر کہیں غصہ دور ہوا ہے۔ مگر ابھی یہاں تک آنا نہیں ہوا ہے۔ مقدموں میں انہماک سے تو میں خوش ہوتا ہوں اس لئے کہ بیچارہ جب مفلس ہو جاتا ہے تو ع قہر درویش بہ جان درویش۔ خود اپنی بوٹیاں نوچنے لگتا ہے۔ Pessimism[7] کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میری دیوانگی نے اس کی فرزانگی کا ناک میں دم بھی بہت کر دیا ہے۔ میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ یہاں کے بکھیڑے تو ہے ہی نہیں بہتر ہے کہ میں اپنا ہی بوجھ ڈالوں۔ میں قید سے چھوٹوں گا تو "سالار کارواں سالاں" بنوں گا۔ معظم

---

(۱) Motto وہ مقولہ جو دستور العمل کا کام دے۔ (۲) ہم ہندوستانیوں کا یہی حال ہے کہ سائے پر اڈکا مارتے ہیں اور اصل کو چھوڑ دیتے ہیں (۳) کاکس۔ جو کشتی کھینے والوں کو ہدایت دیتا ہے (۴) موٹا تازہ یا مال دار۔ (۵) اصلیت رکھنے والا (۶) ہندوستانی قائم مقام ڈپٹی کمشنر۔ (۷) قنوطیت۔

سے کہنا کہ تمہارا قدرے انتظار کیا گیا۔ اگر تم نہیں آتے، تو شاید پھر مجھی کو تکلیف کرنا پڑے۔ کسی استاد نے اپنے محبوب کو منظوم دعوت دی تھی کہ روزانہ آئے، نہیں تو ماہانہ آئے، اور یہ بھی نہیں تو سالانہ آئے۔ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ منظم آئے تو آئے نہیں تو سالانہ آئے۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔ سنا ہے کہ حسرت نے میرے ہم نام کے پرخچے اڑا دیئے۔ ان ذات شریف کی یہی سزا ہے۔ اور حسرت سے کہنا کہ ع ایں کار از تو و مرداں چنیں کنند۔

علی گڈھ سیاست سے خارج ہے۔ سب کاغذات آتے ہیں۔ مگر اب تک ہم خاموش رہے۔ کہ جب احباب یہاں بھی خاموش ہیں تو ہمارا چیخنا چلانا فضول ہے۔ ۲۳ء کے متعلق ایک خط ضائع کروں گا۔ مگر در اصل تضیع اوقات ہے *

بھائی ہفتہ وار خط لکھا کرو۔ ماہوار جواب مل جائے گا۔ اور شاید سالانہ ملاقات بھی ہو جائے گی۔ سیاست بقول ظفر علی خاں "دور از کار" مشغلہ ہے۔ اس سے جلد تائب ہو۔ مزید ار خط لکھے جاؤ۔ خوش رہو اور ہم کو خوش رکھو۔ یہی شغل کافی ہے۔ اللہ بس، باقی ہوس۔

سلام کو سلام۔ یعقوب کو دعا۔ رادی کو پیار۔

تمہارا خیر طلب

محمد علی

فلسفہ اور جذبات

(ماخوذ از جرمن)

فلسفے کی حقیقت اور تعریف

فلسفہ کوئی ایسی چیز نہیں جو دنیا سے مٹ جائے۔ ہر زمانے میں ہر قوم نے اس کی قدر کی ہے۔ گو اس کو بیخ و بن سے اکھیڑ دینے کی کوششیں پیہم کی گئیں لیکن انسان کے دل و دماغ میں اس نے اپنی بنیادیں ایسی مضبوط کر رکھی ہیں جن کا کھود کر پھینک دینا امرِ محال ہے۔ ہر شخص جو ذرا بھی حیوانیت کے دائرے سے قدم باہر نکالے اور ذرا بلند مقام پر پہونچکر دنیا کے تماشے کا گہری نظر سے مطالعہ کرے، ایک ذاتی فلسفہ کا مالک بن سکتا ہے۔ سوال صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ آیا اس کے فلسفے کی عمارت چند اتفاقی مقدمات اور منتشر مشاہدات کی بنا پر قائم ہے یا اس نے حقیقت کے ہر پہلو کو دانش کی کسوٹی پر کسا ہے اور اس کی حکمت نے غور و فکر کا جنم لیا ہے۔

انسان کو حیوان پر اس وجہ سے فضیلت حاصل ہے کہ وہ قوت ادراک اور اس کے ساتھ قوت عمل کا مالک ہے۔ ان قوتوں کی معاونت سے وہ جز سے کل کی جانب رجوع کر سکتا ہے۔ ورنہ حیوان دیکھتا بھی ہے، سنتا بھی ہے، تصور بھی کر سکتا ہے اور قوت حافظہ سے بھی بہرہ ور ہے۔ لیکن وہ کبھی ان قوتوں کو کام میں نہیں لاتا۔ غور و فکر کے ساتھ ان کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتا۔ اس کے لئے یہ سب چیزیں برابر ہیں۔ اس کی آنکھیں دنیا کا سارا تماشہ دیکھتی ہیں۔ اس کے کان ہر قسم کی آواز سنتے ہیں۔ اس کا دماغ تصور اور یادداشت کی قوتوں سے محروم نہیں۔ لیکن پھر بھی وہ سب باتوں کا قدرت کی روش کے مطابق مشاہدہ کرتا ہے اور اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ یہ سب چیزیں اس کی قوت ارادہ کو میدان عمل میں لانے کے لئے درکار ہیں۔ اور کسی مصرف کی نہیں۔ لیکن انسان اپنی دماغی قوتوں سے ضروریات عامہ کی خدمت لینے کے علاوہ بھی غور و فکر کے کام میں لا سکتا

یعنی غیر موجود شے کے وجود کے امکان وغیرہ سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم انھیں وحشی قوموں تک میں اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کہ وہ سورج نکلنے، دن رات کے ظہور میں آنے اور روزانہ زندگی کے معمولی مشاہدات کی بنا، اپنے اعتقاد یا عقل کے مطابق کسی دیوتا، درخت، آگ وغیرہ پر رکھتے ہیں اور اسی کو مسبب الاسباب سمجھتے ہیں۔ جب تک انھیں یہ نہیں معلوم ہوجاتا کہ یہ تغیر و تبدل کس کی قدرت کے مظاہر ہیں۔ سکون قلبی ناممکن ہے۔ اس کے بغیر وہ اسی تگ و دو میں رہیں گے۔ ورنہ وہ وہ ذوی العقول انسان کہلائے جانے کے قابل نہیں ہو سکتے یہی ادھیڑبن وہ شے ہے جس کا نام فلسفہ ہے۔ اور اس کا سبب تولد بھی یہی انسانی بیقراری اور تشنگیٔ انکشافِ حقیقت ہے۔ اشیائے عالم کی کنہ، باہمی مناسبت اور علت کے متعلق تصورات وخیالات کو فراہم کرکے حقیقت کے معلوم کرنے کو فلسفہ کہتے ہیں ؛

اب آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ہر قوم اور ہر شخص کم از کم اوسط درجہ کی عقل رکھنے والا، ذاتی فلسفے کا بھی مالک ہوتا ہے۔ گنوار سے گنوار آدمی بھی اپنا فلسفہ رکھتا ہے۔ خواہ اس کے فلسفے کی بنا مذہب کے تعلیمی اصول ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر آپ اس دنیا اور انسان کے آغاز و انجام اور فرائض کے متعلق سوال کریں۔ تو اس کے پاس جواب موجود ہوگا۔ وحشی اقوام بھی دنیا کے تصور اور اس کی ساخت کے متعلق خاص عقائد رکھتی ہیں۔ ان کے دماغ میں موجودات عالم کے عدم اور وجود کی صورت مرتسم ہے۔ کائنات اور انسانی زندگی کے مناسبات اور تعلقات کو وہ پہچانتا ہے۔

لہٰذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ فلسفیانہ تفکر ذہن انسانی کا ایک عام فعل ہے۔ جب تک انسان میں قوت فکر کا نام و نشان باقی رہے گا۔ فلسفہ بھی قائم رہے گا ؛

فلسفہ کا رشتہ مذہب اور علم الاصنام سے

اب یہ بات صرف یہ ہے کہ عوام لفظ فلسفہ کو روزانہ بول چال میں نہایت تنگ معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ہم طوفان نوح سے پہلے کی تاریخ فلسفہ یہاں دہرانا نہیں چاہتے اور نہ مذہبی

تعلیم اور وحشی اقوام کے تصور دنیا کو فلسفے کے نام سے پکارتے ہیں۔ بلکہ فلسفے کو مذہب اور علم الاصنام سے علیحدہ چیز سمجھتے ہیں۔ یہاں ان اختلافات سے چشم پوشی کرنے کا خیال نہیں ہے۔ بلکہ کوشش اس بات کی کی جائے گی کہ ان اختلافات کو جو مذہب اور فلسفہ کے درمیان ہیں، تفصیلاً بیان کرکے فلسفے کی حقیقت پر روشنی ڈالی جائے۔

دو صورتوں میں اس اختلاف کی کیفیت بیان ہو سکتی ہے۔ فاعل کے لحاظ سے اور فعل کے لحاظ سے۔ پہلی صورت جو اختلاف کی ہے، وہ یہ ہے کہ علم الاصنام کے مطابق تصور عالم ایک اجتماعی فکر کا نتیجہ ہے۔ اور فلسفہ اس کے برخلاف فکر کی کمائی ہے۔ جب کبھی بھی ہم فلسفہ کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو اس سے مراد ہمیشہ ایک خاص شخص کے نتیجہ فکر سے ہوتی ہے۔ بغیر کسی فلسفی کے فلسفے کا وجود غیر ممکن ہے۔ اسی وجہ سے وہ فلسفہ اسی کے نام سے منسوب ہوتا ہے مثلاً فلسفہ افلاطون، فلسفہ کانٹ۔ علم الاصنام بھی زبان کی طرح کسی ایک شخص کی ایجاد نہیں ہوتا۔ بلکہ پوری جماعت اس کی اختراع میں شریک کار ہوتی ہے جس طرح زبان کا کوئی موجد نہیں ہوتا۔ اسی طرح علم الاصنام اور مذہبی تصور عالم کا بھی کوئی موجد نہیں۔ مذہب اصل میں شاعری اور زبان سے قریبی رشتہ رکھتا ہے۔ مصری اور یونانی مذہب کے بانیوں کے متعلق ہمارے زمانے میں کسی کو علم نہیں۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے مذہب کے بانیوں سے ہم واقف ہیں لیکن ان دونوں مذہبوں نے تصور عالم میں، جو پہلے سے موجود تھا، کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا۔ بلکہ زیادہ تر انقلاب طرز زندگی میں ظاہر ہوا ہے۔ یعنی ذہنی انقلاب کی بہ نسبت عملی انقلاب زیادہ ظہور میں آیا۔

فاعل کے اختلاف کی بنا پر اختلاف فعل بھی لازم آتا ہے۔ فلسفہ جستجو و تفحص عقل کا نتیجہ ہے۔ مذہبی تصور عالم شاعرانہ واردات کا ثمرہ ہے۔ جو موجودہ تصورات میں تصرف کرنے کو تیار ہوتا ہے اور عالم بالا سے تعلق رکھتا ہے۔ تمام ارضی اور سماوی تغیرات و حادثات بغیر کسی ربط و ضبط کے آسمانی طاقتوں کے مظاہر خیال کئے جاتے ہیں۔ یہ آسمانی طاقتیں انسان سے

دشمنی یا ہمدردی کا برتاؤ کرتی ہیں۔ اس کے مقاصد کی تکمیل میں معاونت بہم پہونچاتی ہیں۔ یا سنگ رہ بنتی ہیں۔ ان کے نزدیک تمام عالم کائنات کی تفصیل "کیوں ؟" اور کس لئے ؟" کا جواب ہے ۔

فلسفہ اس کے برخلاف عقل کو اپنا آلۂ کار بناتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ موجودات عالم کو موجودہ شکل میں اپنے سامنے رکھتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ "کس لئے ؟" کا جواب ڈھونڈھے۔ وہ "کیا ؟" اور "کس طرح ؟" کے سوالات کے مطابق موجودات عالم کی تفتیش کرتا ہے۔ اور پھر ان کی مناسبت زمان و مکان کے لحاظ سے معلوم کرتا ہے۔ اس طرح وہ موجودات کے آپس کے ربط ضبط سے واقف ہوکر ترقی کرتا ہے۔ ان انکشافات کو ملا کر ایک بڑے نظام کی بنیاد رکھتا ہے اسی کو سائنس کا طریقہ کہتے ہیں۔ اصل میں فلسفہ سوائے حقیقت کو سائنس کی مدد سے دریافت کرنے کے کوئی دوسری چیز نہیں ۔ اور یہ مذہبی تصور عالم کے بالکل خلاف ہے ۔

ظاہر ہے کہ تصور عالم از روئے مذہب یا فلسفہ افراد کے ذہن میں مختلف صورتوں میں موجود ہے۔ فلسفہ میں ہر شخص انفرادی طور پر عقل کے مطابق اور مذہب اور علم الاصنام ہں اعتقاد کے مطابق حصہ لیتا ہے۔ فلسفے میں اعتقاد ایسی ہی چیز ہے جیسے مذہب میں ایجاد۔ ہر بڑے سے بڑے مذہب میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ اس میں کوئی تفکر و تفحص کے ساتھ حصہ نہیں لے سکتا۔ بلکہ صرف اجتماعی اور تاریخی زندگی کے ایک حامل کی حیثیت سے تصورات عالم مذہبی تعلیم کے مطابق اس کو ماننے پڑتے ہیں۔ لیکن فلسفے میں تصورات عالم ہر شخص کے ذاتی تفکر کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ پھر بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب تصورات عقل انسانی کی جستجو و تفحص کا نتیجہ ہیں ۔ اور جو شخص اپنے ذاتی تفکر کو کام میں لاتا وہ اسی نتیجے پر پہونچتا ۔

مذہب اور فلسفہ کی اندرونی اختلافات کی تفصیل سے اس تاریخی امر پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ مذہب اور فلسفہ کے درمیان البتہ مخاصمت رہی ہے۔ اسی وجہ سے عہد عتیق اور

جدید میں یونانی فلسفہ اور مذہبی تصور عالم کے مابین کشمکش رہی جس کا نتیجہ ان کی آپس کی کھلی دشمنی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس تصادم و اختلاف کی مشہور مثال فلسفہ یونان کی تاریخ میں سقراط کی زندگی کا فیصلہ ہے جس کو خداؤں اور دیوتاؤں کو برا بھلا کہنے والے اور نوجوانوں کی ذہنیت کو تخریب کرنے والے کی حیثیت سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی مثالیں دنیا کی تاریخ میں موجود ہیں۔ عہد جدید میں تاریخ فلسفہ کا ایک ورق بھی ایسا نہیں ملے گا جو ان ظاہری اور اندرونی جھگڑوں سے خالی ہو۔ فلسفے کے حامل مروجہ مذہب کے محافظوں کی مخالفت کی آماجگاہ بنے رہے، لیکن انہوں نے بھی موجودہ تعلیم اور تصورات عالم کی مخالفت پر کمر باندھ رکھی تھی۔ اور ان کو اس کا احساس بھی تھا بڑے بڑے فلسفی دشمن مذہب خیال کئے جاتے تھے۔ ان سے قانونی باز پرس کی جاتی تھی۔ اور سزا دی جاتی تھی۔ ان کی تحریریں ضبط کی جاتی تھیں اور ان کی اشاعت ممنوع قرار دی جاتی تھی۔ یہ لوگ جلاد کے حوالے کر کے زندہ آگ میں ڈلوا دیے جاتے تھے۔ یہ لڑائی اب تک بدستور قائم ہے، یہ آگ ابھی بجھی نہیں۔ فلسفہ حق کی کسوٹی پر نہیں کسا جاتا۔ بلکہ مروجہ اعتقاد کے مطابق جانچا جاتا ہے کہ وہ مذہب میں کس حد تک کھپایا جا سکتا ہے۔ اگر وہ اس امتحان میں پورا نہیں اترتا تو باعث ضرر اور باعث تخریب خیال کر کے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔

اس مخاصمت کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ فلسفہ اور مذہب میں قریبی رشتہ ہے۔ یہ دو آپس میں دشمنی رکھنے والے بھائیوں کی لڑائی ہے۔ بڑا بھائی اپنی فوقیت کو منوانا چاہتا ہے۔ اور چھوٹا بھائی اس سے ستابی کرتا ہے۔ وہ مذہب کا غلام بن کر رہنا گوارا نہیں کرتا۔ بلکہ آزاد اور مطلق العنان ہو کر اپنا کام کرنا چاہتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ افراد کی اپنی آزادی کے لئے جماعت سے لڑائی ہے، ہر جگہ فلسفے کو اپنے عنفوان زندگی میں قدیم تصورات عالم سے جو جماعت کے تفکر کا نتیجہ ہوتے ہیں، سابقہ پڑتا ہے۔ اجتماعی تخیل بمقابلہ انفرادی تخیل کے قدیم ہے۔ ارتقار کی ابتدائی منازل میں جماعت ہی سب کچھ ہوا کرتی ہے اور فرد محض جماعت کا نمونہ ہوتا ہے۔ جس طرح وہ عمل اور حکم میں رسوم کا پابند ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کا تخیل بھی جماعت کے مذہبی تصورات و تخیلات کے

ماتحت ہوتا ہے۔ ذاتی تفکر کا امکان ارتقائے ابتدائی دور میں محال ہے۔ لیکن اہستہ آہستہ ترقی کے مدارج کو طے کر کے شخصی اختلاف اور انفرادی تفکر نمایاں ہوتا ہے۔ پھر بعض افراد میں عوام سے بڑھ جانے کی ہمت پیدا ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ نئے تخیلات کی بھی جرات ہوتی ہے۔ ارسطو کے نزدیک حیرت اور Descartes کے نزدیک شک وشبہ فلسفہ کی پہلی سیڑھی یا ابتدار ہے۔ دونوں اصل میں ایک ہی چیز ہیں۔ یعنی انفرادی تفکر کا پیدار ہونا۔ اس شک اور حیرت کی وجہ سے فلسفی موجودات یا کائنات کے متعلق نت نئے نظریئے قائم کرتا ہے قدیم اور عام تخیل اس عبارت پر برہم ہو کر کہتا ہے کہ اے فلسفی! تو اپنے آباو اجداد کے مسلمہ تخیلات وتصورات پر بس کیوں نہیں کرتا؟ فلسفی کی کوششوں کو سرکشی سمجھ کر ان کا انسداد عین انصاف اور فرض خیال کیا جاتا ہے۔ وہ اس وجہ سے کہ یہ فلسفہ عام تخیلات کے دائرے سے قدم باہر نکالنے کا اور پرانی رسوم کی بندشوں کے توڑنے کا راستہ صاف کردے گا یا پھر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ فلسفہ کو ہمارے تصورات وتخیلات کو استوار اور مستحکم بنانے کی خدمت سپرد کردی جائے ۔

پہلے زمانہ میں فلسفے کی مخالفت اتنی قوی اور موثر نہ تھی۔ اول تو تصورات عالم میں ہی اختلاف تھا۔ کوئی تنظیم ایسی نہ تھی جو فلسفہ کا اچھی طرح سے مستقل طور پر مقابلہ کر سکتی۔ فلسفہ نے اس پوری آزادی سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے برخلاف آجکل دوسری صورت ہے۔ مذہب نے اس قدر فلسفہ اپنے اندر شامل کر لیا ہے کہ تفکر کی آزادی کی جگہ بھی نہیں چھوڑی۔ اسی وجہ سے اب لڑائی سخت اور طویل ہے۔ اس لڑائی کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا۔ یہی کوششیں جاری ہیں کہ فلسفہ کو مذہب کے ماتحت لے آئیں۔ (چنانچہ مذہبی مدرسوں میں ایسا ہی ہوتا ہے)

اس لڑائی کا کیا نتیجہ ہوگا؟ کیا یہ لڑائی ہمیشہ قائم رہے گی؟ کیا امن وصلح کا بھی کوئی امکان ہے یا دونوں مخالفوں میں سے ایک کی شکست، یا خاتمے کے بعد اس لڑائی کا فیصلہ ہوگا؟

دنیا کے زیادہ تر طبقوں میں یہی خیال غالب ہے اور ان کا اعتقاد ہے کہ مذہب کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ سائنس اور فلسفہ نے مذہب کو بیخ وبن سے اکھاڑ دیا ہے۔ آخر کار انجام یہ ہوگا

کہ سائنس ہی تمام دنیا پر مسلط ہوگی ۔

ہم اس رائے سے اتفاق نہیں رکھتے۔ ایک لحاظ سے یہ خیال درست ہے۔ قدیمی تصورات عالم میں بے شک خلل واقع ہوگیا ہے اور وہ محو ہوتے جاتے ہیں۔ دیوتاؤں پر یہ اعتقاد کہ وہ انفرادی طور پر غیر مرئی اثیار کی طرح کسی جگہ پر مقیم ہیں اور اپنے دست قدرت سے عالم کائنات کے سلسلۂ اسباب میں دخل دیسکتے ہیں، ناپید ہوتا جارہا ہے۔ جب تک فلسفہ اور سائنس زندہ ہے۔ اس کا پھر سے جنم لینا محال ہے۔ ان کی تعداد کی کمی بیشی یہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتی ۔

اس کے برخلاف ہمارا یہ اعتقاد نہیں کہ سرے سے مذہب ہی دنیا کے پردے سے نیست و نابود ہو جائے گا۔ ہم یہ یقین نہیں کر سکتے کہ انسانی ذہن صرف معقولات کے انکشافات سے حقیقت کی معرفت حاصل کرے گا۔ اور اسے اطمینان نصیب ہو جائے گا۔ اگر انسان صرف نفس ناطقہ ہوتا تو ممکن تھا کہ ان انکشافات کے ٹکڑوں پر بس کر کے بیٹھ جاتا جو اس کو علوم عقلیہ کی چھان بین تفحص کے ذریعے حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ وہ محض عقل ہی عقل نہیں ہے بلکہ قوت ارادی اور احساس بھی رکھتا ہے جن کے باعث مذہب کی جڑیں مضبوط ہیں۔ عاجزی اور بے بسی کا احساس وجود مطلق کی معرفت جو مناظر قدرت کے مطالعے کے وقت دل میں سما جاتی ہے، نفس انسانی اور حقیقت خارجی کے تعلق کو بلا واسطہ اس طرح حل کر دیتی ہے کہ سائنس کی اصطلاحات اور انکشافات کے ذریعے ناممکن ہے۔ اس سے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ دنیا کوئی بے معنی یا لایعنی طاقتوں کا کھیل نہیں ہے۔ بلکہ ایک سراپا خیر ذات کا مظہر ہے۔ جسے اور سب چیزوں کے مقابلہ میں انسان سے زیادہ ربط اور تعلق ہے۔ مذہبی عقیدے کی بنیاد یہی احساس ہے کہ جس ذات کو میں سب سے اعلیٰ اور افضل سمجھ کر احترام اور محبت کی نظر سے دیکھتا ہوں وہی حقیقت کا انکشاف کر سکتی ہے نیک اور کامل ذات جس کی طرف میرا دل کھنچتا ہے۔ تمام عالم کائنات کا سبب اور مقصد ہے۔

یہ یقین سائنس نہیں دلا سکتی۔ اس وجہ سے سائنس مذہب کو مٹا بھی نہیں سکتی۔ اس کی جڑیں عقل سے پیوستہ نہیں بلکہ دل میں ہیں۔ عقل کسی چیز کے اچھے یا برے، ادنیٰ یا اعلیٰ ہونے کا

فیصلہ نہیں کرتی بلکہ صحیح اور غلط، حق اور باطل کے درمیان فرق بتاتی ہے۔ وہ تو صرف حقیقت کی جستجو کرتی ہے۔ مگر انسان صرف آلۂ تحقیق ہی نہیں ہے۔ اسی لئے وہ سائنس کے علاوہ شاعری، آرٹ اور مذہب میں بھی حصہ لیتا ہے۔ کم از کم ایک مقام ایسا ہے جہاں سائنس کے دائرے سے قدم باہر نکالنا ہی پڑتا ہے۔ وہ انسان کی ذاتی زندگی اور مستقبل ہے۔ اس کی زندگی کا کچھ نہ کچھ مقصد ضرور ہوتا ہے اور اس مقصد کے حصول کی وہ کوشش کرتا ہے جس کا نتیجہ آئندہ زمانے پر موقوف ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان کو سائنس کے ساتھ ساتھ عقیدے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کی بدولت اپنی زندگی کا مقصد پورا ہونے کی امید رکھتا ہے۔ لیکن اس کا مقصد زندگی محض انفرادی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا رشتہ اس کی قوم کی تاریخی زندگی بلکہ تمام بنی نوع انسان سے وابستہ ہے اسی لئے وہ اپنی قوم کے مستقبل پر بھی اعتقاد رکھتا ہے۔ ایسا مستقبل جو بنی نوع انسان کے لئے حق، انصاف اور تمام خوبیوں کا حامل ہو۔ یہ اعتقاد خود مذہب سے مشابہت رکھتا ہے خواہ انسان اس مشابہت کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔

ہر شخص میں انصاف کا مادہ موجود ہے وہ حق اور خیر کا حامی بن کر اس کو تمام مخالف قوتوں کے مقابلے میں کامیاب بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک قوم اپنی زندگی اور قوموں سے قطع تعلق کرکے بسر نہیں کرسکتی بلکہ وہ ان کے ساتھ ایسے رشتوں سے مربوط ہے جنھیں توڑنا ناممکن ہے۔ اگر یہ کہ سچ جھوٹ کے مقابلہ میں، انصاف بے انصافی کے سامنے، اچھائی برائی کے آگے کمزور ہونے کے باوجود ایک دن فتح پائے گی تو اس اعتقاد میں کیا قباحت ہے کہ دنیا پر اسی قوت کا تسلط ہے جو اچھی ہے۔ جو شخص انسان کی ارتقار اور مقصد زندگی کی تکمیل پر اعتقاد رکھتا ہے اور ساتھ ہی انسانی زندگی کو کائنات کا ایک باب سمجھتا ہے اس کو کائنات کے کسی نہ کسی مقصد کا ضرور قائل ہونا پڑے گا۔ اجتماعی تاریخ کے مقصد بلکہ ذاتی زندگی کے مقصد پر علم اور استدلال سے کافی روشنی نہیں پڑتی۔

یہی وہ راستہ ہے جو مذہب اور علم کی صلح کی طرف جاتا ہے۔ فلسفے اور مذہب کے

مابین مستقل صلح ممکن ہے۔ یہ کوئی عارضی معاہدہ بے پرواہی اور حقارت کی بنا پر نہیں ہوگا۔ بلکہ فریقین کے درمیان حقیقی صلح ہوگی۔ جس میں کہ فریقین ایک دوسرے کے وجود کو لازم اور آزاد خیال کریں گے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ ہر ایک کے کام کی حد و مقرر ہو جائیں۔ سب سے پہلے مذہب کو فلسفے اور سائنس کے کاموں میں دخل دینا ترک کرنا چاہیے۔ وہ سائنس کو حقیقت کی جستجو میں پوری پوری آزادی دے۔ نہ تو اس کی جد و جہد کو مذہبی احکام سے محدود کرے اور نہ علمی مسائل کے قیاسی نتائج کو عقیدے کے نام سے پیش کرے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سائنس اور فلسفہ کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہے۔ سائنس کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ انسان کو کبھی پوری طرح مطمئن نہیں کر سکے گی۔ اور نہ وہ حقیقت کی انتہا کو پہنچ سکتی ہے۔ وہ مذہب کی قائم مقام نہیں بن سکتی۔ مذہب کا میدان عمل دوسرا ہے جس میں وہ دخل نہیں دے سکتی۔ کائنات کے متعلق کیا؟ اور کس طرح؟ کے سوالات کے بعد خود بخود انسان کے سامنے "کس لئے؟" کا سوال بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ گو فلسفے اور سائنس نے بھی ان سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اب یہ یقین ہوتا جاتا ہے کہ ہر کام سائنس کے ذریعے انجام پانا مشکل ہے۔ گوئٹے (Goethe) کہتا ہے "اگر وجود کو انسانی عقل سے تقسیم کریں تو کچھ نہ کچھ ضرور باقی رہتا ہے" پس مذہب کا کام موجودات کا منشا بتانا ہے۔ از روئے عقل نہیں، بلکہ از روئے عقیدہ۔

سائنس، فلسفہ، اور مذہب اصل میں ایک ہی چیز ہے۔ خدائے تعالیٰ کے مسبب الاسباب ہونے کو سائنس بھی حقیقت کے انکشاف کا اصول سمجھتی تھی، لیکن آہستہ آہستہ ان میں اختلاف پیدا ہو گیا جیسا کہ ہم عموماً دیگر قدرت کے مظاہر میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس اختلاف کی بنا پر سائنس مذہب سے علیحدہ ہو کر اپنا جداگانہ کام کرنے لگی۔ یعنی حقیقت کی جستجو اور تحلیل۔ مذہب نے حقیقت کو دوسرے رنگ میں لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ ان دونوں کے درمیان فلسفہ واسطے کی حیثیت سے ہے۔ وہ سائنس کے دوش بدوش حقیقت کی جستجو میں مصروف ہے۔ وہ اس امر سے غیر نہیں کہ مقصد سے بالکل حقیقت سے مقصد کا معلوم کرنا ناممکن ہے۔ بلکہ اس کے نزدیک

نیا ایک معمہ ہے جس کے مخفی مقصد کے انکشاف کو، وہ مذہب پر، جو اس کام کا ماہر ہے چھوڑ دیتا ہے ۔

اس فرق کو سمجھ لینے پر صلح ممکن ہے۔ جو یہ کوشش کرے کہ سائنس مذہب کے ماتحت ہو جائے۔ یا عقیدہ سائنس میں گھل مل جائے تو اس کی محنت رائگاں ہے۔ اس کے علاوہ وہ ان دونوں کی مصالحت میں بھی سنگ راہ بنتا ہے ۔

کیا صلح جلدی ممکن ہے؟ آثار تو ایسے ہی نظر آرہے ہیں۔ فلسفے نے تو اپنی طرف سے صلح کا ہاتھ بڑھا دیا ہے۔ کانٹ، Kant کہتا ہے۔ علم اور عقیدہ دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ انسان کے دل میں دونوں کے لئے برابر جگہ ہے۔ صلح کے لئے صرف اتنی بات کی ضرورت ہے کہ مذہب سائنس کو اس کے حقوق دیدے جس طرح وہ آہستہ آہستہ اس بات کا عادی ہو گیا کہ سیاسی حقوق رائے اس کے حکومت کے ہاتھ میں رہیں اسی طرح امید کی جا سکتی ہے کہ وہ عقل کو بھی کے حقوق دیدے۔ یعنی حقیقت کے انکشاف کی جستجو میں عقل کو پوری پوری آزادی مل ئے۔ مذہب اس تفحص اور تحقیق کے نتائج کی مخالفت نہ کرے۔ پھر فلسفہ اور سائنس بھی تقاد میں مداخلت کرنا چھوڑ دیں گے۔ گوئٹے (Goette) کہتا ہے کہ "فکر کرنے والے انسان لئے سب سے بڑی خوش قسمتی اسی بات میں ہے کہ وہ جس چیز کی جستجو کر سکتا! اس کی جستجو ئے۔ اور جس کا کھوج نہ پا سکے اس کا احترام کرے" لیکن مذہب جس کے پاس حکومت رہ ل ہے اس کا بغیر کسی مخالفت کے میدان خالی کر دینا محال ہے۔ جاڑے کا موسم بھی اس وقت ں نہیں جاتا جب تک بہار کے شروع میں ایک دو دن اچھی طرح سردی نہ پڑے۔ لیکن بہار تی ہے پر آتی ہے۔ اس وجہ سے مذہب کی مخالفت سے بددل نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ یہ تو اچھے ثار ہیں۔

مذہب کو چاہئے کہ وہ تعصب، نفرت اور سخت سزاؤں کے ذریعے اپنی سچائی کا ثبوت ۔ بلکہ انصاف اور محبت سے لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچے ۔

ایڈیسن

مہذب دنیا کا کون فرد بشر ایسا ہے جو ایڈیسن Edison کے نام سے واقف نہیں ہے۔ اگر کوئی ناواقف اس کے نام سے واقف نہ بھی ہو تو کم از کم اس کی ایجاد سے فائدہ تو ہر شخص نے اٹھایا ہوگا۔ آج ہم اس کے حالات زندگی سپرد قلم کرتے ہیں :-

ایسے افراد کئی صدیوں کے بعد کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ ابھی ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اس کا ثانی اس صدی میں کوئی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ بظاہر تو کوئی نظر نہیں آتا۔ بعض لوگ ہیں جنہوں نے بہت سی ایجادیں کی ہیں مگر وہ ایک خاص لائن میں ہی ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ مگر ایڈیسن کو خدا تعالیٰ نے ایسا دماغ دیا تھا جس کی ایجادیں زندگی کے ہر شعبہ میں پائی جاتی ہیں ۔

اس کا پورا نام ٹامس آلوا۔ ایڈیسن تھا۔ یہ امریکہ کی ریاست اوہایو Ohio کے شہر ملان میں ۱۱ر فروری ۱۸۴۷ء کو پیدا ہوا تھا۔ غریب ماں باپ کا لڑکا تھا۔ اسکول میں ہمیشہ پھسڈی رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے استادوں نے لکھ دیا کہ یہ لڑکا کسی کام کا نہیں۔ مگر جب اس کا انتقال گذشتہ سال ۱۸ر اکتوبر کو ہوا تو تمام دنیا میں اس کا ماتم ہوا۔ اور سب اس کی عظمت کو تسلیم کر چکے تھے۔ یہ ماتم اس لئے نہیں ہوا کہ یہ سب کا رشتہ دار اور دوست تھا، بلکہ یہ ماتم اس لئے ہوا تھا کہ سب نے بالاتفاق یہ تسلیم کر لیا تھا کہ ایسا مافوق البشر انسان اور صاحب کمال کبھی صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اب نہ معلوم کب پیدا ہو ۔

امریکہ کے پریسیڈنٹ مسٹر ہوور Hoover نے کہا کہ ایڈیسن ایسا قیمتی سرمایہ تھا جس نے دنیا کی تہذیب کو بدل دیا ۔

یہ تو ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ اسکول کے کام میں ہمیشہ نکما ثابت ہوا۔ اور غربت کی وجہ سے اسے اچھی طرح تعلیم نہ دی جا سکی۔ اس لئے تیرہ سال کی عمر میں ہی اس نے مدرسہ کو خیرباد

کہہ کر اخبار فروشی کی ملازمت کرلی۔ اس کا کام یہ تھا کہ یہ دو شہروں کے درمیان جاکر اخبار فروخت کرتا تھا۔ اسے بچپن سے ہی دواؤں کے ترکیب دینے کا شوق تھا۔ لہٰذا اس نے ریل کے ایک ڈبہ میں چند بوتلیں جمع کرکے اپنا دواسازی کا تجربہ خانہ بنالیا۔ پھر اسے خود اخبار نکالنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ اس نے خود ہی ایک پریس بنایا اور ایک اخبار نکالنا شروع کیا۔ خود ہی اس کا ایڈیٹر تھا، خود ہی چھاپنے والا تھا، خود ہی شائع کرنے والا اور خود ہی فروخت کرنے والا تھا۔ اس اخبار کی انتہائی اشاعت چار سو تک پہونچی تھی۔ اتفاق سے ایک روز ریل کے ڈبہ میں ایک اسفورس کی بوتل گر گئی جس سے ریل میں آگ لگ گئی۔ جب گارڈ کو ایڈیسن کے دارالتجربہ کا حال معلوم ہوا تو ان کے ایک ایسا چپت رسید کیا کہ مزاج بحال ہوگیا۔ ایک کان بہرا ہوگیا۔ اور ان کا کل اختر بختر گارڈ نے نکال کر پھینک دیا +

اب یہ پھر بیکار پھرتا رہا۔ مگر تقدیر نے یاوری کی۔ ریل کے ایک افسر کا بچہ کسی حادثہ کی وجہ سے مرنے والا تھا۔ کہ ایڈیسن نے وقت پر پہونچکر اس بچہ کی جان بچالی۔ اس احسان کے شکریہ میں اس افسر نے ایڈیسن کو تار کا کام سکھادیا۔ اور بہت جلد یہ مشہور ہوگیا کہ ایڈیسن سے زیادہ تیز تار دینے والا کوئی دوسرا نہیں۔ اس میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ دونوں ہاتھوں سے ایک ہی رفتار و روانی سے لکھ سکتا تھا +

اس کا بیقرار دل کبھی اسے ایک جگہ جم کر رہنے نہیں دیتا تھا۔ لہٰذا اس کا یا تو تبادلہ ہوتا رہتا تھا یا خود چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جاتا تھا۔ اسی زمانہ میں جب یہ تار گھر میں ملازم تھا ایک یہ قاعدہ تھا کہ ہر آدھ گھنٹہ بعد یہ ایک کھٹکا جواباً دیدیا کریں۔ اس نے فوراً ایک دانت والا پیہ ایسا ایجاد کیا کہ جو خود بخود ہر آدھ گھنٹہ بعد کھٹکا کردیا کرتا تھا۔ جب افسروں کو یہ بات معلوم ہوئی تو بجائے اس کی تعریف کرنے یا انعام دینے کے اسے برخاست کردیا۔ ہر احمق افسر اپنے قابل ماتحت کے ہمیشہ ایسا ہی سلوک کرتا ہے۔ مگر یہی بات اس کی آئندہ ترقی کا باعث ہوئی۔ اور یہ دانت والا پیہ اس کے نام سے پیٹنٹ ہوکر اس وقت دنیا میں

جگہ بڑھتا جاتا ہے۔

اب یہ بیکاری کی وجہ سے پریشان حال بھٹکتے بھٹکتے نیویارک پہونچا۔ وہاں نیویارک ٹائمز کی ایک مشین بگڑ گئی تھی جو کسی سے درست نہیں ہوتی تھی۔ جب ایڈیسن نے اس مشین کو درست کر لیا تو اسی اخبار نے اسے تین سو ڈالر ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ اسی زمانے میں اس دانت والے پلیہ کی ایجاد کے جس کی وجہ سے اس کی نوکری گئی تھی اسے پچاس ہزار ڈالر ملے۔

اس روپے کو اس نے بیکار نہیں ضائع کیا۔ بلکہ اس سے تجربہ خانہ کھولا جس میں اس نے باقاعدہ ایجادوں کا کام شروع کر دیا۔

یہ کسی اور چیز کی دھن میں تجربات کر رہا تھا کہ اتفاق سے فونوگراف کی ایجاد ہو گئی۔ اور اس ایجاد کے اسے دس لاکھ ڈالر ملے۔ دنیا میں کون شخص ایسا ہے جس نے گراموفون نہیں سنا ہوگا۔

اس کی سب سے بڑی ایجاد بجلی کا قمقمہ ہے۔ یہ قمقمہ ۲۱ اکتوبر ۱۸۷۹ء کو کامیابی کے ساتھ طیار ہوا۔ اور اس قمقمہ کی پچاس سالہ جوبلی امریکہ میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی اور ۵۰ سال بعد اس ایجاد کے ایڈیسن اسی تاریخ کو دفن ہوا۔ سینما کی مشین بھی اس نے ایجاد کی تھی۔ مگر نہ معلوم کیوں اس نے زیادہ توجہ نہیں کی۔

اس کی ۸۴ سال کی عمر ہوئی۔ اگر تیس سال اس کی ابتدائی زندگی اور تعلیم کے نکال دیئے جائیں تو بقیہ ۵۴ سال میں اس کی پندرہ سو ایجادیں ہوئی ہیں۔ ان میں سے ہر ایجاد ایسی ہے جو دوسرے آدمی کو عمر بھر کے لئے شہرت، ناموری اور دولت سے مستغنی کر سکتی ہے۔ مگر ایڈیسن کی خصوصیت تھی کہ وہ کبھی کام کرنے سے نہیں تھکتا تھا۔ اس کی ایجادیں اگر تقسیم کی جائیں تو ہر تیرھویں دن ایک نئی ایجاد کا اوسط آتا ہے۔

اس کی ایجاد کا حال اس قول سے بھی ہوگا کہ اس سے کسی نے ایجاد کرنے کا راز دریافت

اور خود ہی سائل نے کہا کہ غالباً الہام Inspiration ہوتا ہے۔ ایڈیسن نے جواب دیا کہ ایک حصہ Inspiration اور سو حصہ یعنی پسینہ۔ یعنی ایک خیال آنے سے ہی ایجاد نہیں ہوتی بلکہ سو حصہ پسینہ بہایا جائے تب ایجاد ہوتی ہے۔

ایڈیسن اپنے ذہن میں ایک خیال پیدا کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد اس کے متعلق تجربات کیا کرتا تھا۔ اس کے دارالعمل میں دن رات کام ہوتا تھا۔ یعنی اس کے اسسٹنٹ تجربات کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھتے تھے۔ رات کا کام کرنے والے صبح ہوتے ہی دن کے کام کرنے والوں کو تجربات سپرد کر دیتے تھے۔ صبح یہ خود آکر تمام مشاہدات کا مطالعہ کرتا تھا۔ بعض وقت کوئی اسسٹنٹ کوئی نئی تجویز پیش کرتا تو وہ اکثر یہ کہہ دیا کرتا تھا کہ فلاں زمانہ میں یہ تجربہ ہو چکا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا۔

اسے کھانے پینے کی کبھی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ اگر یہ آخر عمر میں شادی نہ کرتا تو غالب اب سے بہت پہلے محض اپنی صحت کی طرف بے توجہی کی وجہ سے مر چکا ہوتا۔ مگر اس کی بیوی اس کی ہر بات کا لحاظ رکھتی تھی۔ اکثر یہ تجربہ خانہ میں ہی سویا کرتا تھا۔ اگر کبھی گھر جاتا تھا تو صبح ۷ بجے ہمیشہ تجربہ خانہ میں آجایا کرتا تھا۔ آخری عمر میں سات بجے شام کو اکثر گھر چلا جاتا تھا۔ ۱۲ بجے ہلکا سا ناشتہ کرتا تھا اور اخبار وغیرہ پڑھ کر اور ملاقاتیوں سے مل کر ایک بجے پھر اپنے مطالعہ کے کمرہ یا دارالعمل میں آجاتا تھا۔

مشرقی اقوام کے برخلاف ایڈیسن کا یہ عقیدہ تھا کہ ہم لوگ اپنے اجداد سے یقیناً زیادہ عقلمند ہیں۔ اور ہماری آئندہ نسلیں ہم سے زیادہ عقلمند ہوں گی۔ انسان کی عمر سائنس و حفظان صحت کے ماتحت، اصول کی پیروی اور بے توجہی کی وجہ سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ انسان کی پیدائش کے وقت عمر مقرر نہیں ہوتی۔

ایڈیسن کے مذہب کے متعلق اس قدر یقینی ہے کہ وہ منکر ذات باری تعالیٰ نہ تھا۔ نہ متشکک تھا۔ اگرچہ اس کی زندگی میں اکثر ملاحدہ اور دہریہ اسے اپنا ہم مذہب سمجھتے تھے۔ مگر

حقیقت میں اس کے مذہب کو اکثر کم لوگ جانتے تھے۔ پادریوں کا فرقہ اس سے بدظن تھا مگر اس فرقہ کو اس کی تنگ نظری کی وجہ سے معذور سمجھنا چاہیے۔ مگر اہل بصیرت جو ایڈیسن کے حالات سے واقف تھے، وہ اسے دین دار سمجھتے تھے۔ مرنے کے بعد اس کے حالات جو امریکہ کے مختلف اخبارات میں شائع ہوئے ہیں ان کے دیکھنے سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی ذات کو مانتا تھا جس کی عقل وحکمت دنیا کو ایک نظام پر چلا رہی ہے۔ اس کے ایک دوست نے سوال کیا کہ کل موجودات کو کون چلا رہا ہے تو اس نے کہا کہ اندھا مادہ اس قدر عقلمند نہیں ہو سکتا۔ ایک حکیم وبصیر ذات ضرور ہے جو نظام کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

صلح پسندی اور بنی نوع انسان کی محبت اور خدمت اس کے مقاصد زندگی تھے۔ انجیل کے اس فقرہ پر کہ "تم اپنے پڑوسی سے محبت کرو جیسی تم اپنی ذات سے محبت کرتے ہو" ایمان تھا۔ اور یہ ایمان محض زبانی نہ تھا بلکہ اس پر اس کا عمل بھی تھا۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت محبت کرتا تھا۔ کیونکہ انھوں نے بنی نوع انسان کو محبت کی تعلیم دی ہے۔ مگر وہ ان کو خدا کا بیٹا نہیں مانتا تھا اور نہ وہ یہ مانتا تھا کہ انسان بغیر باپ کے فطری قوانین کے خلاف پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ مانتا تھا کہ انسان کے ہر جسم میں ایک عقلی قوت ہے۔ جو مرض کی مدافعت کرتی ہے۔ اگر کسی کی انگلی کٹ جائے تو زخم بھرنے کی قابلیت اسی عقلی قوت سے حاصل ہوتی ہے آدمی جب بیمار ہو جاتا ہے تو عقلی قوت ہی مرض کی مدافعت کرتی ہے۔ انسان کے جسم میں ایسے خلیے موجود ہیں جو خوردبین سے بھی نظر نہیں آتے عقلی قوتیں ان خلیوں سے بھی زیادہ باریک ہیں جن کو اصل مایہ حیات سمجھنا چاہیے۔ جب یہ قوت جسم کو چھوڑ دیتی ہے تو جسم ایک ایسے جہاز کے مانند ہو جاتا ہے جس پر نہ بادبان ہے، نہ ملاح اور نہ پتوار۔ اس کے معنے عرف عام میں یہ ہوئے کہ جسم مردہ ہو گیا۔

ایڈیسن کے خیالات روحانیات کے متعلق وقتاً فوقتاً بدلتے رہے۔ ایک زمانہ میں اس کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ عقلی مادہ مرنے کے بعد فضا میں چلا جاتا ہے اور دوبارہ کسی قالب میں آکر

ہوجاتا ہے۔ مگر آخر عمر میں اس خیال میں تبدیلی کرلی تھی ۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں سائنٹفک امریکن کے ایک نمائندہ کو اس کے استفسار کے جواب میں کہا تھا کہ میں روح کا کوئی تصور نہیں کرسکتا۔ کیونکہ نہ اس کا کوئی وزن ہے، نہ شکل ہے۔ اور نہ ں کوئی مادہ ہے۔ تین برس کے بعد اس نے عقلی قوت کے نظریہ پر زور دیا۔ مگر یہ بھی کہا کہ ۔ کے بعد بغیر حیات وہ کوئی زندگی کا تصور نہیں کرسکتا۔ یعنی نہ وہ روح کو مانتا تھا اور نہ حیات لمات مانتا تھا۔ یعنی بغیر حیات کے زندگی کیسی اور بغیر جسم حیات کہاں۔ اسے وہ ع نقیضین کہا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ زندگی حیات کے مجموعہ کا نام ہے۔ مگر اس ۔ بھی وہ ایک قادر مطلق حکیم و عاقل قوت کو مانتا تھا۔ مگر روح کے لافانی عقیدہ کے متعلق ۔ دراز تک اس کا یہی خیال رہا کہ بغیر کسی ثبوت کے کس طرح مانا جائے۔ سائنس کے اکتشافات ۔ حیات بعد الممات کا کوئی مشاہدہ اور تجربہ بتاکر ثابت کریں گے تو مرنے کے بعد کی زندگی کو مان ۔ گے اور اس وقت اس کیفیت کا کوئی نام رکھ لیا جائے گا۔ مگر مرنے سے کچھ روز قبل ں کے اس عقیدہ میں تبدیلی ہوئی۔ وہ پچاس فی صدی زندگی بعد موت اور پچاس فی صدی ل موت بعد موت ماننے لگا تھا۔ مگر مطلق یعنی سو فی صدی کبھی نہیں ہوا تھا۔ مگر مرنے سے چند ٹ قبل وہ ایک دم چونکا اور مسکرا کر کہا کہ دوسری دنیا تو بڑی خوب صورت ہے اور اس کے ر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ اس وقت اس کا معالج ڈاکٹر ہوWH OW موجود تھا معلوم ہوتا ہے۔ کہ خری وقت اسے دوسری دنیا کا یقین ہوگیا تھا اور اس نے کوئی ایسی چیز دیکھ لی تھی جس سے س کے عقیدے میں تبدیلی ہوگئی ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسی ہستی تھی جس کی نظیر ابھی چند صدیوں تک مشکل سے پیدا ہوگی ۔ ہمارا خیال ہے کہ سائنس کے دائرے میں تو اس کی بڑی ہستی مسلم تھی مگر فلسفہ اور مذہب میں ۔ اسے خود دعویٰ تھا۔ اصفہ اس کا کوئی بڑا مرتبہ سمجھنا چاہیے۔ اوپر کے حالات اس نظریہ کے شاہد ہیں کہ وہ اکثر اپنے نظریہ موت و زندگی کو مدتار ما ہے۔ مگر سائنس ہو، اس کی ہستی ضرور قابل فخر ابھی صدیوں تک رہے گی ۔

انقلاب فرانس

مولوی عبد القادر صاحب بی اے (جامعہ) کے بعض مضامین اس سے قبل بھی ہم شائع کر چکے ہیں۔ جو اپنے علمی معیار اور خاص خیالات کے سبب ہمیشہ پسند کیے گئے "انقلاب فرانس" ان کی کتاب کا ایک دلچسپ حصہ ہے جو مکتبہ جامعہ کی جانب سے عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مضمون ناظرین پسند فرمائیں گے۔

(مدیر)

یونان - روما - عرب
قدیم — وسطیٰ

تمہید جمہوریت یا آزاد حکومت کا اصول دور جدید کا بہترین عطیہ ہے۔ جن قوموں نے اپنی حکومتوں میں اس اصول کو داخل کر لیا ہے ان کی زندگی کی مصیبتیں بہت کچھ گھٹ گئی ہیں۔

جمہوری حکومت اس خیال پر مبنی ہوتی ہے کہ سب لوگ آپس میں برابر ہیں اور کسی ایک آدمی یا چند آدمیوں کی جماعت کو اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو مالک و مختار کل قرار دے دے۔ ملک جمہور کا ہے، اور حکومت ایک ایسا کاروبار جس کی غرض کل جمہور کی فلاح ہے۔ پس حاکم بھی اسی کو ہونا چاہیئے۔ جس طرح کوئی اپنی جائداد اور اس کا انتظام کسی غیر کے ہاتھ میں اس طرح دیدینا، کہ اپنا اختیار باقی نہ رہے، قرین مصلحت نہیں سمجھتا، اسی طرح جمہور کے لئے یہ مصلحت کے خلاف ہے کہ ملک اور اس کی حکومت دوسرے کے سپرد کر کے خود بے اختیار بن جائے۔ غیر کو مختار کل بنا دینے سے اس کی بددیانتی، نالائقی، یا ہر دو سے نقصان پہونچنے کا ہر وقت احتمال رہتا ہے۔ ایسے اشخاص بہت کم ملتے ہیں جن میں لیاقت اور ایمان داری دونوں صفتیں موجود ہوں۔ اور ان لوگوں کو بھی ہمیشہ نگرانی اور اس بات کے اندیشہ میں رہنا ضروری ہے کہ غلطی کرنے پر برطرف کر دیئے جائیں گے۔

ملک اور اس کی حکومت کو جائداد اور اس کے انتظام سے بس یونہی سی تشبیہ دیجا سکتی ہے۔ ورنہ درحقیقت مطلق العنانی کے نقصانات جس قدر اول الذکر میں ہیں، آخر الذکر میں ان کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ اس میں غیر کا اختیار صرف مال پر ہوتا ہے۔ اس میں جان، مال آبرو سبھی پر۔ اُس میں آدمی کی آزادی قائم رہتی ہے، اس میں یہ نعمت بے بہا بھی اس سے چھن جاتی ہے۔ وہ نہ تو ہر اس بات کو جس پر اس کا عقیدہ ہو، کہہ سکتا ہے نہ کر سکتا ہے۔ غلاموں کی طرح حاکم کی چشم و ابرو کے اشاروں پر چلتا اور اسی کی مرضی اور اسی کے مفاد کو دین و ایمان بنانے پر مجبور رہتا ہے۔ علاوہ برایں ترقی کے اس دور میں حکومت کا کام ایسا پیچیدہ ہو گیا ہے، اور ایسے مشکل مسائل اس میں پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ اس کے چلانے کے لئے جمہور کی امداد اور شرکت عمل ضروری ہے۔

یہ خیال غلط ہے کہ جمہوری اصول پر عمل ہونے سے حکومت نااہل آدمیوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ ناسمجھی سے ہر کام بگڑ جاتا ہے۔ لیکن جہاں سمجھ بوجھ کر جمہوری حکومتیں قائم کی گئیں کہیں نااہلوں کا راج نہیں ہوا۔ مساوات اور آزادی کے یہ معنی ہیں کہ سماج کے تمام افراد قانون کی نگاہ میں برابر ہوں۔ اور ہر ایک کو حکومت، دوسرے زندگی کے دوسرے معاملات میں حصہ لینے کی پوری آزادی ہو۔ جب تک کہ اس سے کسی کو آزار نہ پہونچے۔ لیکن جب تک سبھی آدمی کی صلاحیت میں فرق ہے ایک کا سردار دوسرے کا پیرو ہونا قدرتی بات ہے۔ اسی لئے حکومت جمہوری ملکوں میں اسی کے ہاتھ میں جاتی ہے، جو سرداری کے قابل ہوتا ہے۔ بلکہ وہاں جبر اور ظلم وغیرہ سے کام نہیں چلتا۔ سرداری کے ہر خواہشمند کو جمہور کے سامنے اپنی قابلیت کا امتحان دینا پڑتا ہے۔ دل و دماغ کی خوبی جسے ہر دل عزیز بناتی ہے اسی کو سرداری بھی ملتی ہے۔ جمہوریت نااہلوں کی حکومت نہیں، اہل انسانوں کی تلاش کا عظیم الشان ادارہ ہے۔

بلاشبہ انسان خاطی ہے، اور جمہور کے لئے یہ ممکن ہے کہ سردار کے انتخاب یا اس کے افعال کی تائید میں غلطی کریں۔ لیکن ان کے لئے تجربہ سے سبق حاصل کرکے تلافی [illegible]

کھلا رہتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو نظام جمہوریت کے سوا کسی نظام حکومت میں نہیں ہے۔ جمہوری حکومت کے پیش نظر صرف جمہور کی خوشی اور رائے کی مرضی ہوتی ہے۔ کسی فرد واحد، یا محدود جماعت کے بے جا اغراض حکومت کو مفید عام اصلاحوں کے عمل میں لانے سے باز نہیں رکھ سکتے ۔

جمہوریت کا اصول صدیوں کے سیاسی تجربہ اور بڑے بڑے انقلابوں کے بعد وجود میں آیا ہے۔ شاید ہی کسی ایک اصول کی خاطر اس قدر جانیں تلف ہوئی ہوں۔ جمہوریت کے لئے جن قوموں نے خون بہائے اور مصائب برداشت کئے دنیا ان کے احسان سے کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ انھیں کی جرارت اور مستقل مزاجی نے اس کی بنا مستحکم کر دی۔ اور یہ نہ صرف مغرب بلکہ ساری دنیا کے لئے نجات کا پیام ثابت ہو ۔

اہل فرانس دنیا کی ان محسن قوموں میں خاص امتیاز رکھتے ہیں جنھوں نے اصول جمہوریت کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں کیں۔ اس لئے کہ ان کا انقلاب دنیا میں ذہنی اور عملی اعتبار سے سب سے بڑھ کر جمہوریت کا محرک ہوا۔ انقلاب فرانس جمہوریت کے لئے دور جدید کی پہلی کوشش نہیں تھی۔ اس سے پہلے انگلستان میں پارلیمنٹ کی آئینی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اور امریکہ نے بھی بزور شمشیر انگریزوں کے قبضے سے آزاد ہو کر جمہوری حکومت کی بنا ڈال لی تھی۔ لیکن اگر انگلستان اور امریکہ نے جمہوریت کے کامیاب عملی نمونے پیش کئے تو فرانس نے اسی استبداد کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی دنیا کے سامنے ایک پرمسرت پیام امید اور ایک ولولہ انگیز تخیل کی صورت میں پیش کر کے ہر چہار طرف آزادی کی زبردست امنگ پیدا کر دی۔ اور گرد و پیش کے اکثر ممالک نے تھوڑے ہی عرصہ میں مطلق العنان حکومتوں کو توڑ کر جمہوری حکومتیں قائم کر لیں۔ شاید ہی کسی واقعہ نے زندگی کے قدیم اداروں پر ایسی کاری ضرب لگائی ہو جیسی انقلاب فرانس نے ۔

اس زمانے میں جبکہ حریت و جمہوریت کے وہ دلفریب تخیلات ہم تک پہونچ گئے ہیں

فرانس نے عالمگیر بنا دیا ہے، اس کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنا ہمارا فرض ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ بنی نوع انسان پر احسان کرنے والی اس بہادر قوم کے کارنامہ کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دینا ہمارے لئے اظہار ممنونیت کا ایک طریقہ ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ امنگ اور کشمکش کے اس دور میں اہل فرانس کی دشواریوں اور ناکامیوں، کوششوں اور کامیابیوں سے ہم بہت کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں ۔

ملوکیت اور ملوک وقتی اسباب اور فوری جوش انقلاب میں معین ہو سکتے ہیں لیکن اصل وجہ نہیں ہو سکتے۔ سماج کو پرانے نظاموں کے خلاف دیوانہ وار تلوار اٹھا لینے پر جو شئے مجبور کرتی ہے وہ قرنہا قرن سے قائم رہنے والے مصائب ہیں، جن کے دور کرنے کی تمام مصلحانہ کوششیں ناکام ہو چکتی ہیں ۔

جو مستبد نظام صدیوں سے اہل فرانس کے مصائب کا باعث تھا۔ اس کی بنا ایک فلسفہ ایک مذہب پر تھی جو بگڑ گیا تھا۔ اکثر ظلم بگڑے ہوئے مذہب سے پیدا ہوتا ہے ۔

وہ مذہب جس نے فرانس (بلکہ دنیا کے اکثر ممالک) میں استبداد کو پناہ دی، سکھاتا ہے کہ عامۃ الناس جن کی سرشت بد ہے اپنی ہدایت کے لئے حاکم کے محتاج ہیں۔ حاکم خدا کے خاص بندوں میں سے ہوتا ہے۔ اس کی فرماں برداری خدا کی فرماں برداری ہے، اس سے سرکشی خدا سے سرکشی ہے۔ اگر عامۃ الناس اپنی دینی و دنیاوی فلاح چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ حاکم وقت کی بے چون و چرا اطاعت کریں ۔

ایک عرصہ تک یہ اطاعت سہ گانہ تھی۔ اہل کلیسا، امراء اور بادشاہ تینوں اپنے آپ کو حکومت کا مستحق سمجھتے تھے۔ لیکن ملک میں بیک وقت تین کیا دو حاکم بھی نہیں رہ سکتے کچھ عرصہ بعد ان تینوں حاکموں میں حکومت کے لئے کشمکش شروع ہو گئی۔ ملک کی ضروریات بادشاہ کے موافق تھیں اور بالآخر وہ مالک کل بن گیا ۔

ملوکیت اپنے معراج کمال کو سترھویں صدی میں پہونچی۔ جب کہ کلیسا اور طبقۂ امراء

کی سیاسی اہمیت بالکل ختم ہوگئی۔ کلیسا کا مذہبی و سماجی اقتدار اس کے بعد بھی باقی رہا کیونکہ اس کے ذمہ بہت سے غیر سیاسی فرائض تھے۔ لیکن امرا جن کے اختیارات و فرائض سیاسی تھے، اور بادشاہ کی مطلق العنانی میں مخل ہونے کی وجہ سے چھین لئے گئے تھے، بالکل ہی بے اثر ہو گئے۔ البتہ ان کے مالی و سماجی حقوق کا بارگراں عامۃ الناس کے کاندھوں پر قائم رہا۔

کلیسا اور امارت کے سیاسی زوال کا ایک اور باعث بھی تھا۔ وہ دل شکن مایوسی جو عام رعیت کو پادریوں اور امیروں سے ہوتی ہے۔ اُنھوں نے مدتوں اِن کو اپنا پیشوا، آقا، سب کچھ بنائے رکھا۔ انھیں کی محبت کو مذہب جانا، انھیں کی اطاعت میں نجات سمجھی، سدا بچوں کی طرح ان کی پدرانہ شفقت پر اعتماد کیے، ان کے تعلق پر فخر کرتے اور سمجھتے کہ ان کی امداد اور دستگیری زندگی کی تمام مشکلیں حل کر دے گی۔ "مجھے اس نامی خانقاہ کی غلامی کا فخر حاصل ہے۔ مجھے کوئی حاجت نہیں ستا سکتی۔" یا "میں غریب آدمی ہوں میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ مگر وہ جو سامنے نفیس حویلی ہے میں اس کی رعیت ہوں" یہ تھے ان کے جذبات۔ لیکن خدا کے "خاص" بندوں نے ان جذبات کا صلہ بُرا دیا۔ وہ فقط اپنے حقوق کا خیال رکھنے لگے، فرائض سے غافل ہو گئے۔ لیتے، مگر دینا بھول گئے "خانقاہ" کا دروازہ حاجتمندوں کے لئے بند رہنے لگا۔ "حویلی" کا مہمان خانہ میزبانوں سے خالی۔ پادریوں نے عیش و طرب میں وقت گذارنا شروع کیا۔ اور امرا نے دربار کی پرتکلف صحبتوں میں۔ غریبوں کی خبر گیری کے لئے فقط محصل رہے یا قرق امین۔

اس تلخ تجربہ نے عوام کو کلیسا اور امارت سے بددل ضرور بنا دیا تھا۔ مگر یہ ادارے جس نظریہ حکومت پر مبنی تھے اس سے برگشتہ نہ کیا۔ عرصہ دراز تک وفاداری اور محبت ان کا سیاسی تخیل رہا تھا۔ عاجزی، تحمل، رضا و تسلیم ان کا شیوہ۔ وہ اپنی مدد آپ نہ کر سکتے تھے اور عادی تھے کہ اپنے دکھ درماں کسی بالاتر ہستی سے طلب کریں۔ پس وہ اداروں سے بدظن

ہونے کے بعد ان وا ماندگان شوق نے تیسرے میں اپنے لئے پناہ تلاش کی ۔

منکران سیاسی ازمنہ وسطیٰ کے اختتام سے ہی اس کام میں لگے تھے، لیکن لوئی چہاردہم کے عہد میں ہوئی۔ تیرھویں صدی میں بادشاہ "ولی" تھا۔ سولھویں میں "مجاہد" ہوا۔ ہنری چہارم "خوب" کہلایا۔ لوئی چہاردہم "خدا" ۔

نئی امید اور نئی عقیدت کے ساتھ اس نے "خدا" کی پرستش شروع ہوئی۔ پادری تک اس کے آگے جھکنے لگے۔ "بادشاہو۔ اپنے اختیارات بے دھڑک استعمال کرو۔ یہ منجانب اللہ ہیں۔ تم دیوتا ہو" ایسے کلموں سے پادری نے سیاسی عقیدہ کی بنیادیں مستحکم کرتے تھے ۔

رعایا نے بادشاہ کو اپنی تمام امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بنالیا اور اسے اپنا ملجا و ماویٰ سمجھتے، بیکسوں کی فریاد سننے والا، مظلوموں کی داد کو پہونچنے والا اس سے بڑھ کر محبوب کوئی نہ تھا۔ "ظالم ڈرو، دیکھتے نہیں خدا ہمارا طرف دار ہے" "سخت گیر نوابوں سے وہ اب یوں خطاب کر سکتے تھے۔ ایک کاشتکار کسی امیر سے باتیں کرتے وقت ٹوپی اتارنا بھول گیا امیر نے اس کی ٹوپی اتار پھینکی۔ "اگر آپ اسے اٹھا نہ دیں گے" کسان بولا "تو یاد رکھئے دربار کے دن قریب آرہے ہیں ....." امیر لرز گیا اور ٹوپی اٹھادی ۔

مگر پرستش نے لوئی چہاردہم کو متکبر بنادیا۔ اس نے سمجھا کہ وہ فی الواقع خدا ہے۔ اگرچہ خدا کے معنے سے واقف نہ ہوا۔ خدائی نام ہے بندہ پروری کا۔ لیکن اس نے اسے خود بینی جانا۔ میں سب کچھ ہوں اور سب کچھ میرے لئے ہے۔ یہ تھی اس کی ذہنیت۔ "سلطنت ؟ — یہ میں ہوں" اور فی الواقع اپنی انانیت پر اس نے سلطنت کا مفاد قربان کر ہی دیا[1]۔ البتہ چند مخصوص، لوگ اس کے الطاف سے مستفید ہوئے۔ یوں "تخصیص" کی لعنت ایک دوسری شکل میں قایم رہی۔ "خاصان خدا" (اہل کلب و امرار) اپنے منصب سے کچھ

---

[1] لوئی چہاردہم نے اپنی شان بڑھانے کے لئے جنگوں اور دوسرے کاموں میں بیدریغ روپیہ صرف کیا جس سے خاصہ الناس، جن پر ان مصارف کا زیادہ تر بار تھا۔ بالکل قلاش ہوگئے اور حکومت کی مالی حالت نقطۂ انتہا تک پہونچ گئی

ہٹائے گئے تو ان کی جگہ مغاصبان شاہ" نے لے لی جن میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ اور یہی اس داستان کا سب سے نرالا پہلو ہے۔ فرانس میں ادارۂ ملوکیت عورت کے سبب ناکام رہا ۔

ایسی امید، عقیدت مندی اور محبت اور اس کی ایسی پائمالی! لیکن یہ بدنصیبی تنہا فرانس کی نہ تھی۔ دنیا میں ہر جگہ یہی ہوا اور ہو رہا ہے ۔

رعیت بایں ہمہ ناامید نہ ہوئی۔ محبت نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ یہ تھی اس کی معذوری۔ اور جب لوئی چہار دہم کا انتقال ہوا تو اس کے جانشین لوئی پانزدہم سے اپنی ساری توقعات وابستہ کر لیں ۔

لوئی (۱۵) کی عمر صرف پانچ سال کی تھی۔ جب وہ تخت کا وارث ہوا کیسی کیسی آرزوئیں اور تمنائیں رعایا نے اس ننھی سی جان سے لگا رکھی تھیں۔ کیسے کیسے انتظام و اہتمام سے اس کی تعلیم شروع کی گئی اور کن کن مشکلوں سے اس کے سن رشد تک پہونچنے کا انتظار کیا جانے لگا! لوئی (۱۴) کا پوتا اور اس کی نسل کا تنہا یادگار، اس کی سلامتی کے لئے ہر ایک دست بدعا تھا کہ بڑا ہو کر وہ سب کی بہبود کا ضامن بنے ۔

خدا خدا کر کے وہ دن آیا جب اہل فرانس کی مراد بر آئی اور لوئی (۱۵) عنان گیر حکومت ہوا۔ رعایا سے اس نے "چہیتا" کا لقب پایا۔ اور فی الواقع وہ نہایت ہر دل عزیز تھا۔ ایک بار رات کو خبر پھیلی کہ لوئی (۱۵) بیمار ہو گیا۔ لوگ اٹھ اٹھ کر بے تماشہ گھروں سے باہر نکل آئے۔ آدھی رات کو تمام گرجاؤں کے دروازے کھل گئے۔ لوگ چوراہوں پر ایک دوسرے کو پکڑ پکڑ کر استفسار حال کرتے۔ بہت سے گرجاؤں میں بادشاہ کی صحت و سلامتی کی دعا مانگنے والے پادریوں کی سسکیوں سے گھنٹوں کی آواز نہ سنائی دیتی اور حاضرین بھی ساتھ ساتھ روتے جاتے۔ جو قاصد اس کی صحت کا پیام لایا، اتنا گلے لگایا گیا کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ لوگ اس کے گھوڑے کو چومتے اور فاتحانہ جوش سے اس کے آگے آگے چلتے ہر گلی کوچہ سے ایک ہی پر مسرت صدا بلند ہوتی۔

"ما یہ ہے ہمارا بادشاہ" (شفا مایوس)

یہ واقعہ ۱۷۴۳ء کا ہے۔ دس برس بعد وہی "چیچک" بدنام ہے کہ وہ آدمی کے خون سے نسل کرتا ہے۔ تاکہ اپنے بدن میں، جو بہ سبب عیاشی کمزور ہوتا جارہا ہے، از سر نو قوت پیدا کرے اس پر ایک بار بلوہ بھی ہو چکا ہے۔ جس کے بعد سے لوئی (۱۵) نے پیرس میں رہنا چھوڑ دیا۔ وہ لوگوں کا سامنا کرنے سے ڈرنے لگا۔

اور یہ تھا انجام اس ملک کا جس نے حاکم کے اختیارات کے لئے مابعد الطبیعاتی دلائل پیش کئے تھے اور خطا کار انسان کو خدا کا غیر مسئول نائب قرار دے کر ملک کی قسمت ان کے ہاتھ میں دیدی تھی کہ جس طرح چاہیں بنائیں اور جس طرح چاہیں بگاڑیں۔

خدا کا نائب لوئی (۱۵) اپنے پیش رووں سے بھی زیادہ اپنے منصب کی عظمت کو قائم و دائم رکھنے میں ناکام رہا اور نہ خدا کا ہوا، نہ رعایا کا۔ اسے عورتوں نے موہ لیا تھا۔ بس وہ انھیں کا ہو کر رہ گیا۔

اس دیوتا کی جگہ، اس کے طویل دور حکومت میں بیشتر "دیویاں" حکمراں تھیں۔ دیوتا اپنے منصب سے دست بردار ہو گیا تھا۔ ملک، رعایا، پیرس، اس کو ان سب سے نفرت ہو گئی تھی۔ ورسیلز[۱] کے محل میں بھی ضرورت سے زیادہ آبادی، ضرورت سے زیادہ روشنی تھی۔ عورتوں کا یہ پجاری، کوئی تنہا مقام، کوئی تاریک خلوت چاہتا تھا جو اس کی سیہ کاریوں کو چھپالے۔

جب وہ مرا تو خزانہ قرضوں سے گراں بار تھا۔ طبقہ عوام افلاس سے تنگ حال اور ملوکیت کا قصر ایک فلسفہ کی ضربوں سے متزلزل۔

"میرے بعد غرقی"[۲]! خود غرض بادشاہ جس سیلاب بلا کو تیری کم بین نگاہیں بھی آتا ہوا دیکھ رہی تھیں

---

[۱] لوئی چہاردہم نے قدیم دار السلطنت پیرس کو چھوڑ کر پیرس سے بارہ میل کے فاصلہ پر نیا دار السلطنت بنایا تھا۔ اس کا نام ورسیلز تھا۔ یہاں شاہی محل اور دوسری عمارتوں کے بنانے میں روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا تھا جس سے خزانہ بالکل خالی ہو گیا ہو گیا تھا۔

[۲] لوئی (۱۵) کا مشورہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ افلاس اور بدنظمی کا انجام کیا ہوگا مگر کچھ کرتا نہ تھا

وہ تیرے بعد تیری ہی اولاد کے گھر گیا ۔

نیا مذہب

مطلق العنانی اور بے چون وچرا اطاعت کا پرانا مذہب جب ایسی کوئی حکومت نہ دے سکا جو محکوم کی خوشی کی ضمانت کر سکتی تو وہ کسی دوسرے مذہب کی تلاش میں چل نکلے ۔

فرانس میں اب ایک نہایت ہی سخت ذہنی بے چینی کا دور شروع ہوا[1]۔ رفتہ رفتہ زندگی کا ہر اصول، ملک کا ہر ادارہ، مایوسی، شک، اور اعتراض کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ پرانی باتوں سے لوگوں کا اعتقاد اٹھتا جاتا، اور مذہب سے جو افیں حق بجانب ٹھہراتا تھا بے اطمینانی بڑھتی جاتی۔

اسی زمانے میں والیٹر، روسو اور دوسرے جلیل القدر فلسفی ادیب پیدا ہوئے۔ جن کی غیر فانی تحریروں میں اٹھارھویں صدی سے لیکر آج تک کی تمام سیاسی و اجتماعی تحریکوں کے بیج ملتے ہیں۔

انھوں نے وہ شئے پائی، جس کی تلاش میں سرگرداں تھے ——— وہ سیاسی مذہب جو سب کی خوشی کا ضامن بن سکے، اس کا نام جمہوریت ہے ۔

یہ مذہب انسان کو قعر مذلت سے نکال کر ارفع ترین مقام عطا کرتا ہے۔ کیونکہ قدیم عقیدہ کے برخلاف، جو انسان کو فطرتاً بد قرار دیتا ہے، یہ مذہب سکھاتا ہے کہ انسان کی سرشت نیک ہے اپنی فلاح کے لئے نہ اسے اہل کلیسا کی غلامی درکار ہے، نہ امراء کی، نہ بادشاہ کی۔ وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہو سکتا ہے۔ اور اپنی فلاح کے اسباب خود پیدا کر سکتا ہے ۔ یہ عقیدہ کہ خاصان خدا کے سوا باقی لوگ نااہل و ناقابل اعتماد ہیں، ایک من گھڑت ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ تمام لوگ چند آدمیوں کے غلام بنے رہیں۔ فی الحقیقت ان تمام نہاد خاصان خدا اور عام انسانوں میں کوئی فرق نہیں۔ خدا نے سب کو برابر پیدا کیا ہے۔ جمہور کے مصائب کا سبب یہی ہے کہ انھوں نے اپنی عقل پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا ہے اور طرح طرح کے انسانی بت بنا کر ان کی بندگی اختیار کر لی ہے۔ ان کو چاہئے کہ یہ بندگی چھوڑ کر آزادی و مساوات کی فطری حالت پر لوٹ جائیں اور عقل سلیم

---

[1] مطلق لوئی چہاردہم کے عہد سے پہلے پیدا ہونے لگے تھے ۔

کی رہنمائی میں زندگی بسر کریں ۔

حاکم مذہب جمہوریت میں کوئی فرد واحد یا محدود جماعت نہیں ہے بلکہ تمام جمہور ہیں قانون ان کی رضا کا نام ہے۔ بادشاہ اور دوسرے عمال حکومت محض ان کی رضا کی تعمیل کے لئے ہیں ۔ اختیار حاکمانہ نہیں رکھتے۔ اور اسی وقت تک اپنے عہدوں پر قائم رہ سکتے ہیں جب تک اپنے فرائض جمہور کی مرضی کے مطابق انجام دیتے رہیں ۔

یہ دل فریب خیال، یہ پرمسرت پیغام نجات، فلسفی ادیبوں کے سحر کار قلموں نے کچھ ایسے لبھا لینے والے انداز میں پیش کیا کہ آناً فاناً تمام اہل فرانس معتقد بن گئے۔ انھیں یہ کوئی نئی شئے معلوم ہی نہیں ہوئی جس کے سمجھنے اور ماننے کے لئے کوشش کی ضرورت ہو۔ انھیں تو ایسا معلوم ہوا گویا یہ انہی کے جی کی بات تھی۔ گویا فلسفی اسی خیال کے ترجمان ہے جو ہر ایک کے دل کے نہاں خانوں میں مستور تھا، اور اظہار کے لئے بیتاب ۔

جس گرم جوشی سے اس نئے مذہب کا استقبال ہوا، اسی سرعت کے ساتھ اس نے اپنا اثر دکھایا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں خاص و عام ہر ایک کی ذہنیت میں انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ اپنے آپ کو بدسرشت سمجھنے والے نیک سرشت ہونے کے مدعی بن گئے۔ تقلید، اطاعت، اور غلامی کے خوگر تنقید، حکومت اور آزادی کے طالب نظر آنے لگے۔ دوسروں کا سہارا ڈھونڈھنے والے خودداری و خود اعتمادی سیکھ گئے۔ یاس کی جگہ امید، اور حاضر کی تاریکی میں ایک درخشاں مستقبل کی روشنی نظر آنے لگی ۔

یہ تبدیلی قربانیوں اور تکلیفوں کے بغیر عمل میں نہیں آئی۔ دنیا کو حق و صداقت کا پیغام دینے والے عجب قسمت لے کر آتے ہیں۔ جس طرح ان کی کامیابی یقینی ہوتی ہے اسی طرح مصائب بھی ان کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ہر ایک صلیب پر لٹکایا جاتا ہے۔ فرانس کے حریت پسند فلسفی برابر کلیسا اور حکومت کے مظالم کا شکار رہے ۔

ان کی تحریریں ان کی مادی بے بسی، مظلومی کی سب سے بڑی آئینہ دار ہیں۔ تیغ و تفنگ

کا مقابلہ صرف قلم سے کرنے والے، اس عرصہ جنگ میں، جسے تحریر کہتے ہیں، کس طرح بچتے، ہنستے، اور بڑھتے ہیں۔ کس طرح دشمنوں کے درمیان پہونچ کر ہنستے ہنساتے اور گاتے ہیں! ان کی ہنسی اور ان کا گیت ہی ان کا حربہ ہے۔ یہ ظالموں کو مارتا نہیں، مسخر کر کے نجات کے راستہ پر لگا دیتا ہے۔

بنی نوع انسان کے مظلوم محسنو، تم نے انسان کا کھویا ہوا حق واپس دلا کر نئی زندگی بخشی، تم بھی زندگی جاوید کے مستحق ہو۔ دنیا میں تمہارا مادی وجود نہیں ہے، مگر تمہاری روح کا نور جو تمہاری بے مثل تصانیف کی قندیلوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا ہے، برابر اپنا فیض پہونچا رہا ہے گا استبداد کی ظلمت کو اب پیغام شکست مل چکا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب توہم، جہالت اور جبر کے تاریک پردوں سے چھن چھن کر یہ نور سارے عالم کو منور کر دے گا۔

فرانس میں جہاں تم نے سب سے پہلی روحانی فتح حاصل کی سب کچھ تمہارے ہی مساعی کا ثمرہ تھا۔ انقلاب کی کامیابی کا سہرا تنہا تمہارے ہی سر ہے۔ اگرچہ تم لڑائی کے وقت موجود نہ تھے، لیکن استبداد کو غیر مسلح کر کے تم نے مدتوں پہلے ہی سے اس کی شکست کا انتظام کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس عملی جنگ کے وقت وہی حربہ نہ تھا جو کامیابی کے لئے سب سے ضروری چیز ہے۔ یعنی ایمان۔

ہاں، تم نے استبداد سے ایمان کو چھین لیا تھا۔ اسے اپنی بھائی پر شبہ تھا اور اپنے وجود سے عار اور جب شکست نے اسے موت کی خبر دی تو وہ، اس سے پہلے کہ موت کا کرب شروع ہوتا مسرور تھا۔

خاکسارانِ جہان

دیہاتی زندگی کا ایک دلچسپ پہلو

سری نکتن۔ بنگال۔

بھائی لال چند، تو ہم نے تمہارا شہر دہلی بھی دیکھ لیا۔ اور جو گاؤں قصبے تمہیں اس قدر یاد آتے تھے انہیں بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دہلی کے متعلق تو کیا لکھ سکتا ہوں مگر آپ کے گاؤں قصبوں کا بھی کیا کہنا! مجھے تو حیرت ہے کہ تمہیں امریکہ جیسے پاک وصاف ملک میں یہ گرد آلود غلیظ مقامات کیسے یاد آتے تھے۔ اور چشم بد دور جناب ان کی تعریف بھی فرمایا کرتے تھے!۔۔۔ جانتا ہوں کہ تم کیا کہو گے!۔۔۔ "میں ان کی صفائی کی تھوڑے ہی تعریف کرتا تھا۔ امریکن لوگوں کی ہر کام میں بے فائدہ عجلت اور کم فرصتی دیکھ کر مجھے ان ہندوستان کے گاؤں قصبوں کی آہستہ خرامی یاد آتی تھی۔ ان کے باشندوں کی معمولی معمولی ضروریات، میٹھی میٹھی اور شاذ و نادر ہنسی، سخت سے سخت مصیبتوں میں ان کی بردباری اور باوجود اَن پڑھ ہونے کے ان لوگوں کی سنجیدگی۔ ان سب چیزوں کا جب خیال آتا تھا تو حُبِ وطن جوش کھاتی تھی اور فوری ہندوستان واپس آنے کو دل چاہتا تھا"۔۔۔۔۔۔ خیر، تم کچھ بھی بہانے بناؤ۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے یہ دیہاتی زندگی دیکھ لی۔ اور بقول ہمارے ایک حیدرآبادی شاعر کے

"بس تم کو بھی دیکھا اے دولہ بشیرو"

اچھا سنو، یہ ہمارا تجربہ تمہارے لئے بھی دلچسپ ضرور ہوگا۔ لیکن یاد رکھنا۔ قصہ سن کر یہ نہ کہنا کہ آخر ہم بھی تو یہی کہتے تھے۔ نہیں بھائی صاحب یہ معلومات تو خاص ہمارے تجسس یا کہئے ریسرچ Research سے معلوم ہوئی ہیں۔ اس سے پہلے بھلا کون ان سے واقف تھا۔

دہلی میں اس وقت تم تو تھے نہیں اور تمہارے ہی کہنے سے ہمیں بڑی خواہش تھی کہ جامعہ ملیہ کے نصاب تعلیم اور طرز معاشرت کو جانچ کر دیکھنے کا کبھی موقع ملے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ ہم کیسے خدائی فوج دار ہیں۔ ریل سے اترے ہی تھے کہ سامان بچھونا لئے قرول باغ پہونچے۔ اور جب پوچھا کہ کون ہو، کیسے آئے تو صاف صاف بتلا دیا کہ ایک دو روز کے لئے قیام کرنے آئے ہیں۔ چونکہ بقول تمہارے ہم شریف نہیں تو کم از کم شریف نما ضرور ہیں توقع تھی کہ کشادہ پیشانی سے ہاتھوں ہاتھ لئے جائیں گے اور ہوا بھی ایسا ہی۔ جب تک رہے مولوی شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب کے مہمان رہے۔ انہیں تو تکلیف تھوڑی بہت ضرور ہوئی ہوگی۔ لیکن ہماری تو یار بڑے مزے سے گذری جامعہ میں کیا کیا دیکھا، بیان کرتا۔ مگر تم تو ان سب چیزوں سے واقف ہی ہو اور بارہا تم نے ان کی تعریف بھی کی ہے۔ اس لئے جامعہ کے حالات کو چھوڑ کر تمہارے پیارے گاؤں کھیڑوں میں جو کچھ دیکھا وہ بیان کرتا ہوں۔

ہاں اور ایک بات یاد آئی جو تمہیداً لکھنا ہی پڑے گی ورنہ تمہاری سمجھ میں نہ آئے گا کہ ہم نے کس موقعہ پر اور کس نظر سے ان مقامات مقدس کی زیارت کی۔ دہلی میں ایک وظیفہ یاب کرنل صاحب ہیں جو عقیدتاً ہندوستانی گاؤں کی ہر طرح امداد کرنے کا بیڑہ اٹھا چکے ہیں۔ آدمی بڑے ہی نیک دل ہیں اور نہایت ہی اچھی طبیعت پائی ہے۔ آج کل ان کا مشغلہ یہی ہے کہ ہر دوسرے تیسرے روز کسی گاؤں کو چلے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ اور اگر کسی طرح سے ان کی مدد کر سکتے ہیں تو دریغ نہیں کرتے۔ کبھی میجک لانٹرن (MAGIC LANTERN) کی تصویریں دکھلا دیں، کبھی مشین کے ذریعہ مکھن بنانے کا عمدہ طریقہ بتلا دیا۔ غرض حرکت میں برکت کا مصداق ہے۔ گھریلو صنعتیں مروج کرنا، انجمن ہائے اتحادی کا قائم کرنا، تعلیم کے لئے سہولتیں بہم پہونچانا، حفظان صحت کے طریق دکھلانا، گویا ترقی دیہات کے جملہ امور میں کرنل صاحب کوشاں ہیں۔ گھر میں بھی بیٹھے رہتے ہیں تب بھی بندۂ خدا کو چین نہیں آتا بلکہ فکر رہتی ہے۔ کہ ہندوستان کے دور دور کے ممالک ترقی دیہات کے لئے کیا کر رہے ہیں۔ [illegible]

میں ان کے پہچاننے والے موجود ہیں جو اس قسم کی خبریں انھیں پہونچاتے رہتے ہیں ۔
سب تو سب ان کرنل صاحب کو خدا نے ایک "لفٹننٹ" بھی عطا فرمایا ہے۔ مسٹر پرتھی سنگھ۔ خدا ان کا بھلا کرے۔ ہندوستانی آدمی ہیں، نوجوان و خوش رو ہیں۔ فوج میں تو نہیں لیکن فوج کے قابل ضرور ہیں۔ غرض سب کچھ بھلائیاں ان میں موجود ہیں۔ لیکن خدا بہتر جانتا ہے جناب بھی اسی خبط میں مبتلا ہیں جس میں کرنل صاحب محو ہیں۔ پیسہ۔ عزت۔ آبرو۔ ایک پڑھے لکھے آدمی کو دہلی جیسے شہر میں کیا حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ گاؤں والوں کی خاطر دوسری سول لینے سے بھلا کیا فائدہ ؟

غرض انھیں دو اصحاب کے ساتھ ہمارا جانا ہوا۔ ارے ہاں، تم تو ان کو جانتے ہی ہو ہمارے میزبان و مہربان مولانا قدوائی صاحب نے بھی میرے کہنے پر جانا قبول فرمایا۔ اور سہ پہر کے وقت کرنل صاحب کی فورڈ میں یہ قافلہ جامعہ ملیہ سے گاؤں کی طرف روانہ ہوا ۔

خدا جانے اس مقام کا نام کیا ہے، مگر بھائی جس جگہ سے رائسینہ ایک طرف اور پرانی دہلی دوسری طرف دکھائی دیتی ہے۔ وہ بھی عجیب مقام ہے۔ تمھیں تو دیکھتے دیکھتے عادت ہو گئی ہوگی لیکن میں تو وارد جب کبھی وہاں پہونچتا تھا بس یقین مانو رد نگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ غرض فاعتبروا یا اولی الابصار کہتے ہوئے یہاں سے اور آگے بڑھے۔ پرانی پرانی گنبدیں نظر آئیں اور غائب ہو گئیں رائسینہ کی مدمغ عمارتیں بھی دیکھتے دیکھتے معدوم ہو گئیں۔ کرنل صاحب کی فورڈ موٹر کیا تھی رخش عمر تھا یا میل زماں۔ دنیا کے کیسے کیسے عارضی نمونے دکھلائے چلی جا رہی تھی۔ گویا بار بار کہہ رہی ہے کہ ؎

سینکڑوں شہر بسائے کئی ویران کئے
شغل رہتا ہے یہی گنبد اخضر کے لئے

مجھے خیال آیا کہ آخر ہمیں لئے کہاں جاتی ہے۔؟ اور ایک سوزش نے دل و دماغ کے کسی کونے میں چھپا ہوا چٹکا لیا جواب ملا اسی بستی میں جو کبھی آباد ہوتی ہے نہ کبھی ویران! کیوں بھائی تم بُرا

تو نہیں مانتے ؟ لیکن سچ پوچھو تو کسی زمانے میں تمہارے گاؤں کچھ بھی ہوں، کیا آج کل ان میں قبروں کے خصوصیات نہیں پائے جاتے ؟

مختصر یہ کہ دس بارہ میل طے کرنے کے بعد موٹر سے اترے۔ قصۂ چہار درویش تو تم نے سنا ہی ہوگا، بس ہماری بھی یہی حالت تھی۔ ملاحظہ تو فرمائیے۔ کرنل صاحب برجس اور سولا ہیٹ دھوپ کی ٹوپی، سفید موزے، پستہ قد اور آنکھیں دھوپ کی عینک سے چھپی ہوئیں۔ مسٹر پتی سنگھ، بانکا شملہ، اچھی اچکن، تنگ پاجامہ اور ولایتی جوتہ۔ قدوائی صاحب، سب میں بڑی خصوصیت ریش مبارک، پھر کھادی کا کرتہ، کھادی کا پاجامہ، کھادی کی ٹوپی، پاؤں میں چپل، کاندھے پر رومال اور ہاتھ میں ڈنڈا۔ اور اخیر میں بابدولت۔ سامان ریل میں چوری گیا تھا۔ بس آپ کے گاؤں میں اس طرح گئے جیسے کوئی برات میں جاتا ہے۔ ریشمی اچکن، سلیم شاہی جوتہ، اور اس پر طرفہ یہ کہ جوتے پر کچھ نقرئی کام بھی! سبحان اللہ !!

سڑک سے دور ہی دور گاؤں دکھائی دیا۔ یہ چہار درویش اسی کی طرف پیدل روانہ ہوئے راستہ کیا تھا ایک پتلا، تنگ، گہرا نالہ تھا جس میں بجائے پانی کے ریت ہی ریت تھا۔ اس کی چوڑائی اتنی کہ مشکل سے ایک بیل گاڑی جا سکے۔ دونوں طرف پانچ چھ انچ کی اونچائی۔ اس خندق سے بیزار ہو کر باہر آئے۔ کھیت ہی کھیت، یہاں بوٹ ہے، وہاں گیہوں، اسکی کٹائی ہو چکی ہے تو وہ ابھی استادہ ہے۔ ایک کھیت میں دیکھئے تو فصل ہری بھری، دوسرے پر نظر ڈالئے تو ٹکڑے کے ٹکڑے مرجھائے ہوئے۔ تھوڑی دور گئے کہ ایک مرد، دو عورتیں ایک بیل کی جوڑی کے ساتھ آتے نظر آئے۔ پورے گاؤں والوں کی چال، رفتار میں پھرتی نہیں۔ صورت میں بشاشت نہیں۔ کرنل صاحب کو دیکھکر مرد نے بیلوں کو ایک طرف کیا۔ عورتوں نے اپنے گھونگھٹوں سے کچھ بیگانہ وار نظریں ڈالیں اور آگے بڑھ گئیں۔ دور سے گاؤں نہایت مستحکم دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ کسی قدر اونچے مقام پر واقع ہوا تھا۔ اور متعدد مکانات پختہ اور اینٹ کے بھی تھے۔ ابھی ہم قریب پہونچے بھی نہ تھے کہ ایک چاند کے ابتدا

کے قریب ایک نہایت خوشنما منظر دکھائی دیا۔ پانچ سات مورنیاں تھیں اور ایک دو مور، سب آپس میں کھیل رہے تھے۔ ایک ہمیں دیکھ کر زمین سے ایسے اٹھا جیسے ہوائی جہاز اٹھتا ہے۔ غرض ہم اس منظر کو دیکھ کر آپ ہی آپ مسکرا رہے تھے کہ خوں خوں، چیں چیں کرتے ہوئے ایک بد جانور اور پانچ چار چھوٹے چھوٹے بدکردار ہماری طرف دوڑتے نظر آئے۔ قدوائی صاحب نے ناک چڑھائی۔ مجھے غصہ آیا۔ کہ لاحول ولا قوۃ، ایک اچھا منظر دیکھتے وقت ہی ان کمبختوں کو مخل ہونا تھا۔ غرض جب یہ سامنے سے گذر گئے اور تھوڑے فاصلہ پر کچھ غلاظت پڑی تھی۔ اسے نوش جاں فرمانے لگے تب خیال آیا کہ اگر یہ نہ ہوتے تو خدا جانے یہ غلاظت کیسے صاف ہوتی!

اور آگے بڑھے ایک بوسیدہ عمارت میں سے ایک ضعیف آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ پرتھی سنگھ صاحب نے دریافت کیا "رائے صاحب کا مکان کس طرف ہے؟" بوڑھے نے جھک کر کرنل صاحب کو سلام کیا۔ پھر کچھ سٹپٹایا ہوا سا جواب دیا کہ "ہاں یونئی یونئی چنڑے (چلے) جانا۔ شاید چوپڑ کھیلتے بیٹھیں ہوں گے؟" میں نے اپنے دل میں کہا۔ دہلی سے اس قدر قریب ہوا تو کیا آخر گاؤں والا ہی ہے نا! خیر۔ اور آگے بڑھے۔ گلی میں سے ایک چھوٹے سے مقام میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ایک چھوٹی سی محفل نظر آئی۔ ان میں سے ایک صاحب نے ہمیں دیکھ لیا اور ان کا کچھ کہنا ہی تھا کہ فوراً محفل درہم برہم ہوگئی۔ تینوں چاروں اشخاص لٹھ کھڑے ہوئے اور کرنل صاحب کی اور ان کے ساتھ ہماری خاطر خواہ تواضع کی۔

اچھا بھائی لال چند یہ تو بتلاؤ کہ تم ایسے لاغر اور دبلے پتلے کیسے ہوگئے ان گاؤں والوں کے قوی تو دیکھ کر دل خوش ہوتا تھا۔ سیدھے سیدھے قد، قوت بھرے بازو، فوجی بانکپن، ان میں سے ایک جنگل کا شیر معلوم ہوتا تھا۔ اور ایک پرانی رواق کے سامنے ایسے بیٹھے تھے گویا شیروں کی محفل ہے۔

جن صاحب سے کرنل صاحب کا تعارف دوسروں سے کیا وہ معلوم ہوتا ہے ایک

ڈپٹی یا سب صوبہ دار میجر صاحب تھے۔ انھوں نے کرنل صاحب کی بہت کچھ تعریف کی اور خود ان سے معافی چاہی کہ ان کی تشریف آوری کا خیال ہی دماغ سے جاتا رہا تھا۔ آدمی نیک طبیعت معلوم ہوتے تھے اور صاف ظاہر تھا کہ جنھیں دنیا میں بڑی بڑی محفلیں کہتے ہیں ان میں بھی یہ شریک رہ چکے ہیں۔ دوسرے صاحب جن سے انھوں نے ہمارا تعارف کرایا وہ رسالے صاحب کا خطاب رکھتے تھے۔ یہ ذرا خاموش سے نظر آئے۔ مگر چہرہ سے تجربہ ٹپک رہا تھا۔ میں نے بات شروع کرنے کے لئے کہا۔ "ہم آپ لوگوں سے ملنے کے لئے دور دور دراز سے آئے ہیں!" بھائی قسم تمھارے سر کی۔ صوبہ دار صاحب نے مجھے ایسا دیکھا جیسے کوئی اپنے دل میں کہتا ہو "یہ آپ ہیں کس باغ کی مولی؟" اور پھر زبان سے انھوں نے نہایت بیباک سے فرمایا "جناب ہم آپ کے نہایت مشکور ہیں۔"

یوں ہی بیٹھے باتیں کرتے رہے کہ ایک کسی قدر سن رسیدہ عورت ایک ٹوکری اپنے سر پر سنبھالے اور دو چھوٹے چھوٹے بچے کرنل صاحب کے اور میرے درمیان سے اس بیباکی سے رواق کے اندر چلے گئے کہ پہلے تو مجھے بھی حیرت ہوئی مگر پھر خیال آیا کہ یہ بھی کسی قدر اچھی حرکت تھی۔ گویا عورت اپنی نسائیت سے پیشمان نہیں اور نہ ہم لوگوں سے خوف زدہ ہے۔ اس عورت کی حرکت صرف سادگی کا ثبوت نہیں دے رہی تھی بلکہ ہم اجنبی لوگوں کو اپنے لوگوں میں دیکھکر مہمان نوازی کا ثبوت دے رہی تھی۔ گویا وہ کہہ رہی ہے کہ "تو ہم تمہارے درمیان سے ایسا ہی گذرتے ہیں جیسا کہ تم ہم ہی میں سے ہو۔"

تھوڑی ہی دیر بعد صوبہ دار میجر صاحب ہمیں اپنے گھر کی طرف لے چلے۔ مکان پختہ اور دو منزلہ تھا۔ اس کے اندر داخل ہونے سے قبل دوسری منزل پر ایک حجرہ نظر آیا۔ صاحب خانہ نے کہا "یہ میری لائبریری ہے" میرے کان تو ہر بات کے سننے کے لئے کھڑے ہی ہوئے تھے اور بھی تیز ہو گئے۔ ماشاء اللہ گاؤں کے باشندے کتب خانے بھی رکھتے ہیں! کرنل صاحب بھی چونک پڑے اور پوچھا "آپ کے یہاں بہت کتابیں ہیں؟" صوبہ دار صاحب کی باچھیں ایسی

کھل گئیں کہ میں بھی مسکرا دیا۔ پھر انھوں نے جواب دیا کہ "نہیں میرے پاس ایک بھی کتاب نہیں۔ ایک کمرہ یوں ہی بن گیا جو باہر سے کتب خانہ جیسا دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے اس کمرہ کو میں اپنی لائبریری کہتا ہوں۔" "سنا آپ نے؟ غرض مکان میں داخل ہوئے۔ ایک وسیع کمرہ میں بہت سی چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہم سب بیٹھ گئے۔ قدوائی صاحب نے صاحب خانہ سے اجازت چاہی اور نماز عصر ادا کی۔ پھر بڑے بڑے گلاسوں میں دودھ پیش کیا گیا۔ ہم سب پیاسے تو تھے ہی خوب مستفید ہوئے۔

میاں لال چند! اب ذرا دل لگا کر پڑھو۔ جو گفتگو اس کمرہ میں ہوئی اس قسم کی گفتگو کونسل ہال میں بھی شاذ و نادر ہی ہوتی ہوگی۔ واقعی سعدی صاحب نے اپنا مشہور و معروف شعر "خاکساران جہاں" کے متعلق ایسے ہی گاؤں والوں کی شان میں کہا ہوگا۔

ہمارے عجیب و غریب قافلہ کے ورود سے لازم تھا کہ ان اصحاب کو تھوڑی بہت کھوج ہو کہ یہاں آنے میں آخر دن کا مطلب کیا ہے؟ کرنل صاحب سے اور پرتھی سنگھ صاحب سے اشارۃً کنایۃً ایک دو سوال کئے گئے، کرنل صاحب نے یہی جواب دیا کہ "ہمارا مقصد اور کچھ نہیں ہم صرف یہ چاہتا ہے کہ آپ لوگوں کو اپنا پیار دکھا دیں۔ اس لئے کہ دنیا میں سب سے بڑا چیز پیار ہے، اس کے بگیر کچھ کام نہیں چل سکے گا۔" بھائی ہم تو سمجھ گئے اور تم بھی سمجھ گئے ہو گے کہ کرنل صاحب انگریزی جملوں کے ترجمے کر رہے تھے اور LOVE ایک ایسا لفظ ہے کہ جس کا ترجمہ کرنا کرنل صاحب کے لئے مشکل ہونا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ رائے صاحب اور ہمارے پرتھی سنگھ کے درمیان بھی کچھ گفتگو ہو رہی تھی۔ رائے صاحب فرما رہے تھے "آپ جو کچھ فرما رہے ہیں بالکل بجا اور درست ہے۔ ہم آپ کی تشریف آوری سے بے حد ممنون ہیں۔ اور آپ کی اظہار ہمدردی کو ہم دل سے قبول کرنا چاہتے ہیں لیکن اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو اتنا بھی ضرور کہیں گے کہ ہم مشکور ضرور ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ مشکوک بھی ہیں۔

بھائی لال چند! ایسے جملہ پر کان نہ کھڑے ہو جائیں تو کیا؟ ہم آئے تھے گاؤں والوں سے ملنے

کے لئے۔ کیا خبر تھی کہ حضرت افلاطون سے ملاقات ہوگی!

مجھسے رہا نہ گیا۔ اپنی چارپائی سے اٹھ کر رائے صاحب اور پرتھی سنگھ کے پاس جا بیٹھا۔ رائے صاحب نے مجھے بھی مخاطب پاکر اپنی گفتگو جاری رکھی۔ "جناب اصل بات یہ ہے کہ ہم دیہاتی لوگ اول سے لٹتے آئے۔ غلام، ہندو اور مسلمان بادشاہوں نے اور ان کی فوجوں نے ہمیں لوٹا۔ چوروں نے، ڈاکوؤں نے ہماری کمائی پر زندگی بسر کی۔ جب برٹش راج کی بدولت امن و امان نصیب ہوا تو دوسری قسم کی لوٹ شروع ہوئی۔ چوکیدار، پٹواری اور خدا جانے کون کون سے دار و مدار ہماری محنت کے نتائج سے متمول ہونے لگے۔ مہاجن نے وقت پر قرض دے کر دُگنا تگنا معاوضہ لے لیا اور پھر ہمارے دوست وکلا نے ہمدردی کرتے کرتے ہم میں سے بہت سوں کو گھر در کا محتاج کر دیا۔ اور ان سب کے علاوہ شہر والے تو ہمیشہ ہم پر ہنستے ہی رہے۔ اور ہمیں بے وقوف ہی سمجھا کئے۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ ہی فرمائیے کہ ہم آپ کی باتوں کو ایک دم کیسے باور کر لیں؟ آپ فرماتے ہیں کہ آپ ہمیں بغیر کسی غرض کے نیک مشورہ دیں گے۔ لیکن ہم حیران ہیں کہ آیا قانون کائنات میں کچھ تبدل واقع ہوا ہے یا پرمیشور کی ہم پر کوئی خاص عنایت ہے، یا آپ بھی ہمیں اچھی اچھی باتیں کر کے کسی نئی مصیبت میں گرفتار کرنے تشریف لائے ہیں"

لال جی۔ سچ تو یہ ہے کہ تم بھی مشکل ہی سے باور کرو گے کہ ایک گاؤں والے نے ایسی پاک و صاف اردو میں ایسے عمدہ خیالات کیسے ادا کئے! تمہارا شک کرنا بھی بجا ہے۔ لیکن بھائی یہ رائے صاحب معمولی گاؤں والے تھوڑے ہی تھے! گنوار پن ان میں صرف اتنا ہی تھا کہ گاؤں میں رہتے تھے۔ ورنہ انھیں تعلیم یافتہ، دنیا دیدہ اشخاص میں تصور کرنا چاہیے۔ بھلا برٹش گورنمنٹ سے انھیں رائے صاحب کا اعزازی خطاب یوں ہی تو ملا نہ تھا۔ اور برٹش گورنمنٹ کے علاوہ خود اس گاؤں میں ان کی کافی قدر و منزلت تھی۔ بقول صوبہ دار میجر صاحب کے "جو کچھ کہتا ہے آپ رائے صاحب سے کہئے۔ ہم سب ان پڑھ گنوار ہیں۔ بہتر اور مناسب یہ ہے" [illegible]

کی ذہانت گاگر دیدہ ہی ہوگیا۔ قسمت نے دنیا کے مختلف حصوں میں گاؤں کھیڑے دکھائے تھے لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ ان کے باشندوں میں سے کوئی میری مادری زبان میں دل کھول کر بات کرے۔ مجھے اس گفتگو میں وہ لطف آرہا تھا کہ شاید ہی یونیورسٹی کے کسی لکچر یا مباحثہ میں آیا ہوگا۔

میں نے کہا۔ آپ کے شکوک بالکل بجا ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس میں ہماری خود غرضی بھی ہے وہ اس طرح سے کہ ہم ہندوستانی ہیں اور ہندوستان کی بہبودی ہماری بہبودی ہے۔ اور ہمیں یقین ہوگیا ہے کہ ہندوستان جب تک نہیں پنپ سکتا جب تک کہ اس کے گاؤں کھیڑوں کی حالت درست نہ ہوجائے۔ بس آپ سمجھئے کہ ہم اپنی ہی غرض لے کر آپ کے در پر حاضر ہوئے ہیں کہ بھائی اب اپنے گاؤں کو درست کیجئے اور آپ کے گاؤں درست ہوئے سے ہندوستان درست ہوگا اور ہندوستان کے درست ہونے سے ہمیں فائدہ ہوگا۔ . . . . . "

اس موقع پر ایک خوش رو نوجوان کمرے میں داخل ہوا اور کرنل صاحب کو فوجی سلام کیا۔ اور صوبہ دار میجر صاحب نے کچھ فخر و انداز بدی سے اٹھ کر ہنستے ہوئے کہا کہ صاحب، یہ میرا لڑکا ہے۔ کرنل صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور نوجوان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولے "او صوبہ دار میجر صاحب، یہ تو آپ سے بی اونچا ہے" صوبہ دار میجر صاحب نے ہنستے ہوئے خوشی خوشی جواب دیا "آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ اونچا بھی ہے اور مجھ سے زیادہ بیوقوف بھی ہے" ہم سب اس سلسلہ پر ہنس پڑے اور نوجوان بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔

رائے صاحب کو غالباً میرا طرز بیان کچھ پسند آیا تھا۔ فرمانے لگے "اچھا کہئے ہم کس طرح اپنے گاؤں کی درستی کریں؟" میں نے عرض کیا جناب نہ ہر شخص ایک ہی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے اور نہ ہر بیماری ایک ہی دوا سے اچھی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر گاؤں کا مسئلہ علیحدہ ہوتا ہے۔ میں نے تو پہلی مرتبہ اس گاؤں میں قدم رکھا ہے میں کیسے بتلا سکتا ہوں کہ آپ کے گاؤں کو درست کرنے کے لئے بہترین حل کون سا ہوگا۔ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ آپ لوگوں سے دوستانہ

گفتگو کر کے آپ کے اقتصادی امراض کی تشخیص کر سکوں؛ مانا، اللہ آپ خود سنجیدہ و ہوشیار آدمی ہیں۔ سالہا سال سے یہیں مقیم ہیں۔ گاؤں کی درستی کے لئے آپ خود جان سکتے ہیں۔ کرنل صاحب کا مقصد تو جہاں تک میں جانتا ہوں صرف اتنا ہی ہے کہ جس طرح بھی وہ آپ کی مدد کر سکیں اس میں دریغ نہ کریں۔

صوبہ دار میجر صاحب نے دیکھا کہ یہ گفتگو تو ختم ہوتی نہیں دکھائی دیتی۔ رائے صاحب کو تھوڑی دیر محو خیال پا کر کرنل صاحب سے درخواست کی کہ آئیے پھر کر ہمارا گاؤں بھی دیکھ لیجئے چنانچہ ہماری پارٹی اور دو چار دوسرے گاؤں والے جو ہماری گفتگو بیٹھے سن رہے تھے سب کے سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ صوبہ دار میجر صاحب نے پھر معذرت چاہی کہ اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر لوگ اپنے اپنے کھیتوں میں کام کرنے چلے گئے ہیں۔ اور کرنل صاحب سے نیاز حاصل کرنے کے شرف سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ہر قدم پر ایک نیا منظر سامنے آنے لگا پتلی پتلی پتھریلی گلیوں سے گذرنا ہوا۔ لیکن ان میں بھی ایک عجیب اثر تھا جو شہری گلیوں میں نہیں پایا جاتا۔ ایک دروازہ کے پہلو میں دیکھا کہ سرخ پتھر کی استادہ سل پر ایک لمبی گردن والا پرند ترا شا گیا ہے۔ ظاہر تھا کہ حال ہی میں بنایا گیا ہے اور گو کاری گری معمولی تھی، لیکن جو جدید اثرات اس ہنر میں پیدا کئے ہیں وہ صاف ظاہر تھے۔ کیوں نہ ہو، آخر یہ گاؤں دہلی کے قریب تھا۔

رائے صاحب میرے ساتھ ہی ساتھ چل رہے تھے۔ بلکہ یوں کہئے کہ میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے رائے صاحب کا ساتھ ڈھونڈھ رہا تھا۔ انھوں نے پھر چلتے چلتے فرمایا۔ چھ سال ہوئے میں امریکہ کے کسی پریزیڈنٹ کی سوانح عمری دیکھ رہا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ جب وہ عالم کمسنی میں مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ اسے ایک روز دوپہر کو ایک چھریاں تیز کرنے والا دکھائی دیا۔ جو اپنی مشین کے پاؤں کو مشکل سے چلا رہا تھا۔ اس لڑکے کو دیکھ کر اس شخص نے کہا۔ لے میاں دیکھیں تو کہ تم میں کتنی طاقت ہے، لے چلاؤ تو سہی۔ لڑکے نے اپنی طاقت دکھانے

کی نیت سے اس پائے کو پھرا کر جب چھری کو تیز کر دیا تو اس شخص نے تیور بدل کر پوچھا کیوں میاں کیا مدرسہ کا وقت ابھی نہیں ہوا؟ تم یہاں کھیل کود میں کیوں وقت گنوا رہے ہو؟ چلو مدرسہ کا رستہ لو" رائے صاحب نے کہا اس کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم بھی حیران ہیں کہ آپ لوگ اپنی کون سی چھری تیز کرنا چاہتے ہیں۔ خدا ہی جانتا ہے"

قدوائی صاحب اور میں بے ساختہ ہنس پڑے اور میں نے جواب دیا" رائے صاحب آپ بھی یہی کوشش کیجئے کہ ہم سے آپ کوئی اپنی چیز تیز کروالیں۔ اس میں نہ صرف آپ کا مطلب نکلے گا بلکہ آپ ہم پر ہنس بھی سکیں گے کہ یہ لوگ جو صرف زبان سے ہمیں خوش کرنے کو کہتے تھے ہم نے بھی وہی کر دکھایا؛ . . . . . رائے صاحب بھی ہنس پڑے اور بولے بالکل درست، اور یقین مانئے ہم سوچ بھی یہی رہے ہیں!

اتنی دیر میں ایک مجمع کثیر ہمارے ساتھ ہو گیا تھا۔ جیسے شہر میں بکری تڑچھ کو دیکھ کر "بھاجیج" ساتھ ہو جاتے ہیں اسی طرح ہمارے ساتھ بھی دس بارہ بچے ہو لئے۔ خصوصاً ایک نونہال ہم پر بہت مہربان تھے۔ عمر پانچ چار سال کی۔ ایک لنگوٹی کے سوائے بدن برہنہ، شفاف سر سے پاؤں تک نمایاں۔ اوپر کے ہونٹ پر ایک چھوٹا سا زخم اور پھر خاک میں سنے جنس سُتر سُتر کی آمد و رفت! اس لڑکے کی زندگی پر رحم بھی آیا اور اس پر محبت بھی آئی۔ میں نے کچھ پوچھا لیکن میرا کہنا سمجھ کر بھی لڑکا میرا منہ دیکھا کیا۔ مجھے شرارت سوجھی۔ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے، میں نے منہ چڑایا۔ لڑکا اور بھی دلچسپی سے دیکھنے لگا کہ لو یہ جانور منہ بھی بناتا ہے۔ پھر کیا تھا گاؤں سے باہر ہونے تک یہ بزرگوار میرے قریب ہی رہے۔ جب کبھی ہم سے پیچھے ہو جاتے دوڑ کر پھر میرے قریب آ پہنچتے۔ اور میرے آگے چلتے ہوئے پلٹ پلٹ کر میرا منہ تکا کرتے اور میں بھی وقتاً فوقتاً ہنستا اور ان کا منہ چڑاتا ہی رہا۔

صوبہ دار میجر صاحب ہمیں ایک پرانی عمارت میں لے گئے۔ خدا جانے کس بادشاہ یا کس راجہ نے کس غرض سے اسے تیار کیا تھا۔ لیکن اب اس میں مدرسہ تھا۔ ہمارے قافلہ کو

دیکر سلام صاحب کیتلی پوکری بھولے۔ ٹوپی سنبھالتے ہوئے آگے بڑھکر کرنل صاحب کو زور سے سلوٹ مارا۔ کرنل صاحب نے آگے بڑھکر ہاتھ ملایا۔ پھر پوچھا کہ آپ اسکاؤٹنگ (SCOUTING) بھی سکھاتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ حال ہی میں یہ ٹریننگ بھی شروع ہوئی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ باعث مسرت یہ بات معلوم ہوئی کہ اس گاؤں میں اور اس طرف کے اور آٹھ دس گاؤں میں سرکار کی طرف سے قانونی لازمی جبریہ اسکول جاری ہو چکے ہیں لہذا یہاں کے سب باشندوں پر لازم تھا کہ اپنے بچوں کو سات سال کی عمر سے چودہ سال کی عمر تک مدرسہ میں شریک رکھیں۔

شام ہو چلی تھی۔ ہمیں گاؤں کا ایک چکر لگاتے ہوئے اپنا راستہ لینا تھا۔ رائے صاحب ساتھ ہی تھے اور میں ان کی طرف ہمہ تن مخاطب تھا۔ انھوں نے راستہ میں چلتے چلتے فرمایا "صاحب! لوگ جب ہی درست ہو سکتے ہیں جب ان کے آپس میں نفاق کا نام نہ ہو۔ جب آپس ہی میں لڑتے رہے تو ترقی کہاں کی؟" میں نے نہایت ادب سے جواب دیا کہ رائے صاحب لڑنا جھگڑنا زندگی کی نشانی ہے۔ صرف مردہ لوگ لڑتے جھگڑتے نہیں اور اگر زندہ لوگ آپس میں لڑنا ترک کر دیں تو ان کے زندہ ہونے میں شبہ ہونے لگے گا۔ ترقی باوجود نفاق کے بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ نفاق کی وجہ سے ایک حد تک زیادہ ترقی ہونی چاہیئے۔ زید و بکر اگر آپس میں لڑتے ہوں تو گاؤں کی ہمدردی کرنے کے لئے دونوں کو چاہیئے کہ گاؤں کی ترقی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔ آپ ہی دیکھئے کہ ہمارے دیہاتوں کی حالت کیسی روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ کیسے لوگ غریب ہوتے جا رہے ہیں۔ کھانے کو کھانا نہیں ملتا۔ ماضی کی خوش حالی کا ذکر ہی کیا۔ گذشتہ زمانے کے عیش بدام کی زندگی اب خواب میں بھی دکھائی نہیں دیتی۔" رائے صاحب چپکے چپکے سنا کئے پھر فرمانے لگے "جناب یہ تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ فرماتے ہیں ہم غریب ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے حالت آگے سے کہیں بہتر ہے۔ سابقہ لڑائی کے زمانے میں

اجناس کی گرانی کی وجہ سے بے شک ہم ضرورت سے زیادہ متمول ہو گئے تھے۔ وہ بات اب نہ رہی۔ اس بنا پر آپ کہیں کہ نسبتاً غریب ہیں تو بالکل بجا ہے۔ لیکن اصلی نظر سے دیکھئے تو ہم پہلے سے زیادہ اچھے ہیں۔

(او بھائی لال چند! RELATINTY کا مسئلہ بھی چھڑ گیا۔ واہ رے خاکساران جہاں!)

اور ہاں اگر آپ ہماری زندگی کا مقابلہ شہر دہلی اور دوسرے ممالک کی زندگی سے کریں۔ تو بے شک ہم غریب ہیں اور بھوکے ہیں۔ لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے پاس کھانے کو کافی ہے اور پہننے کو کافی ہے اور خدا انگریزی سرکار کو رکھے ہم خوش و خرم بھی ہیں۔

میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ اس لئے کہ زیادہ بحث کے لئے وقت نہ تھا اور جو کچھ رائے صاحب کہہ رہے تھے ان کے تجربہ تک صحیح بھی تھا۔ یہ گاؤں دہلی کے قریب ہے۔ بڑے شہروں کے گاؤں کا ترقی کرنا لازم ہے۔ اراضیات کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ پیداوار کی فروخت میں آسانی ہوتی ہے۔ لیکن کاش کہ جو کچھ رائے صاحب کہہ رہے تھے ہندوستان کے سب گاؤں کے لئے صحیح ہوتا۔ مجھے گذشتہ دو سال میں بہت سے گاؤں دیکھنے کا اتفاق ہوا جن میں ایسی ترقی کے بجائے تنزل ہر طرف دکھائی دیتا ہے۔

اب گاؤں کی حد پر پہونچے تھے۔ قدوائی صاحب نے ایک نہایت اچھا سوال کیا بولے "رائے صاحب، اگر ہم آپ کی خدمت کرنا چاہیں تو آپ کے خیال میں بہترین طریقہ کیا ہوگا؟" رائے صاحب نے اس طرح جواب دینا شروع کیا کہ میں نے دل میں خیال کیا کہ اب کوئی اہم بات معلوم ہوگی۔ فرمانے لگے "یہ آپ نے پتہ کی بات کہی۔ جناب والا اگر آپ ہماری خدمت کرنا چاہتے ہیں تو میں تو صرف یہ کہوں گا کہ ہمارے پاس بار بار تشریف لے آئیے۔ ہم کو اپنی صحبت سے مستفید ہونے دیجئے۔ جب ہم آپ کو پہچان لیں اور آپ ہم کو جان جائیں تو پھر ایک دوسرے کی خدمت ہو سکتی ہے"۔ . . . . . دیکھا آپ نے کیسا عمدہ جواب دیا! میں دل ہی دل میں اس کی تعریف کر رہا تھا۔ کہ رائے صاحب نے کسی قدر مخفی لہجے میں فرمایا "جناب آپ

آپ لوگ ہماری محتاط گفتگو سے خفا نہ ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ آج کل نہایت نازک زمانہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون دوست ہے اور کون دشمن۔ پرسوں ہی یہاں دو امریکن آئے تھے۔ بیچاروں نے ہمارے بچوں میں بیس تیس روپے مٹھائی کھانے کو تقسیم کر دیئے۔ اور ہم سے بہت سوالات کئے۔ آپ ہی فرمائیے ہمیں کیا بتانا چاہیئے تھا اور کیا چھپانا چاہیئے تھا۔ اگر بہت کچھ بتا دیتے تو ان کی تو ڈائری بھر جاتی لیکن اگر خدانخواستہ کسی عہدہ دار تک جھوٹ موٹ بھی یہ پہونچا دیا جاتا کہ ہم باغی ہیں اور سرکار کی مہربانیوں کے مشکور نہیں تو آپ ہی فرمائیے کیا ہوتا۔ بھائی صاحب ان دنوں تو ہمیں ہر لفظ میں دفعہ سوچ کر زبان سے ادا کرنا پڑتا ہے۔

کرنل صاحب جو آگے آگے صوبہ دار میجر صاحب کے ساتھ چل رہے تھے، ہمارے لئے ٹھہر گئے تھے۔ ان تک پہونچ کر ہم نے بھی سب کو خدا حافظ کہا۔ کرنل صاحب اور صوبہ دار میجر صاحب دو اعی گفتگو کے دو جملے واقعات پر بہت کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ یہ تھے:۔

کرنل صاحب۔ (صوبہ دار میجر صاحب کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے) "صوبہ دار میجر صاحب! آج ہم نے جو بات آپ کو بتلایا مہربانی کر کے آپ اسے بھولنا نہیں"

صوبہ دار میجر صاحب:۔ "بھلا ہم کیسے بھول سکتے ہیں، جو کچھ آپ نے فرمایا ہم اسے حکم سمجھ کر بجا لائیں گے"

کرنل صاحب۔ (دونوں ہاتھوں میں میجر صاحب کا ہاتھ لے کر) "یہاں حکم کا بات نہیں ہے، سب بات پیار کا بات ہے"

صوبہ دار میجر صاحب:۔ "جی نہیں، برٹش سرکار کی مہربانیاں ہم پر اتنی ہیں کہ ہم نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا ہے کہ یورپین لوگ جو کچھ کہیں گے اسے حکم کی طرح بجا لانا ہمارا فرض ہے"

بھائی، اور کیا لکھوں۔ گاؤں والوں سے ملنے گئے تھے خود کو افلاطون کی محفل میں پایا۔ سکھانے آئے تھے سیکھ کر چلے۔ کاش، ہندوستان کے ہر گاؤں میں ایک رائے صاحب نکل آئیں! اگر کبھی اس گاؤں کی طرف جانا ہو تو ہماری طرف سے رائے صاحب اور صوبہ دار میجر صاحب کو سلام کہنا۔ اور یار، اگر ہمارا دوست تمہارا بھی منہ تک کر اپنی شناخت کرا دے تو میری طرف سے ایک دفعہ منہ بھی چڑا دینا! زیادہ اشتیاق ملاقات، فقط

آپ کا، امیر علی

غزل

(از جلیل احمد قدوائی، بی اے)

فکر راحت نہیں اندیشۂ آلام نہیں
دل کو کچھ تیری محبت کے سوا کام نہیں

روح بے کیف ہے دل سرد ہے آنکھیں بے نور
سامنے میرے جو وہ رونقِ دل آرام نہیں

یاد کو تیری میں اس طرح لئے بیٹھا ہوں
جیسے دنیا میں کوئی اور مجھے کام نہیں

عشق کی روح ہے یہ گر یہ کناں آہ و فغاں
نعرہ زن بلبلِ ناشاد تہِ دام نہیں

میرے مکتوبِ محبت پہ وہ ایسے بگڑے
آج تک سلسلۂ نامہ و پیغام نہیں

جب سے اس جانِ محبت سے ہوا ہے آباد
خانۂ دل میں مسرت کا کہیں نام نہیں

کامیابِ غمِ دنیا ہوں بہت شاد ہوں میں
مجھ کو ناکام نہ سمجھو، کہ میں ناکام نہیں

مجھ کو جو کچھ ہے گلہ اپنی ہی تقدیر سے ہے
آپ پر میری تباہی کا کچھ الزام نہیں

عشق کی لذتِ جاوید نہ پوچھو مجھ سے،
یہ وہ آغاز ہے جس کا کبھی انجام نہیں

"قیس و فرہاد ہوں یا سرمد و منصور و جلیل"
کوچۂ عشق میں ہے کون جو بدنام نہیں!

تنقید و تبصرہ

کتب

خواب وخیال۔ مے دوآتشہ۔ جامع الرضوی المعروف بصحیح البھاری۔ خلفائے اربعہ انگورا اور ترک۔ خادمات خلق۔ شریر لڑکا۔ تاریخ مرات مصطفےٰ آباد۔ رسول وحدت انسان کامل۔ ہدیۂ نعت۔ نیرنگ۔

رسائل

طبیہ کالج میگزین۔ الضیاء۔ حقیقت اسلام۔

خواب وخیال | از مجنوں گورکھپوری۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۲۶۵ صفحات قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ ایوان اشاعت گورکھپور۔

جناب مجنوں ہندوستان کے کامیاب افسانہ نگاروں میں ہیں۔ رسالہ نگار میں آپ کے افسانے خاص طور پر شایع ہوا کرتے اور بہت دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔

زیر تبصرہ کتاب خواب وخیال اور چند دوسرے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ "تم" کے عنوان سے کشمکش حیات کی دلچسپ داستان پیش کی ہے۔ کتاب ظاہری خوبیوں کے اعتبار سے بھی بہت خوب ہے، لیکن قیمت عہ ہمارے خیال میں بہت زیادہ ہے۔

مے دوآتشہ | مرتبہ سید محمد علی بلگرامی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۷۰ صفحات (مجلد) قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد۔

مے دوآتشہ، جناب شوکت بلگرامی نے رباعیات عمر خیام کا ترجمہ اردو ترجمہ رباعیات میں کیا ہے اور بہت کامیاب ترجمہ کیا ہے،

ابتدائے کتاب میں حالات مترجم و مصنف کے عنوانات سے جناب سید محمد علی بلگرامی صاحب اور جناب علامہ نظم طباطبائی نے مصنف کے خاندانی حالات سپرد قلم فرمائے ہیں۔ اس کے بعد جناب مترجم کا دیباچہ ہے، جس میں ترجمہ کی وقتوں کا احوال ہے،

مہاراجہ سرکشن پرشاد، نواب عماد الملک، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شروانی، اور شمس العلما مولوی سید امداد امام صاحب کی ناقدانہ تقاریظ بھی مے دو آتشہ کے ساتھ ساتھ شائع ہوئی ہیں، ترجمہ کی طباعت میں ایک خاص خوبی یہ پیدا کی گئی ہے کہ ایک صفحہ پر عمر خیام کی رباعی، اس کے نیچے وینفیلڈ کا انگریزی ترجمہ اور دوسرے صفحہ پر جناب شوکت کا ترجمہ جلی خط میں شائع کیا گیا ہے

جامع الرضوی | مولفہ مولانا محمد ظفر الدین صاحب صاحب بہاری۔ سائز ۲۹ × ۲۲ ½ ضخامت ۲۲۰ صفحات قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ محمد مختار الدین احمد صاحب۔ پٹنہ

حدیث کی مختلف کتابوں سے حدیثیں لے کر جمع کر دی گئیں ہیں، ہر حدیث کے آخر میں کتاب کا حوالہ بھی دیدیا گیا ہے۔ مصنف نے کوشش کی ہے کہ احناف کے نقطہ نظر کے اثبات میں احادیث سے شواہد لائے جائیں۔ اس سلسلہ میں مصنف نے قوی و ضعیف ہر قسم کی حدیثیں نقل کی ہیں اور اپنے اس مسلک پر بعض قدما کے اس قول سے مدد لی ہے کہ ضعیف حدیثیں کثرت طرق سے قوی ہو جاتی ہیں حالانکہ اس سے مراد صرف حفظ و ضبط کا ضعف ہے نہ کہ ثقاہت و غیر ثقاہت کا۔ اور عدالت و غیر عدالت کا۔

عرصہ ہوا صوبہ بہار میں آثار السنن کے نام سے اسی قسم کی ایک کوشش ہوئی تھی۔ کاش! صحیح البخاری کے مصنف اپنے ہی صوبہ کے لائق پیشرو کے نقش قدم کو دلیل راہ بناتے!

خلفائے اربعہ | مصنفہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی۔ سائز ۳۰ × ۱۹ ½ ضخامت ۱۴۷ صفحات۔ قیمت ۱۰ر۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ، دہلی۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے خلفائے اربعہ یعنی حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پاکیزہ حالات نہایت شرح و بسط کے ساتھ قلمبند کئے ہیں۔

اگرچہ مصنف موصوف کا تبحر اور ذوق علمی ہی اس کتاب کی خوبی اور بہتری کی سب سے بڑی ضمانت ہو سکتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ امت اسلامیہ کے ان اربع عناصر کے مصدقہ حالات اور سچے واقعات جس نظم اور ترتیب کے ساتھ اس تصنیف میں جمع کئے گئے ہیں وہ حد درجہ پسندیدہ اور مفید ہیں۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کو اصلاح اخلاق اور اصلاح اعمال کے لئے جس قسم کے ادب کی ضرورت ہے، خلفائے اربعہ اس کا بہترین نمونہ ہے۔ زبان نہایت صاف اور سلیس ہے جس سے مرد، عورت اور بچے سب یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ خلفائے اربعہ کی سیرت پر مشتمل ہے۔ لیکن درحقیقت اسلام کے آغاز اور عروج کی ایک تاریخ ہے ۔

انگورا اور ترک | مولفہ مولوی عبدالرب صاحب بی اے، ال ال، بی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۔ صفحات ۱۴۸۔ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ محمود مکتبہ نمبر ۶ نخاس کہنہ۔ الہ آباد ۔

اس کتاب میں ترکوں کی چند جنگوں اور بعض مشاہیر ترک کے حالات کو جمع کیا گیا ہے۔ اور جنگ عظیم کے بعد ترکی میں جو سیاسی اور معاشرتی انقلاب رونما ہوا۔ اس کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ موجودہ ترکی کی جو معاشرتی اور اقتصادی حالت ہے اس پر مصنف نے تبصرہ کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ عہد حاضرہ کے ترک اسلام کے اسی طرح شیدائی ہیں جس طرح اب سے پہلے تھے۔

خادمات خلق | مترجمہ سیدہ خاتون صاحبہ مرحومہ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶، ضخامت ۱۲۱ صفحات قیمت ۱۰ر ملنے کا پتہ ۱۔ مکتبۂ جامعہ، دہلی ۔

اس کتاب میں یورپ اور امریکہ کی چند جانباز اور پاک سیرت خواتین کے حالات جنہوں نے خدمت بنی نوع انسان اور اپنی حوصلہ مندیوں سے حیات جاوید حاصل کرلی۔ اس کتاب کا مطالعہ مستورات کے لئے خصوصاً نہایت مفید ہے۔ تاکہ ان کے قلوب میں بھی خدمت نوع اور خدمت وطن کا جذبہ پیدا ہو اور وہ بھی اپنی ان بہنوں کے نقش قدم پر چل کر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو اپنا مطمح نظر بنائیں ۔

کتاب کا کاغذ، کتابت، طباعت بہت دیدہ زیب ہے اور سرورق بھی نہایت خوبصورت۔

شریر لڑکا | مصنفہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ۔ڈی۔ سائز ۲۰×۳۰، صفحات ۴۰، قیمت ۴ر ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

یہ ایک نصیحت آموز ڈراما ہے، جو بچوں کی اصلاح اور تربیت کے لئے لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ برے بچوں کو بھی اگر سمجھدار تربیت دینے والے اساتذہ مل جائیں تو وہ بہتر بن سکتے ہیں اور اپنے اس خیال کو انھوں نے ایک شریر لڑکے کی دلچسپ کہانی کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ڈراما بچوں کے لئے بہت مفید ہے۔ زبان بڑی سادہ ہے۔ جامعہ کے بچوں نے اس ڈرامے کو تمثیل بھی کیا تھا۔

طباعت وغیرہ بھی مکتبہ کی دوسری کتابوں کی طرح بہت اچھی ہے۔

تاریخ مرات مصطفےٰ آباد | جوناگڈھ کاٹھیاواڑ میں سب سے بڑی ریاست ہے اور خوش قسمتی سے یہاں کے حاکم مسلمان پٹھان ہیں جو سلطنت مغلیہ کے ضعف کے وقت سورتھ میں آئے تھے اور یہاں آکر اپنی حکومت قائم کرلی۔ موجودہ نواب سر ہاتب خاں جی۔سی۔آئی۔ای۔کے۔سی ایس۔آئی۔ نویں نواب ہیں۔ اور ان کے ہی نام نامی سے یہ کتاب منسوب ہوئی ہے۔

مرات مصطفیٰ آباد۔ جوناگڈھ کے مشہور اور محترم فاضل شیخ غلام محمد صاحب مرحوم کی تصنیف ہے، مگر چونکہ مرحوم اپنی زندگی میں کتاب کو پوری طرح مرتب نہ کرسکے۔ لہٰذا ان کے لائق فرزند منشی غلام احمد صاحب مدرس گرامر سیکہ کالج جوناگڈھ نے اسے مکمل کیا۔

ظاہری خوبی کے لحاظ سے نہایت عمدہ اعلیٰ قسم کے کاغذ پر مجلد پوری تقطیع ۱۳×۱۰ انچ پر مطبع کریمی بمبئی میں چھپی ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت صاف اور عمدہ ہے۔ اس میں پانچ رنگین تصویریں ہیں اور ان کے علاوہ ۶۵ اور تصویریں ہیں۔ جن میں یہاں کے رؤسا اور مشہور مقامات کی (جن میں سومنات بھی شامل ہے) تصاویر آرٹ پیپر پر ہیں۔ باوجود ان خوبیوں کے، اور ۸۱۰ صفحات کی ضخامت کے قیمت صرف سات روپے ہے جو ان خوبیوں کے ساتھ کچھ گراں

معنوی لحاظ سے یہ کاٹھیاواڑ کی مختصر تاریخ قبل اسلام سے اسلامی عہد تک ہے اور بابی خاندان کی تاریخ نہایت شرح وبسط سے مرتب کی ہے۔ آخری زمانہ کی تاریخ یعنی جو زمانہ مولف مرحوم کا مقا اس زمانہ کے تو جزوی حالات تک درج ہیں +

یہ دیکھتے ہوئے کہ باوجودیکہ یہ کتاب بمبئی میں چھپی اور کاٹھیاواڑ میں لکھی گئی زبان کی غلطیوں سے بالکل صاف ہے، عبارت بھی اچھی ہے۔ جو لوگ تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں، خصوصاً جنھیں یہ دیکھنا ہو کہ اسلامی سلطنتیں کس طرح مٹیں اور کس طرح حکمرانوں کی غفلت اور اغیار کی شرارت سے وہ تباہ ہوئی ہیں، وہ اس تاریخ کو ضرور پڑھیں اور عبرت حاصل کریں۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان ملک گیر تو بہت اچھے تھے مگر ان کے جانشین ملک کو اچھی طرح نہ سنبھال سکے اور نہ ان میں وہ بات باقی رہی جو بانی سلطنت میں تھی۔ بابر اور بہادر شاہ۔ و فرخ سیر وغیرہ کے نمونے ہر اسلامی ریاست میں ملتے ہیں۔ اور پھر جس ملک میں جسونت سنگھ اور رگھناتھ جی وغیرہ جیسے معتمد ہوں وہاں تو یہی مصرع صادق آتا ہے ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

یہ مرات ہے اور اس میں ضرور تاریخ کے طلبا کو اسلامی حکومت کا نقشہ دیکھنا چاہیئے۔

کتاب منشی غلام احمد صاحب مدرس گیر اسیہ کالج جوناگڈھ سے مل سکتی ہے +

رسول رحمت | یہ مولانا سید سلیمان ندوی کی تقریر "سیرت" ہے جو ۱۹۳۲ء کے یوم النبی میں پڑھنے اور مسلمانوں میں تقسیم کرنے کی غرض سے دفتر اشاعت سیرت لاہور نے شائع کی ہے۔ مولانا نے اس تقریر میں اسلام کی وحدانیت کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر سیرت، پٹی۔ ضلع لاہور۔

انسان کامل | یہ سید رشید رضا ایڈیٹر المنار مصر کی تقریر سیرت ہے۔ اسے بھی دفتر سیرت لاہور نے آریوں، سکھوں وغیرہ میں تقسیم کی غرض سے شائع کیا ہے۔

ہدیہ نعت | مرتبہ سید اشفاق حسین صاحب بی اے۔ بی ٹی۔ ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول گوڑیانی ضلع رہتک۔

عید میلاد النبی کی تقریب میں سید اشفاق حسین صاحب نے چند نعتیہ نظموں کا مجموعہ طبع کرایا ہے امیر مینائی مرحوم، مولانا حالی مرحوم اور دوسرے بلند پایہ شعرا کا کلام مجموعہ کی زینت ہے۔ مولف سے یہ مجموعہ مفت منگایا جا سکتا ہے۔

نیرنگ | مصنفہ اس۔ آر۔ کے صاحبہ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۵۷ صفحات قیمت ۴ر۔ ملنے کا پتہ ا۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

نیرنگ اس۔ آر کے صاحبہ کے بارہ مختصر افسانوں اور ایک ڈرامہ کا مجموعہ ہے۔ سب افسانے بڑے دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں۔ اس آر کے صاحبہ اردو کے اکثر نسوانی رسائل میں لکھتی رہتی ہیں اور ان کے فسانے عموماً بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ زبان سلیس و سادہ ہے اور انداز بیان نہایت دلکش۔

طبیہ کالج میگزین | تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۷۲ صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت نفیس۔ قیمت فی شمارہ سالانہ۔ مقام اشاعت طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

جب اسلامی تمدن میں انحطاط شروع ہوا ہوا، تو ہر چیز جس نے اس کے سائے میں پرورش پائی تھی، تنزل کی طرف مائل ہوگئی۔ طب یونانی بھی (جسے یونانی کہنا جذبہ احسان شناسی کے لحاظ سے قابل تعریف ہے مگر نفس الامر میں صحیح نہیں ہے) اسی زمرے میں آتی ہے۔ اس فن کی بنا یقیناً یونانی ماخذوں پر رکھی گئی۔ لیکن عرب اور ایران کے محققوں کی کاوش اور مسلم فرمانرواؤں کی قدردانی سے یہ کہیں سے کہیں پہونچ گیا۔ زوال کے زمانے میں مسلمانوں کی سلطنتیں ایک ایک کے مٹنے لگیں تو علوم و فنون کے لئے جو ان سلطنتوں کے دامن سے وابستہ تھے کہیں ٹھکانا نہ رہا۔ فن طب بھی عام انتشار سے متاثر ہوا، اور مٹا نہیں تو مٹنے کے قریب پہونچ گیا۔ کیونکہ اس میں تحقیق و تفتیش

کا دروازہ بالکل بند ہوگیا۔ اور عربی و فارسی علوم کی طرح طب یونانی کا آخری ملجا و ماویٰ ہندوستان تھا۔ جہاں یہ فن رائج رہا بھی اور اب تک رائج ہے۔ اس پچھلے زمانے میں بھی ہندوستان میں بڑے بڑے حاذق طبیب برابر گذرے لیکن ان کی حذاقت زیادہ تر ان کے خداداد جوہر پر موقوف تھی۔ فن کی حیثیت سے طب یونانی کی یہ حالت ہوگئی کہ طب مغربی کے مقابلہ میں جو جدید ترین علمی تحقیقات سے فیض یاب ہوکر آئی تھی اس کا میدان میں آگے بڑھنا محال تھا۔ ادھر حکومت کی مخالفت اور قیامت تھی مگر کچھ خدا ہی کو منظور تھا کہ مسلمانوں کی صدہا سال کی علمی کمائی ضائع نہ ہونے پائے اس لئے چند سال پہلے بعض اللہ کے بندے اٹھ کھڑے ہوئے کہ ایک طرف تو طب یونانی کے مخالفوں کا مقابلہ کریں اور دوسری طرف خود اس طب میں جدید علمی تحقیقات کے مطابق ضروری اصلاحات کرکے اس کی بنیاد کو مستحکم کریں۔ اس تحریک کے روح رواں مسیح الملک حکیم اجمل خاں تھے۔ جنھوں نے محض اپنی کوشش سے بغیر حکومت کی امداد کے دلی میں طبیہ کالج قایم کیا۔ اس کے بعد خود حکومت ان کی تحریک سے متاثر ہوئی اور اس نے لکھنو میں طبیہ اسکول اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں طبیہ کالج قائم کرایا۔

طبیہ کالج قائم ہونے کو تو ہوگئے۔ مگر ان کی زندگی کا دارومدار علمی تحقیق پر ہے۔ اور علوم کو تحقیق کی ضرورت توسیع اور ترقی کے لئے ہوتی ہے۔ لیکن طب یونانی تو اپنا مقصد وجود پورا کرنے ہی کے لئے بہت بڑی علمی جد وجہد کی محتاج ہے۔ جب تک اس کے اصل اصول علوم جدیدہ کی روشنی میں جانچے نہ جائیں جب تک اس کی فروعات مشاہدہ اور تجربہ کے معیار پر پرکھی نہ جائیں یہ علم کہلانے کی مستحق نہیں ہوگی۔ بلکہ صرف چند روایات کا مجموعہ سمجھی جائے گی۔

دلی کے طبیہ کالج میں علمی تحقیق کا کام مسیح الملک کی نگرانی میں شروع ہوا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی بے وقت موت سے کالج کے اور کاموں کی طرح ٹھٹھر کر رہ گیا ہے۔ اب علی گڈھ کے مسلم یونیورسٹی کے طبیہ کالج سے یہ امید ہوسکتی ہے کہ طب یونانی کو اسی علمی رتبے پر پہونچائے جو طب مغربی کو حاصل ہے۔ یہ مشاہدہ ہے کہ باوجود ان تمام نقائص کے جو طب یونانی میں نظری حیثیت سے

ہیں، عملی طور پر یونانی طریقہ علاج ابھی تک ڈاکٹری کا مقابلہ کئے جاتا ہے۔ اور بعض صورتوں میں ہماری ہندی مزاجوں کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ اگر اس کی علمی بنیاد صحیح اور مستحکم ہوجائے تو یقیناً یہ ہمارے ملک کی صحت کے لئے نعمت ثابت ہوگا۔

خدا کا شکر ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طبی کالج نے اس راہ میں قدم بڑھایا ہے۔ اور ایک سہ ماہی رسالہ جاری کرکے علمی تحقیقات اور بحث مباحثے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ پہلا نمبر دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مجلس ادارت کے پیش نظر بہت وسیع علمی مقاصد ہیں۔ چنانچہ رسالہ میں خالص طبی علمی اور عملی مسائل کے علاوہ تجدید طب کے نام سے حکیم عبداللطیف فلسفی صاحب کا مضمون ہے جس میں عناصر کے قدیم اور جدید تصور پر بحث کی گئی ہے۔ بعض مضامین مثلاً قبض، حیاتین، بتاکو کھی وغیرہ عام مذاق کے بھی ہیں جن میں سادہ زبان اور عام فہم انداز میں ایسی معلومات اور ہدایات جمع کی گئی ہیں کہ ہر شخص انھیں پڑھ کر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ نہ صرف طبیبوں بلکہ مریضوں میں بھی، جن کے زمرے میں قریب قریب ملک کی کل آبادی آجاتی ہے، بہت مقبول ہوگا۔ امید یہ بھی ہوتی ہے کہ قدیم فلسفے اور علوم صحیحہ کا جو تھوڑا بہت مذاق ہمارے طبیبوں میں باقی ہے شاید اس کی بدولت ان علوم کی نمائش رسالے میں چھڑتی رہیں اور علاوہ طب کو فروغ دینے کے یہ رسالہ عام علمی مذاق پیدا کرنے کے لئے بھی کامیاب ہو۔

الضیاء | ایڈیٹر مسعود عالم ندوی۔ مقام اشاعت شبلی ہوسٹل، بادشاہ باغ۔ لکھنؤ۔ قیمت سے۔ (تین روپے) سالانہ۔

عربی کا یہ جدید رسالہ مشہور ادیب مولانا سید سلیمان ندوی اور شیخ تقی الدین الہلالی المراکشی کی سرپرستی میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس وقت تک اس کے تین نمبر شائع ہوچکے ہیں۔ پہلے پرچہ پر جناب مدیر کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی۔ بالخصوص ڈاکٹر اقبال پر جو مضمون ہے وہ تو حد درجہ ناقص ہے، دوسرا نمبر خوب ہے۔ اس میں مدیر رسالہ کا سلسلہ مضمون "تاثیر الاسلام فی الشعر العربی" اور مولانا سید سلیمان ندوی کا سعرب مضمون "کیف انتشر الاسلام فی الہند" اور سعید

انصاری صاحب رفیق دار المصنفین کا مضمون "چیر و مقابلہ پر" یہ سب مضامین بے نیاز ستائش ہیں بالخصوص ہلالی صاحب کا مضمون عربی سیکھنے اور سکھانے کے اصول پر تو بہت ہی خوب ہے ضروری ہے کہ ہر معلم اسے اپنے پیش نظر رکھے۔ تیسرا بھی خوب ہے، اس کے مضامین بھی کافی رفیع ہیں۔ استاذی مولانا عبد الحلیم صدیقی (اسیر فرنگ) کی شاعری میں جو کیف ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ کاشغری صاحب کا قصیدہ بھی خوب ہے، تیسرے نمبر میں احمد صاحب جونا گڑھی کا مضمون "شغف ابی العلا بالمتنبی" بھی خوب ہے۔ پرچہ ہر اعتبار سے بہت خوب ہے۔ یہ جرات بھی قابل داد ہے کہ ہندوستان میں عربی کی اس حالتِ کس مپرسی کے باوجود عربی کا رسالہ نکالا اگر یہی رفتار رہی تو بلاشبہ "الضیاء" کچھ عرصہ کے بعد مصر کے رسائل کا مقابلہ کر سکیگا۔ انشاء اللہ

حقیقت اسلام | دفتر رسالہ حقیقت اسلام واقع پیکو آرٹ پریس بیرون موچی دروازہ لاہور

یہ ایک مذہبی پرچہ ہے، جو جناب سید محمد شاہ صاحب کی ادارت میں لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ زیر تبصرہ رسالہ پہلی جلد کا نمبر ۶ ہے جو میلاد نمبر کے نام سے شائع ہوا ہے مضمون نگاروں میں ہندوستان کے مشاہیر کے مضامین درج ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت اچھا منتظمین رسالہ کو اور زیادہ مقبول اور دلچسپ بنانے کی فکر میں ہیں، قیمت سالانہ ۲

دنیا کی رفتار

عالم اسلام

۱۔ مسلمانان جاپان۔

ہندوستانی جرائد میں اسلامیان جاپان کے متعلق جو مختلف اطلاعیں حال ہی میں شائع ہوئی ہیں ان کا ملخص یہ ہے :-

گذشتہ دسمبر میں مسلمانان جاپان کے ایک عظیم الشان اجتماع نے انجمن وحدت اسلامیہ کی بنیاد رکھی اور تجویز کی کہ ایک لاکھ ین (جاپانی سکہ) کی فراہمی سے ایک دینی سرمایہ قائم کریں۔ جاپانی مسلمان چاہتے ہیں کہ وہ اپنا ایک اخبار جاری کریں اور عربی اور انگریزی کے اسلامی ادبیات کو جاپانی زبان میں منتقل کریں۔ وہ جاپان کے اندر مسلمانوں کی مردم شماری، ان کے سیاسی، مذہبی اقتصادی اور ملکی حقوق کا تحفظ۔ ایک عربی درسگاہ، ایک جامع مسجد اور تالیف و اشاعت کے لئے ایک ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جاپان سے باہر بلاد اسلامیہ بالخصوص مصر، ترکی، ہندوستان اور افغانستان سے رابطۂ اتحاد کے آرزومند ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ان کا ایک نمائندہ اکثر بلاد اسلامی کا دورہ کرتا رہے۔

۲۔ ترکی کے خارجی تعلقات۔

ایک امریکن مبصر نے ترکی کی خارجی سیاسیات پر رائے زنی کرتے ہوئے ذیل کے خیالات کا اظہار کیا ہے :-

"گذشتہ پچیس سال میں دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ترکوں نے بھی اپنے اندرونی نظام سیاست کی کمزوری سے بے حد نقصان اٹھایا۔ خوش قسمتی سے اب حالات بدل گئے ہیں۔ ترکی

کی موجودہ حکومت نہایت ہی سادہ اور مظلم ہے۔ اور اس کی عنان ایک ایسے بالغ نظر مدبر کے ہاتھ میں ہے جو بین الاقوامی سیاست کی پیچیدگیوں سے نہایت حزم و احتیاط کے عہدہ برآ ہو رہا ہے۔ ترک اس وقت ریاستہائے بلقان، حکومت روس اور جمعیۃ الاقوام سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

تین سال سے بحث و پند ہو رہی تھی کہ ریاستہائے بلقان کا ایک فیڈریشن قائم کر دیا جائے ترک یہ چاہتے تھے کہ بلغاریہ، یونان، البانیہ، رومانیا اور جوگوسلافیہ سے مل کر سیاسی اور اقتصادی اشتراک عمل کی راہ کھول دیں۔ اس کے لئے کچھ کانفرنسیں بھی منعقد ہو چکی ہیں۔ لیکن گذشتہ دنوں میں اتحاد ریاستہائے ڈینیوب کی تجاویز سے بلقان کا فیڈریشن معرض خطر میں آ گیا تھا۔ اگر رومانیا اور جوگوسلافیا کو آسٹریا، ہنگری اور زیکوسلافیا کے ساتھ شریک ہونا ہے تو اغلب یہ ہے کہ بلقان کا فیڈریشن قائم نہ ہو سکے گا۔ رومانیا اور جوگوسلافیا نے اپنے آپ کو ریاستہائے بلقان سے ہمیشہ برتر سمجھتا ہے اور وہ اس امر کو زیادہ پسند کرے گی کہ ان کا اتحاد شمالی ہمسایوں سے ہو۔ البتہ اگر اتحاد ڈینیوب کی اسکیم ناکام رہی تو پھر جنوبی فیڈریشن کے معرض وجود میں آ جانے کا بہت کافی امکان ہے ۔

گذشتہ اپریل میں عصمت پاشا وزیر اعظم ترکی اور توفیق پاشا وزیر خارجہ تین ہفتے کے لئے روس تشریف لے گئے۔ ان کیساتھ اور بھی بہت سے ترک معززین موجود تھے۔ ان لوگوں نے اڈیسہ تک جہاز میں سفر کیا۔ اور وہاں سے ماسکو تک راستہ ریل میں طے کیا جس کا انتظام خاص طور سے روسی حکومت نے کیا تھا۔ ماسکو میں ان کا خیر مقدم بڑے تپاک اور سرگرمی سے ہوا۔ ترکی اخباروں نے بھی شکریے کے ساتھ اس امداد کا تذکرہ کیا جو آج سے دس بارہ سال پہلے اون کو روس سے ملی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ غازی عصمت پاشا کے اس سفر کا مقصد یہ ہے کہ وہ روس کے اقتصادی اور تعلیمی حالات کا مطالعہ کریں۔ تاکہ اگر ممکن ہو تو ترک بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ترک مدبر خاص طور سے اس امر کا اظہار کر رہے ہیں کہ ترکی اور روس کے دوستانہ

تعلقات کے یہ معنی نہیں کہ دوسری حکومتوں سے ان کے روابط میں کچھ فرق آگیا ہے ۔

سفر روس سے دو ہفتے پہلے تونیق بے نے مجلس تخفیف اسلحہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ترکوں کو جمعیۃ اقوام میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی تو وہ اس سے انکار نہیں کریں گے۔ نو سال ہوئے لوزان کانفرنس میں معاہدہ صلح پر گفتگو کرتے ہوئے بھی ترکوں نے اسی خیال کا اظہار کیا تھا۔ لیکن شاید لیگ کی کونسل میں مستقلاً ایک نشست کے نہ ملنے کی وجہ سے اس میں شامل نہیں ہوئے۔ گذشتہ سال انہوں نے ایک نیم مستقل نشست کا مطالبہ کیا تھا۔ اور اب شاید اس سے بھی دست بردار ہو جائیں اس لئے کہ مشرق اقصیٰ کے واقعات کی وجہ سے کونسل کی ساری اہمیت جاتی رہی ہے ۔"

۳- باغیان کرد۔

گذشتہ دو ڈھائی مہینوں سے برطانوی فضائی افواج کردستان کے ان نہایت ہی دشوار گذار پہاڑوں میں جن کو سرحد عراق کا ایک جز تصور کیا جاتا ہے مصروف کار ہیں۔ کرد ایک آزاد قوم ہے اور دنیا کی دوسری جنگ جو اور بیباک قوموں کی طرح ان کے بہادر اور خود سر قبائل نے بھی مشکل ہی سے کسی دوسری حکومت کو تسلیم کیا ہے۔ دولت عثمانیہ کی عظمت و اقتدار کے باوجود کرد قبائل صدیوں سے آزادانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن گذشتہ جنگ عظیم کے بعد جب سے کردستان کا علاقہ ایران و عراق اور ترکی کے درمیان تقسیم ہو گیا ہے۔ ان تینوں حکومتوں کا یہ مقصد رہا ہے کہ کردستان کی آزادی اور سرکشی کا قلع قمع کر دیا جائے۔ اول مصطفیٰ کمال پاشا نے کرد "باغیوں" کا استیصال کیا۔ پھر شاہ ایران نے ان کی طرف توجہ کی۔ گذشتہ دو تین سال سے ایرانی عساکر ان کے خلاف برابر کوئی نہ کوئی کارروائی کرتے رہتے ہیں۔ اب حکومت عراق کو یہی مہم درپیش ہے۔ پچھلے سال شیخ محمود نے سر اٹھایا تھا۔ اب کے مقابلہ اس کے بھائی شیخ احمد سے ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ شیخ احمد کا قبیلہ ابتدا میں عیسوی المذہب تھا۔ حال ہی میں انہوں نے اسلام

قبول کیا تھا لیکن شیخ احمد نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک نئے مذہب کا اعلان کر دیا۔ شیخ محمود کے زہد و تقدس کا کردوں پر خاص اثر تھا۔ شیخ احمد کو جب اس کی جانشینی کا شرف حاصل ہوا تو اس نے شیروان، برزش اور ضروی بالا کے اضلاع میں سراسر مطلق العنانی حاصل کر لی انگریزی اخبارات میں اکثر یہ اطلاعیں شائع ہوئی ہیں۔ کہ شیخ احمد خدائی کا مدعی ہے اور مذہب اسلام سے اپنی اور اپنے قبیلے کی آزادی کا اظہار ایک دعوت میں کر چکا ہے جس میں علانیہ سؤر کھایا گیا تھا بہرحال واقعات کچھ بھی ہوں، شیخ احمد جس کی عمر اس وقت چالیس برس کی ہے باوجود اَن پڑھ ہونے کے ایک نہایت ہی دانا اور سمجھ دار آدمی ہے۔ برزش اور ضروی بالا میں اس کی قوت نہایت مستحکم ہے۔

گذشتہ سال جب شیخ محمود نے حکومت عراق سے ہزیمت اٹھا کر اطاعت کر لی تو اسی وقت یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ شیخ احمد ہر اس کوشش کی مخالفت کرے گا جو عراق کی طرف سے اس علاقہ میں باقاعدہ نظم و نسق قائم کرنے کے لئے کی جائے گی۔ لہٰذا عراقی افواج کو مجبوراً شیخ احمد کے علاقہ میں پیشقدمی کرنا پڑی۔ اور کچھ ان کی ہمت و سعی اور کچھ فضائی عساکر کی سرگرمی کی وجہ سے جن کو موصل سے کردی سرحد کی طرف بڑھنے کا حکم دیا گیا تھا شیخ احمد کو ہر موقعہ پر ہزیمت اٹھانا پڑی اور اس نے ناچار دریائے تراب کے نیچے نیچے برزش کے تمام جنوبی علاقہ کو چھوڑ کر کوہ شیریں کے عقب میں پناہ لی۔

کوہ شیریں کا علاقہ اور بھی زیادہ دشوار گذار ہے اور حکومت عراق کی یہ خواہش تھی کہ وہ شیخ احمد کی سرکشی کا جلد سے جلد استیصال کر سکے لہٰذا یہ طے پایا کہ اس کرد سردار کے خلاف فضائی افواج سے کام لیا جائے۔ اور انھیں اجازت دی گئی کہ وہ کوہ شیریں کے علاقے میں اپنی کارروائیوں کو آزادانہ جاری رکھیں۔ ابتداء میں موسم کی خرابی کی وجہ سے یہ مہم بہت دنوں تک رکی رہی اور اور پھر دو انگریز ہوا باز جن کو مجبوراً زمین پر اترنا پڑا۔ کردوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے۔ لیکن شیخ احمد ان کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آیا۔ ان کو ہر قسم کا آرام دیا گیا۔ حکومت نے ان کی دیکھ بھال کے لئے ایک ڈاکٹر بھی بھیجا تھا۔ ۵ مئی کو یہ سب لوگ بخیر و عافیت سرکاری علاقہ میں واپس آ گئے۔

یہ سب کچھ اس سفارت کا نتیجہ تھا جسے ۲۴ مئی کو کپتان ہولٹ کی سرکردگی میں شیخ احمد کے پاس بھیجا گیا تھا۔ تاکہ وہ قیدیوں کی رہائی کے متعلق اس سے گفتگو کریں۔ کپتان ہولٹ کو اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ لیکن شیخ احمد نے ان شرائط کو منظور نہیں کیا جو کپتان موصوف کے ذریعے حکومت نے اس کی اطاعت کے لئے پیش کی تھیں۔ حکومت چاہتی تھی کہ شیخ احمد اور اس کے بھائیوں کو پوری عزت و احترام کے ساتھ کسی دوسرے مقام پر بھیج دیا جائے جہاں وہ آرام و اطمینان سے اپنی زندگی بسر کریں۔ اور اس کے ہمراہیوں سے کسی طرح تعرض نہ کی جائے الا یہ کہ ان کا کوئی خاص جرم ہو۔ شیخ احمد نے ان شرائط کو قبول نہیں کیا۔ ۲۴ مئی کو گفت و شنید کی میعاد ختم ہوگئی۔ اور جانبین ایک دوسرے کے خلاف جنگی کارروائیوں میں مصروف ہوگئے +

۴۔ سیاسیات شام۔

جمہوریۂ لبنان کا دستور اس سال کے بعد گذشتہ مئی میں یک قلم معطل کر دیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ باوجود متواتر ردوبدل کے یہ دستور سراسر ناقابل عمل ثابت ہوتا ہے۔ حکومت کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اس کے مصارف کی متحمل ہو سکے۔ اہل لبنان نے اس پر بہت کچھ ناراضگی کا اظہار کیا کہ باوجود ان کی مسلسل وفاداری کے ان کو دستوری حکومت سے محروم کر دیا گیا۔ بالخصوص اس لئے کہ جمہوریۂ شام کو حال ہی میں ایک ایسا دستور عطا ہوا ہے جس میں پچھلے دستور کی نسبت بہت کچھ رواداری سے کام لیا گیا ہے۔ انتخاب کے موقعہ پر فرانسیسی ہائی کمشنر نے دستور کو معطل کر دیا۔ اور صدر جمہوریہ کو ایک طرح سے تمام معاملات میں مختار بنا دیا گیا ہے۔ البتہ اس کی مدد کے لئے ایک مختصر سی کونسل ضرور موجود ہے جس کے اراکین ہائی کمشنر ہی کے مقرر کردہ ہیں +

ریاست شام کے انتخابات (جس میں اہل دمشق، حمص اور حماہ نے بہت کم حصہ لیا) ختم ہوگئے اور اب مجلس نواب میں ۴۵ اعتدال پسندوں کے مقابلہ میں وطن پسندوں کی تعداد ۱۵ ہوگئی ہے فرانسیسی حکام کا خیال ہے کہ اگر شام نے فرانس کے ساتھ اشتراک عمل جاری رکھا تو مستقبل قریب میں

یہ ممکن ہوگا کہ اس کو ایسی ہی آزادی دیدی جائے جیسی اس وقت اہل اتام، تونس یا مراکش کو حاصل ہے کیا فرانسیسی پارلیمنٹ نے ابھی حال ہی میں یہ نہایت ہی حریت پرور اور غیر جانب دارانہ اعلان نہیں کیا تھا کہ "اہل شام کی نجات ان کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ فرانس کے ساتھ انھوں نے جس قدر اتحاد و اشتراک قائم رکھنے کی کوشش کی اتنا ہی ان کی آزادی کا امکان بڑھتا جائے گا" بڑا ہی افسوس ہوگا اگر اہل شام نے اس مشفق مہربان کی عنایت و ہمدردی کا خیال نہ کریں۔ جو ایک عرصہ ہوا محض بنی نوع انسان کی محبت میں ان کی اصلاح و تربیت کا ذمہ لے چکا ہے ۔

۵۔ عراق اور انجمن اقوام۔

بالآخر انجمن اقوام کی مجلس انتداب نے ان ضمانتوں کی فہرست طیار کرلی جس کا انجمن میں داخلے سے پیشتر عراق کا قبول کرلینا ضروری ہے۔ لیگ کی کونسل نے ان ضمانتوں پر صاد کر دیا ہے۔ اور خیال یہ ہے کہ اجلاس ستمبر میں حکومت عراق اس اعلان پر دستخط کر دے گی ۔

گویا اجلاس ستمبر کے بعد عراق کو انجمن اقوام کا باقاعدہ رکن تصور کیا جائے گا۔ جسے بجائے خود اس کی آزادی کی تمہید سمجھنا چاہیئے۔ عراق نے اس عجیب و غریب آزادی کے لئے جو قیمت ادا کی ہے اس کی تفصیل بھی سن لیجئے۔ عراق کا فرض ہوگا کہ وہ اقلیتوں کی حفاظت کرے۔ خواہ وہ اقلیتیں نسلی ہوں، مذہبی یا لسانی۔ عراقی عدالتوں میں غیر ملکی باشندوں کے حقوق محفوظ رہیں گے۔ ہر شخص کو آزادئ ضمیر اور آزادئ عبادت حاصل ہوگی۔ مذہبی انجمنوں کو تبلیغ و اشاعت سے باز نہیں رکھا جائے گا۔ عراق کا فرض ہوگا کہ وہ حکومت انتداب کے قرضوں کو ادا کرے اور اس اثنا میں۔ جو حقوق دوسروں کو حاصل ہو چکے ہیں ان کی پابندی کرے، اس کو تمام بین الاقوامی معاہدوں کا احترام کرنا پڑے گا۔ اور اگر اس کے اور اراکین انجمن اقوام کے درمیان کوئی اختلاف رونما ہوا تو اس کا فیصلہ "عدالت عالم" کے ہاتھ میں ہوگا ۔

آزادئ عراق کا یہی وہ بیش قیمت پروانہ ہے جس کا گذشتہ دو تین مہینوں سے برابر چرچا ہو رہا

تھا۔ اگر آپ اس کو اس کی ابدی غلامی کا محضر نامہ سمجھیں تو یہ آپ کی غلطی ہوگی۔ البتہ حکومت فرانس کو اس پر ایک اعتراض تھا وہ یہ کہ اس اعلان میں کردی اقلیت کے حق خود اختیاری کا کہیں ذکر نہیں اور حکومت برطانیہ کا یہ کہنا کہ آئندہ پچیس برس تک فضائی بندرگاہوں کی حفاظت اور قیام برطانوی افواج کے سپرد ہوں گی، عراق کی آزادی کے منافی ہے۔ لیکن چونکہ کچھ اسی قسم کی مجبوریاں فرانس کو شام میں پیش آرہی ہیں لہٰذا امید نہیں کہ مندوبین فرانس اس مسئلے کو زیادہ طول دیں ۔

لیکن حکومت برطانیہ نے جس کا کوئی فعل قانون و انصاف سے خالی نہیں ہوتا فرانس کے اعتراض کو کچھ بہت زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بغداد ایک طرح کی بین الاقوامی فضائی بندرگاہ ہے۔ جہاں برطانوی، فرانسیسی اور ولندیزی خطوط ہوا ختم ہوتے ہیں۔ لہٰذا حکومت برطانیہ کا فرض ہے کہ وہ عراق میں آزادئ پرواز کی حفاظت کرے ۔

شاید یہاں ان دفعات کا ذکر کرنا غیر ضروری ہوگا جن کے ماتحت عراق کا یہ فرض ہے کہ بحالت جنگ دولت برطانیہ کی مدد کرے۔ ایک برطانوی جنگی سفارت مستقلاً عراق میں مقیم رہے گی۔ اسلحہ جنگ کا بہم پہونچانا بھی برطانیہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ عراق کو پولس (جس کی تعداد آٹھ ہزار ہے) برطانوی افسروں کی ہی نگرانی اور تربیت میں رہے گی ۔

اللہ اکبر! عراق کی وسعت و حدود کا خیال کیجئے اور پھر ان خود ساختہ اقلیتوں، حقوق و مراعات ضمانتوں اور پابندیوں کو ملاحظہ کیجئے جو اس مصنوعی "قوم" کو زنجیر استبداد میں جکڑنے کے لئے جس پر آج سے دس سال پہلے "عراقیت" کا افسوں پھونکا گیا تھا وضع کی گئی ہیں۔ اس کے مقابلہ پر اپنے ملک کی حالت پر نظر ڈالئے جہاں اقلیتیں بھی ہیں اور اختلافات بھی۔ لیکن وہی ہوس استبداد ہے۔ کہ ایک طرف "وطنیت" اور دوسری جانب "جمہوریت" کے نام پر اس قسم کا کوئی امتیاز قائم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ آفریں ہے سیاست دانانِ معمورۂ عالم کو! ۔

ہندوستان

۱۔ وزیر ہند کا اعلان

بالآخر ہندوستان کے مستقبل کے متعلق سر سیموئیل ہور کا وہ اعلان جس کا ایک مدت سے انتظار تھا، شائع ہو گیا۔ پارلیمنٹ کے اجلاس میں وزیر ہند نے فرمایا کہ ملک معظم کی حکومت اپنے سابقہ وعدوں پر بدستور قائم ہے۔ لیکن ہندوستان کی آئینی ترقی کے لئے جو طریق کار گذشتہ دو برس سے اختیار کیا گیا تھا اسے بادلِ ناخواستہ ترک کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ گول میز کانفرنس کے انعقاد سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ مترتب ہوتا نظر نہیں آتا۔ کانفرنس نے اب تک جو کامیابی حاصل کی ہے وہ ہر طرح سے مستحق تعریف ہے۔ مگر اس وقت سیاسی مسائل کے تصفیئے میں جو دقت رونما ہے اس کا حل گول میز کانفرنس نہیں بلکہ مناسب یہ ہوگا کہ اب یہ ذمہ داریاں ایک منتخب مجلس کے سپرد کی جائیں۔ جو ایک طرف حکومت اور دوسری طرف ہندوستان کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔

گویا وزیر ہند کے نزدیک ان کی تجویز کردہ منتخب کمیٹی گول میز کانفرنس ہی کی جانشین ہوگی۔ طریق کار میں جو تبدیلی کی گئی ہے وہ محض ظاہری ہے۔ ہندوستانیوں سے اشتراک و تعاون اور ان کو شریک مشورت رکھنے کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔

رہا آل انڈیا فیڈریشن، سو اس کے متعلق قرارداد یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں اصلاحات کا ایک مسودہ پیش کیا جائے۔ فیڈریشن کی ابتدا صوبجات کی خود مختاری سے ہوگی اور اس کی تکمیل کا انحصار اہل ہند کی رفتار اشتراک اور بعض اہم مسائل کے تصفیئے پر ہے۔ سر سیموئل ہور نے یہ بھی کہا کہ چونکہ ابھی ہندوستان کی سیاسی فضا مکدر ہے لہذا آرڈیننس بدستور قائم رہیں گے۔ البتہ ان میں جزوی ترمیمیں کر دی گئی ہیں جس سے ان کا حلقہ کار بڑی حد تک محدود ہو جائے گا۔

لیکن خلاف توقع اس اعلان پر ہندوستان کی کسی جماعت نے اظہار اطمینان نہیں کیا۔ جن

لوگوں کا نقطۂ نظر "فرقہ وارانہ" ہے ان کو اصلاحات کے پروگرام سے اس وقت تک کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ فرقہ وارانہ حقوق کا اعلان نہ ہو جائے۔ خالص سیاسی جماعتوں میں سے کانگریس ابتدا ہی سے عدم اشتراک کے راستے پر گامزن ہے اور چونکہ کانگریس اور اس کی حلیف جماعتوں کے ذمہ دار کارکن قید خانوں میں بند ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے اظہار رائے کا کوئی موقع ہی نہیں، چہ جائیکہ وہ سر سیموئل ہور کے تجویز کردہ پروگرام کے متعلق اپنے آئندہ رویے کی صراحت کرتے۔ البتہ کانگریس کے تھوڑے بہت حامی جو حسن اتفاق یا کسی دوسری وجہ سے اب تک قید و بند کی سختیوں سے محروم ہیں، وزیر ہند کے اس اعلان کو اپنی چہار سالہ (یعنی ابتدائے سائمن کمیشن سے لے کر اب تک) روش کے جواز میں بہترین عذر تصور کرتے ہیں۔ ان کو حکومت کے حسن نیت پر شروع ہی سے اعتماد نہیں تھا۔ دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کی شرکت کے باوجود بھی ان کی روش کچھ یوں ہی سی تھی اور اب آرڈیننسوں کی تجدید اور گول میز کانفرنس کے یک بیک ختم ہو جانے سے ان کا یہ خیال یقین سے بدل گیا ہے کہ حکومت ہندوستان کے معاملہ میں انصاف سے کام لینا نہیں چاہتی۔ گویا ہماری یہ خواہش کہ ہندوستان کے سیاسی حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا ہو، اب کے پھر ناکام رہے گی۔ کانگریس محسوس کر چکی ہے کہ اس کے لئے یا آرڈیننس ہیں، یا اطاعت۔ اور اس کے نتائج کیا ہیں؟ ضد اور تشدد، تلخی اور منافرت اور یہ وہ باتیں ہیں جن پر ہر محب وطن ہندوستانی کو دل سے افسوس ہوگا۔

کانگرس کے بعد اعتدال پسندوں کا نمبر آتا ہے۔ یا تو لبرل پارٹی کے سربرآوردہ راہنما تیسری گول میز کانفرنس کے انتظار میں تھے، یا دفعتہً یہ خبر آئی کہ اب کانفرنس ہی کا خاتمہ ہے۔ اس پر سر تیج بہادر سپرو، مسٹر جیاکر اور دوسرے لبرل لیڈر احتجاجاً مجلس مشاورت سے مستعفی ہو گئے اور کچھ دنوں کے بعد مسٹر جناسنی کی غیر معمولی سرگرمیوں سے لبرل فیڈریشن نے بھی اجلاس بمبئی میں وزیر ہند کے تجویز کردہ پروگرام سے بے تعلقی کا اظہار کر دیا۔ اس دن سے لے کر اب تک وزیر ہند اور ان کے مویدین منتخب کمیٹی اور اصلاحات کے پروگرام کے متعلق سینکڑوں تاویلیں کی ہیں۔ کانفرنس کے لاطائل وجود کا ثبوت خود لبرل لیڈروں ہی کے الفاظ سے پیش کیا ہے۔ ہندوستان کی آئینی ترقی اور اس کے شاندار مستقبل کے

نام پر اہل ہند سے اشتراک عمل کی اپیلیں کی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اگر خود ہندوستانی اپنی راہ میں حارج نہ ہوں تو فیڈریشن کی تکمیل مستقبل قریب ہی میں ختم ہو جائے گی اور منتخب کمیٹی کا تقرر ابتدائے خزاں ہی میں ممکن ہے۔ حکومت جو کچھ کر رہی ہے اس میں ہندوستانیوں ہی کا فائدہ ہے۔ یہ سب کچھ ہوا، مگر معاملہ جوں کا توں رہا اور اب کچھ دنوں سے حالت یہ ہے کہ لبرل اور سرکاری حلقے دونوں اپنی اپنی جگہ پر خاموش ہیں۔ ملک میں ارڈیننسوں کا دور دورہ ہے کبھی کبھی ایک آدھ جگہ سے چند کانگریسی رضاکاروں کی گرفتاری کی خبر آجاتی ہے جن کا مقصد اب یہ ہے کہ کانگریس کے دفاتر پر زبردستی قبضہ کر لیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو اصل میں ہر شخص کی توجہ فرقہ وارانہ مسئلے پر ہے۔ ہندو، مسلمان اور سکھ ایک دوسرے کے خلاف اعلانات جنگ میں مصروف ہیں۔ اور ہر قوم اسی فکر میں ہے کہ وہ اخذ یا غصب حقوق کے معاملے میں دوسری قوم سے سبقت لے جائے۔

ان حالات میں غالباً اس امر سے انکار کرنا ناممکن ہوگا کہ گول میز کانفرنس کا وجود ہندوستان کے مستقبل کے لئے فی الواقع بیکار ہو چکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے ہر جماعت نے اپنے اپنے نقطہ نظر اور مفاد کے اعتبار سے الگ الگ رائے قائم کی ہو۔ بہرحال اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل نے جو نازک صورت اختیار کر لی ہے، ان کے حل کرنے کے لئے کوئی ایسا طریق کار اختیار کیا جائے جس پر ہندوستانیوں کو بحیثیت مجموعی اعتماد ہو۔ سر سیموئل ہور یا۔ ارکان حکومت کی طرف سے اب تک جتنے اعلانات شائع ہوئے ہیں، یا انھوں نے دستور ہند کی ترتیب و تکمیل کے سلسلے میں جن مشکلات کی طرف اشارہ کیا ہے، ہم ان کی تردید نہیں کرتے۔ ہمیں حکومت کے حسن نیت میں بھی (اگر ارکان حکومت کو اسی پر اصرار ہے) خواہ مخواہ شکایت یا بدظنی کی ضرورت نہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کے معاملات کو آرام و اطمینان سے طے کرنے کے لئے اشتراک و تعاون کے بغیر چارۂ کار نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے لئے حکومت نے وقتاً فوقتاً جو طرز عمل اختیار کیا ہے اگر اہل ہند کو اس پر اعتماد نہ ہو تو اس کو بدل کیوں نہیں دیا جاتا۔ یقیناً کوئی منصف مزاج شخص اس کے لئے اہل ہند کو ملامت نہیں کرے گا۔ اور اگر اس کے خلاف کانگرس کی مثال پیش کیجائے تو کیا اس کی ذمہ داری سب سے

پہلے خود حکومت کے طرز عمل پر عائد نہیں ہوگی ؟ آخر وہ کون سی چیز ہے جس نے اس وقت اعتدال پسندوں کو بھی قطع تعلق پر مجبور کر دیا ہے۔ اس طرح خود کانگریس اور ہندو مسلمانوں کو بھی اپنی جگہ پر غور کر لینا چاہیئے کہ وہ ملک کی ترقی میں خواہ مخواہ رکاوٹیں پیدا نہ کریں۔ اگر اقلیتوں کو اکثریت کی طرف سے کچھ خطرات ہیں تو کانگریس کا فرض ہے کہ وہ ان کے اطمینان خاطر کے لئے کوئی مناسب طرز عمل اختیار کرے۔ اس کے ساتھ ہی اقلیتوں کو بھی چاہیئے کہ وہ مفاد اور تحفظ کے مسئلے کو ہندوستان کی ترقی میں حارج نہ ہونے دیں ۔

۲۔ ہندوستانی کرکٹ ٹیم

اہل انگلستان کو کرکٹ سے جو دلچسپی ہے اس کے لئے کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ کرکٹ ایک طرح سے انگلستان ہی کی ایجاد ہے۔ اہل انگلستان ہی نے اس کو وسعت و ترقی دی اور وہی اس فن کے امام بھی ہیں۔ انگریز جہاں کہیں گئے کرکٹ کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ سلطنت برطانیہ کے ہر حصے میں کرکٹ کھیلا جاتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ انگریزی سلطنت سے باہر صحیح معنوں میں کرکٹ کا کہیں بھی چرچا نہیں۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، ہندوستان، غرضیکہ جہاں کہیں انگریزی نوآبادیات یا انگریزی قبضہ موجود ہے، وہاں کرکٹ کا رواج عام ہے۔ بین الاقوامی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس وقت کرکٹ میں مقابلہ صرف آسٹریلیا اور انگلستان کے درمیان ہے۔ کرکٹ کی دنیا میں دونوں کا جواب نہیں۔ بہترین کرکٹ کھیلنے والے یا "آسی" ہیں یا "انگریز"۔ آسٹریلیا یا انگلستان میں ہر دوسرے تیسرے سال استادان فن کا باقاعدہ اکھاڑا قائم ہوتا ہے۔ لوگ بڑے ذوق و شوق سے ٹسٹ میچز کا حال پڑھتے ہیں اور فتح کا سہرا کبھی انگلستان کے سر ہوتا ہے کبھی آسٹریلیا کے ۔

ہندوستان میں کرکٹ کی ابتداء تقریباً نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا لارڈ ہیرس مرحوم کی کوششوں سے ہوئی تھی۔ لارڈ ہیرس کا انتقال ابھی حال ہی میں ہوا ہے۔ قیام بمبئی کے زمانے میں انھوں نے ہندوستانیوں کی توجہ کرکٹ کی طرف منعطف کرائی اور ان کے دل میں اس کھیل کا شوق پیدا کیا۔

اس وقت سے لے کر اب تک ہندوستان میں کرکٹ برابر ترقی پر ہے۔ ہندوستان کے اکثر کھلاڑی انگلستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں اپنی مہارت فن کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ ہز ہائینس جام صاحب نواں نگر جو کرکٹ کی دنیا میں "رنجی" کے نام سے مشہور ہیں، اپنے وقت میں کرکٹ کے بہترین کھلاڑی تصور کئے جاتے تھے۔ آسٹریلیا کے مقابلے میں انھوں نے انگلستان کی ٹیم کے لئے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کی تھیں اور اب نواب صاحب پاٹودی اور دلیپ سنجی کی ذات پر ہم ہندوستانی بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ جن کا اس سال آسٹریلیا کے مقابلہ کے لئے انگلستان کی طرف سے انتخاب کیا گیا ہے۔ گو یا گیارہ، یا گیارہ سے زیادہ کھلاڑیوں میں (جو انگلستان کی طرف سے آسٹریلیا میں ٹسٹ میچز کھیلنے جائیں گے) دو ہندوستانی ہیں۔

لیکن اب تک یہ سب کامیابیاں انفرادی تھیں، اسی لئے کرکٹ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کافی مدت سے یہ خیال تھا کہ اب کی ایک ہندوستانی ٹیم انگلستان بھیجی جائے اور اس امر کا اندازہ کیا جائے کہ آیا ہندوستانی بین الاقوامی کرکٹ میں حصہ لینے کے قابل ہوئے ہیں یا نہیں۔ یہ تجویز عرصے سے سرِ بازارِ کرکٹ کے سامنے تھی۔ لیکن ملک کے سیاسی حالات برابر اس میں حارج ہو رہے تھے۔ بالآخر مہاراجہ بہادر پٹیالہ، مہاراجہ صاحب پوربندر اور ہندوستانی کرکٹ بورڈ کی کوششیں بار آور ہوئیں اور ہندوستان کے چیدہ چیدہ کھلاڑی پٹیالہ اور لاہور میں جمع ہوئے۔ تاکہ ان میں سے بہترین کھیلنے والوں کا انتخاب کیا جا سکے۔ افسوس سے کہا جاتا ہے کہ بعض مشہور ہندوستانی کرکٹر مثلاً جے، بوٹا والا، مرچنٹ وغیرہ لاہور اور پٹیالہ کے مقابلہ میں حصہ نہ لے سکے۔ اور انھوں نے موجودہ حالات میں ہندوستان کی طرف سے کھیلنے سے انکار کر دیا۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے دو بہترین "بیٹ" یعنی "پاٹودی" اور "دلیپ" جن کے نام اوپر آ چکے ہیں، انگلستان کی طرف سے آسٹریلیا کے مقابلے میں کھیلنا چاہتے تھے۔ لہٰذا ہندوستانی ٹیم ان کی شرکت سے محروم رہی۔ ان حالات میں "منتخبین" نے سترہ کھلاڑیوں کا انتخاب کیا اور اگر یہ کہنا درست ہوگا کہ ان کی منتخب کردہ ٹیم میں بہت کافی کمزوریاں موجود ہیں۔ اگر زیادہ وقت نظر سے کام لیا جاتا تو اس سے بہتر ٹیم کا انتخاب ممکن تھا۔ لیکن یہ پہلا موقعہ ہے جس میں ایک ہندوستانی ٹیم اس

غرض سے طیار کی گئی ہے کہ وہ انگلستان میں جاکر اپنا جوہر کمال دکھائے۔ لہٰذا "منتخبین" بھی اپنی جگہ پر مجبور تھے کہ کس کو لیں اور کس کو نہ لیں۔ البتہ سال دو سال کے تجربے کے بعد صورت حالات بدل جائے گی۔ اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ اس وقت جو بھی ٹیم منتخب ہوگی اس میں "منتخبین" اور ناقدین اپنے گذشتہ تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہتر سے بہتر کھلاڑیوں کی خدمات حاصل کر سکیں گے۔

بہرحال اب کی منتخب شدہ ہندوستانی ٹیم میں ذیل کے کھلاڑی شامل ہیں:-

(۱) نادلے۔ (۲) ناڈل۔ (۳) نائیڈو۔ (۴) نذیر علی۔ (۵) وزیر علی۔ (۶) نثار۔

(۷) جہانگیر خاں۔ (۸) غلام محمد۔ (۹) گودامبے۔ (۱۰) پالیا۔ (۱۱) کولا۔ (۱۲) کپاڑیا۔

(۱۳) لال سنگھ۔ (۱۴) امر سنگھ۔ (۱۵) جگندر سنگھ۔ (۱۶) مارشل۔

ان پندرہ کھلاڑیوں کے علاوہ مہاراجہ صاحب پوربندر ٹیم کے کپتان مقرر ہوئے، اور پرنس کھنشیام سنگھ جی ان کے نائب۔ گویا کل ٹیم سترہ کھلاڑیوں پر مشتمل تھی۔ اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ اس نے ہماری امید سے بڑھ کر انگلستان میں کامیابی حاصل کی۔ اہل انگلستان نے جس تپاک سے ہماری ٹیم کا خیر مقدم کیا ہے، اور انھوں نے جس دریا دلی سے ہندوستانی کھلاڑیوں کی ہمت افزائی کی ہے۔ اس کے لئے ہم سب کو انگریزوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ کاش کہ سیاسی معاملات میں بھی دونوں ممالک کے درمیان اس قسم کے خوشگوار تعلقات قایم ہو سکیں۔ ہندوستانی ٹیم نے اکثر میچ جیتے۔ اکثر میں برابر رہے۔ شکست صرف ایک آدھ بار ہوئی اور وہ بھی زیادہ تر حالات کی عدم موافقت یا کسی اجتہادی غلطی کی بدولت۔ اس امر کو ہر شخص نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہندوستانی ہر طرح سے بین الاقوامی کرکٹ میں حصہ لینے کے قابل ہیں۔ اس کے لئے انھیں بہت تھوڑی سی سعی و محنت کرنا ہوگی۔ عام طور سے اہل ہند کو سست اور کاہل تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن تمام انگریز کرکٹر ہندوستانی ٹیم کی اعلیٰ درجہ کی "فیلڈنگ" کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اس سلسلے میں لال سنگھ کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے جس کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ گھوڑا دوڑ کے میدان میں شاید نجد و عرب کے بڑے سے بڑے رہوار بھی اس تیزی سے نہیں دوڑتے ہوں گے جس طرح "لالیا" کا یہ نوخیز کرکٹر گیند کو دیکھ کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ بولنگ میں جہانگیر اور نثار نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے۔ بالخصوص نثار نے، جن کے متعلق انگریزی اخبارات کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ "ان کا بولنگ اہل انگلستان کے لئے ایک نیا انکشاف ہے"۔ بلاشبہ ٹسٹ میچ میں انگریزی بیٹنگ کی ناکامی

کی سب سے بڑی وجہ نثار اور پھر نثار کے بعد جہانگیر خاں کا زبردست بولنگ تھا۔ بیٹنگ میں ہندوستانی ٹیم فی الجملہ کمزور ہے۔ لیکن اس میں بھی نائیڈو اور وزیر علی اور نذیر علی نے اپنا سکہ جما دیا ہے۔ وزیر علی اس وقت تک چار سنچریاں، بنا چکے ہیں۔ نائیڈو کا اسکور (انھوں نے اب تک تین سنچریاں بنائی ہیں) غالباً اس وقت تک سب سے زیادہ ہے۔ اور نذیر علی اوسط نہایت اچھا اسکور کرتے ہیں۔ جریدۂ اسٹیٹسمین نے نہایت ٹھیک لکھا تھا کہ ہندوستان میں گول میز کانفرنس کی کارروائیوں کا اس بے صبری اور ذوق و شوق سے انتظار نہیں کیا جاتا تھا، جتنا وزیر علی اور نائیڈو کے بیٹنگ یا نثار اور جہانگیر خاں کے بولنگ کا۔ ہندوستانی ٹیم کی صحیح قوت کا اندازہ ٹسٹ میچ کو کیا جا سکتا ہے جس میں انگلستان کی فتح محض اتفاقی تھی۔ انگریز کرکٹرز کو اس امر کا اعتراف ہے کہ ٹسٹ میں ہندوستانی ٹیم نے اپنی مہارت فن کی جو شان دکھلائی ہے وہ بلاشبہ مستحق تعریف ہے۔ یہ انگلستان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ شکست سے بچ گیا۔ ہمیں امید ہے کہ ہندوستانی کھلاڑی اسی طرح انگلستان میں بیش از بیش کامیابی حاصل کرتے رہیں گے ؛

ممالک غیر

امریکہ۔

امریکہ کی سیاسی زندگی میں آنے والے انتخاب صدارت کی تیاریوں سے ہلچل شروع ہو گئی ہے۔ ناظرین واقف ہوں گے کہ امریکہ میں دو اہم سیاسی جماعتیں ہیں۔ ری پبلکن اور ڈیموکریٹ۔ پہلی جماعت کی طرف سے ریاستہائے متحدہ کا موجودہ صدر پھر امیدوار ہے، اور دوسری جماعت نے ریاست نیویارک کے گورنر سٹر روزولٹ کو اپنا امیدوار نامزد کیا ہے ؛

ریاستہائے متحدہ کی ان سیاسی جماعتوں میں فرق اتنا واضح نہیں ہے جتنا کہ انگلستان یا دوسرے جمہوری ممالک کی سیاسی جماعتوں میں اکثر ہوتا ہے۔ لیکن جماعت بندی جمہوریت کا تقاضا ہے۔ اس لئے یہ جماعتیں مہینوں پہلے سے انتظامات شروع کر دیتی ہیں۔ اور شاید دنیا کے کسی اور انتخاب میں نہ اتنا اہتمام ہوتا ہے، نہ اتنا صرف، نہ اتنے آدمی رائے دیتے ہیں اور نہ اتنا وقت ضائع ہوتا ہے ؛

غرض اس انتخاب میں سب کے سب اہم مسائل سیاست داخلی کے مسائل ہوں گے ۔ اور سیاست خارجہ کے مسائل کو چنداں اہمیت حاصل نہ ہوگی۔ اب نہ جمعیۃ اقوام میں شرکت کے مسئلہ کو وہ پہلی سی اہمیت حاصل ہے، نہ عدالت عالمی سے تعلق کو۔ قرضوں کے التواء وصولی پر دونوں جماعتیں متفق ہی ہیں ۔ اور قرضے واپس مل سکیں تو دونوں جماعتیں واپس بھی لینا چاہتی ہیں۔ لہٰذا کامیابی اپوزیشن جماعت کو ہوگی جو اندرونی مسائل کا بہتر حل پیش کرے۔ اور اس میں غریب ہونے کے لئے یہ بات سخت ناموافق ہے کہ وہ برسر حکومت ہے اور اس کی تمام تدابیر آزمائی جا چکی ہیں۔ دوسرے لوگ نئے نسخے تجویز کرتے ہیں۔ اور ان کی تشخیص اور تجویز کو پہلے سے غلط ثابت کرنا ذرا مشکل ہے ۔

جرمنی۔

تاوان جنگ کا مطالبہ گیارہ سال تک جرمنی کی گردن میں سنگ گراں کی طرح لٹکا رہنے کے بعد اور جرمنی اور جرمنی کی وجہ سے دنیا کی معیشت کو بے حساب نقصان پہونچانے کے بعد بالآخر لوزان کانفرنس میں ختم کر دیا گیا۔ اب جرمنی سے بس یہ مطالبہ ہے کہ جب حالت بہتر ہو جائے تو وہ یورپ کی معاشی تعمیر نو کے لئے ایک معقول رقم یک مشت ادا کر دے گا اور بس۔ جرمنی کی نیشنل سوشلسٹ جماعت تو اس پر بھی رضامند نہیں۔ لیکن بہرحال ورسائی کے صلح نامہ میں جو ناقابل عمل مطالبات فاتح ممالک کے مدبرین کی کوتاہ نظری کی وجہ سے شامل ہو گئے تھے۔ ان کا بڑا حصہ اس مطالبہ تاوان کے قلمزد ہو جانے سے کالعدم ہو گیا ۔

شاید ناظرین کو یاد ہوگا کہ عہدنامہ ورسائی میں جرمنی نے تمام ان نقصانات کی تلافی کا اقرار کر لیا تھا جو اس کے مخالف ممالک کی سول آبادی کو جنگ سے پہونچے تھے۔ ان نقصانات کی طویل فہرست تھی جس میں صرف وہ نقصان شامل نہ تھے جو گولہ باری وغیرہ سے املاک کی تباہی کی صورت میں ہوئے تھے۔ بلکہ فاتح ممالک کے سپاہیوں اور ملاحوں کی پنشنیں اور ان کے متعلقین کے الاؤنس بھی شامل کر دیئے گئے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں فرانس نے جرمنی سے جو مطالبہ کیا تھا وہ کھرب روپے سے بھی زیادہ تھا۔ اور یہ رقم جرمنی کی قومی دولت سے کئی گنی تھی۔ دوسرے ملکوں کے ماہروں نے اس سے کم تخمینہ لگایا تھا لیکن فرانس اور انگلستان کے باشندوں کو بڑی رقم کی توقع ہو گئی تھی۔ اس لئے صلح نامہ میں

صراحت نہیں کی گئی اور مسئلہ کو ایک کمیشن کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اپریل ۱۹۲۱ء میں یعنی صلح نامے پر دستخط ہونے کے کوئی دو سال بعد اس کمیشن نے مطالبہ تاوان ۱۳۲ ارب مارک (موجودہ شرح مبادلہ اس سے کچھ ہی کم روپیوں کے مساوی ہے) مقرر کیا۔ اس کی جو قسطیں نقد اور پٹرول اجناس مقرر کی گئی تھیں۔ وہ جرمنی بروقت ادا نہ کر سکا۔ اور ۱۹۲۳ء میں فرانسیسی افواج نے رہور کے جرمنی علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

اس قبضہ سے فرانس کو الٹا نقصان پہونچا۔ فرانک کی قیمت گری۔ جرمنی سے جو کوئلہ ملتا تھا۔ اس کی مقدار گھٹی۔ اور جرمنی کی منڈی کی بربادی سے انگلستان پر بھی برا اثر پڑا۔ امریکہ اور انگلستان کے اثر سے مطالبہ تاوان پر نظر ثانی کی گئی اور ایک کمیشن نے جس کے صدر مسٹر ڈاز تھے، ایک نیا انتظام تجویز کیا۔ لیکن وہ بھی قابل عمل ثابت نہوا۔ اور جنوری ۱۹۲۹ء میں ایک اور کمیٹی نے جس کے صدر اوون ینگ (امریکی) تھے تاوان کی رقم میں کچھ اور تخفیف کی اور اس کی ۵۹ قسطیں مقرر کیں اور طے کیا کہ پہلے ۳۷ سال میں یہ رقم سال بہ سال بڑھتی رہے۔ اور اس کے بعد ۲۲ سال تک گھٹتی جائے۔

لیکن مسئلہ تاوان کا یہ "آخری" اور "قطعی" فیصلہ ایسے وقت ہوا تھا کہ دنیا کی معاشی زندگی اساد بازاری سے دوچار ہونے لگی تھی۔ اور اس کی تجاویز پر عمل پیرا ہونے کے لئے جن مزید قرضوں کی ضرورت تھی ان کا ملنا دشوار ہو چلا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں جرمنی کو بہت کم قرض ملا اور ۱۹۳۲ء میں ملنا بند ہی ہو گیا اور جو سرمایہ جرمنی میں لگا ہوا تھا وہ بھی باہر جانے لگا۔ ان حالات نے جرمنی کی معاشی حالت کو بد سے بدتر کر دیا۔ اور بالآخر جرمنی نے یہ کہدیا کہ ہم تاوان ادا نہیں کر سکتے۔ لوگ بہت چیخے چلائے لیکن واقعات کی منطق نے سب کو چپ کر دیا۔ اور لوزان کانفرنس کو یہ قصہ ختم کر دینا ہی پڑا۔

جو لوگ غیر فطری معاہدوں پر بھروسہ کرتے ہیں، یا سمجھتے ہیں کہ کوئی ایسا معاہدہ جو ایسی صورت حال قائم کرے جو بلا معاہدہ کے آسانی سے قائم نہیں رہ سکتی تھی، جو کسی وقتی پیچیدگی سے فائدہ اٹھا کر سمجھتے ہیں کہ مستقل طور پر صورت حال پر قابو پالیں گے۔ انھیں، مسئلہ تاوان کے اس حشر سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے! بعض وقت ناممکن باتیں بھی سنوائی جا سکتی ہیں، لیکن پوری نہیں کرائی جا سکتیں!

شذرات

ہمیں یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کی مجلس عاملہ نے فروری ۱۹۳۳ء میں ادارہ کا پہلا اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ شاید ناظرین کو معلوم ہوگا کہ ادارہ حال میں ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہ کے زیر ہدایت قایم ہوا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد یہ ہیں:۔

"(۱) ہندوستان کے تمام محققین علوم اسلامیہ کے درمیان اشتراک عمل، اتحاد ذہنی و اجتماعی اور وسائل امداد باہمی کے قیام میں سہولتیں بہم پہونچانا۔

(۲) محققین کی ایسی مشکلات کو جو بسا اوقات ان کے مشاغل علمیہ میں پیش آتی ہیں، حتی الامکان رفع کرنے کی کوشش کرنا۔

(۳) محققین کو نتائج تحقیقات علمیہ کی اشاعت کی غرض سے جمع کرنا۔

(۴) بیرونی ممالک کے مستشرقین کو وقتاً فوقتاً افادہ علمیہ کی غرض سے دعوت دینا۔

(۵) ارتقائے تمدن اسلامی کے سلسلہ میں اسلام کی مختلف خدمات کو منظر عام پر لانا۔

(۶) عام طور پر اسلامی تحقیقات کے لئے قوم میں تحریص و تشویق کی تحریک جاری رکھنا۔

(۷) آمدنی کافی ہونے پر ایک دار لکتب، ایک دار الاشاعت اور ایک مشرقیات کا دار النفائس (میوزیم) "

حیدر آباد کی سرکار معارف پرور نے اس ادارہ کے لئے دو ہزار سالانہ کی امداد بھی منظور فرمادی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ عالم اسلامی کے ممتاز ترین فاضل علامہ اقبال کی نگرانی میں یہ ادارہ تمدن اسلامی کے فہم کو آسان بنانے اور مسلمانوں میں معنوی بیداری پیدا کرنے کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہوگا۔

یکم اگست سے جامعہ کا نیا تعلیمی سال شروع ہو جائے گا۔ طلبا کی درخواستیں کافی تعداد میں موصول ہو رہی ہیں۔ امید ہے گذشتہ سالوں کی طرح جامعہ کا یہ سیشن بھی ہر اعتبار سے کامیاب رہیگا۔ انشاء اللہ

اب کے جامعہ کے مختلف درجوں میں تھوڑی سی تبدیلیاں کردی گئی ہیں جن کا تذکرہ کچھ ایسا ضروری نہیں۔ البتہ چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے جامعہ نے نصاب پر خاص زور دیا ہے۔ تعطیلوں سے کچھ روز پہلے اساتذہ جامعہ نے مسلسل گفتگو اور باہمی مشوروں کے بعد ابتدائی نصاب تعلیم میں غیر معمولی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی تھی۔ جن کو مدنظر رکھتے ہوئے اب کے سال "پچھلے نصاب تعلیمی کو بالکل بدل دیا گیا ہے۔ جدید نصاب کی طباعت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ امید ہے، وہ حضرات جن کو بچوں کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی ہے ہمارے نئے نصاب کو غور سے ملاحظہ فرمائیں گے۔ اور ارکان جامعہ کو اپنے مفید مشوروں سے محروم نہیں رکھیں گے۔

سیرت محمد علی کی ترتیب و تکمیل کا اعلان ملک کے ہر حصے میں ہو چکا ہے۔ قارئین جامعہ یہ سنکر خوش ہوں گے کہ جناب مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی مسودات کی نظر ثانی سے فارغ ہو گئے ہیں اور یقین ہے کہ کتاب مذکور ۲۹ اکتوبر تک شائقین کے ہاتھوں پہونچ جائے گی۔ ۲۹ اکتوبر جامعہ کا یوم تاسیس ہے۔ اس روز حضرت رئیس الاحرار نے جامعہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اور اسی روز سیرت محمد علی کا شائع ہونا وہ پہلا قدم ہوگا جو ہم دنیائے اسلام کے اس بطل جلیل کی یاد کو زندہ رکھنے کے لئے اٹھائیں گے۔ دعا ہے کہ سیرت محمد علی کا مطالعہ ہماری بے روح قوم میں ایک نیا ولولہ عمل پیدا کرے اور ہمیں ان عظیم الشان مقاصد کے پورا کرنے کی توفیق عنایت کرے جن کا بیڑہ محمد علیؒ نے اٹھایا تھا۔ آمین۔

پچھلے نمبر میں ہم نے جامعہ کے ان دو وفدوں کا ذکر کیا تھا جو جناب خواجہ عبدالحئی صاحب استاذ تفسیر اور جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب کی قیادت میں برما اور سیلون گئے تھے۔ ہمدردان جامعہ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ارکان وفد کو ہر جگہ خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ احباب برما اور سیلون نے کارکنان جامعہ کا خیر مقدم بڑے تپاک اور ہمدردی سے کیا۔ اور ان کی ہر طرح سے امداد فرمائی۔ برما میں جناب سیٹھ حاجی احمد ملا داؤد مدنی صاحب تاجر رنگون، آنریبل مسٹر اے حمید میمبر، ڈاکٹر برکت علی خاں صاحب میڈیکل پریکٹشنر مینجان اور حاجی محمد حاجی نواب صاحب مین ایسوسی ایشن رنگون نے جامعہ

کے مقاصد سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا۔ یہ انہیں کی مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ارباب وفد کو اس دور دراز سرزمین میں ہر قسم کی سہولتیں میسر آتی رہیں۔ اور مالی اعتبار سے بھی ان کا سفر کامیاب رہا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ان کی عنایات و محبت کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہے۔ اور امید ہے کہ ارباب وفد کی مراجعت کے باوجود جامعہ سے ان کا تعلق اسی طرح قائم رہے گا۔ سیلون میں اقتصادی پریشانیوں کی وجہ سے اگرچہ مالی امداد کا کچھ بہت زیادہ موقع نہیں تھا لیکن جناب محمد مجیب اور جناب شفیق الرحمٰن صاحب کی کوششوں سے اہل سیلون جامعہ سے روشناس ہو گئے ہیں اور انہوں نے جامعہ کے مقاصد اور طریق کار سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ ہمیں یقین ہے کہ جناب رؤف پاشا صاحب کی موجودگی ان کے دل میں ہماری یاد تازہ رکھے گی اور جب کبھی موقع آیا ہمارے سیلونی بھائی جامعہ کی امداد میں بیش از پیش حصہ لیں گے۔

اردو کی سب کتابیں
آپ مکتبہ جامعہ سے طلب فرمائیں

چندہ سالانہ پانچ روپیہ
قیمت فی پرچہ آنہ آنہ

پرنٹر و پبلشر: محمد مجیب بی اے (آکسن)

نے

جامعہ پریس، دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

معارف

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۱۳ | نمبر ۱ | بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۳۵ء

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

ایڈیٹر — — الضیا
حافظ مولینا اسلم جیراجپوری عاشق حسین

فہرست مضامین رسالہ "جامعہ" بابتہ جلد ۱۳
از جولائی تا دسمبر ۱۹۲۹ء

اسلامیات

مذاہب اسلامی کی ابتدا	سید نذیر نیازی صاحب بی اے (جامعہ)	۴۹
اسلامی اور مسیحی اخلاق	خواجہ غلام السیدین صاحب۔ فاضل پانی پتی	۲۰۹
مسئلہ قضاء و قدر	سید جمال الدین افغانی۔ مترجمہ مولنا محمد حسین صاحب محوی کلچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد	۴۱۰

تاریخ

قلعہ دہلی کے میوزیم ایک نظر	مولوی عبد الجلیل صاحب ندوی متعلم جامعہ ملیہ	۴۲
ترکی اور جنگ عظیم	خالدہ ادیب خانم۔ مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی	۹۹
عرب شمالی و وسطی کی حکومتیں عہد نبوی سے پیشتر	سید حسن برنی صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی وکیل بلند شہر	۲۵۰
ہندوستان فن طب کا اصل مولد	مولوی سعید انصاری صاحب بی اے (جامعہ)	۲۹۳
تاریخ عثمانیہ پر ایک نظر	مولنا محمد اسلم صاحب جیراجپوری	۳۳۰

ادب

رائنر ماریا رلکے (۲)	ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب صدیقی۔ پی ایچ ڈی	۱۲۱
من کی موج	سید وہاج الدین صاحب بی اے بی ٹی اورنگ آباد کالج	۲۶۷

دلی کا انوکھا پن اور	نگیر باقر علی مرحوم داستان گو	۲۸۵
طالسطائے اور میکائیلووچ کی خط و کتابت	محمود حسین خانصاحب سابق متعلم جامعہ ملیہ ارہائڈلبرگ یونیورسٹی	۴۳۹

تاریخ ادب

ادبیات ایران کی ترقی میں سلطان محمود غزنوی کا حصہ	مولوی حسین صاحب ندوی	۳۳ و ۱۰۹ و ۱۷۰ و ۳۸۳ و ۴۲۶
امین کی یوسف زلیخا	متعلم جامعہ ملیہ	
ڈراما کیا چیز ہے؟	نصیر الدین ہاشمی صاحب از پیرس	۱۲۶
سلیم کی یاد میں	ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ۔ ڈی	۲۷۳ و ۳۴۳
	مولوی محمد یحییٰ تنہا صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل غازی آباد	۳۰۵
لندن و پیرس وغیرہ میں باقر آگاہ کی تصنیفات	نصیر الدین ہاشمی صاحب از پیرس	۳۵۸

آرٹ

ہندوستان میں فن کا دور جدید	ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی پی ایچ۔ ڈی	۱۹۳

افسانہ

عینک فروش	ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے بی ایچ ڈی	۶۹
باغی	سلما لاگرلاف مترجمہ مولوی اسرائیل احمد خانصاحب	۱۴۷ و ۲۴۳
گرفتاری	پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن)	۳۱۵
دو عینکیں	ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے بی ایچ۔ ڈی	۳۹۸
بنیادی اصلاح	انیم زوزلیا (ترجمہ از روسی)	

تعلیم

ہندوستان اور مسئلہ تعلیم — لالہ لاجپت رائے آنجہانی — ۲۴

مترجمہ مولوی اسرائیل احمد خاں

فلسفۂ انبساط — پنڈت حبیب الرحمن صاحب مسلم یونیورسٹی علیگڑھ — ۱۳۵

اجتماعیات

آزادی کی راہیں — برٹرنڈرسل — ۲ و ۹۰ و

مترجمہ حامد علیخانصاحب بی اے (جامعہ) ۱۷۰

حصۂ نظم

نمود سحر — ابو محمد ثاقب صاحب کانپوری — ۷۹

غزلیات — حضرت جگر مرادآبادی — ۱۶۱ و ۱۶۲

غزل — حضرت ورد کاکوروی — ۲۴۰

غزل — حضرت جلیل قدوائی — ۲۴۱

فتح مبین — حضرت اقبال سہیل اعظم گڈھی — ۳۲۳

غزل — حضرت جلیل قدوائی — ۴۰۰

غزل فارسی — حضرت اصغر گونڈوی — ۴۸۱

غزل اردو — حضرت جگر مرادآبادی — ۴۸۲

تنقید و تبصرہ

(رسائل و اخبارات)

نظام المشائخ (رسول نمبر) — ۱۶۳

پیشوا (" ") — ۱۶۴

(کتب)

سیرۃ الرسول (تاریخ الامت حصہ اول) — ۲۴۲

مترجمات ۲۴۲
زرگل ۲۴۳

شذرات

۸۱ و ۱۶۵ و ۲۴۴ و ۳۲۴ و ۴۰۶ و ۴۰۳

فہرست مضمون نگاران

ابو محمد ثاقب صاحب کانپوری
احسان احمد صاحب وکیل اعظم گڈھ
اسرائیل احمد خانصاحب
اسلم (مولنا) جیراجپوری
اصغر صاحب گونڈوی
الیم زوزلیا (روسی)
اقبال احمد خانصاحب سہیل وکیل اعظم گڈھ
باقر علی (میر صاحب داستان گو)
برٹرنڈرسل
جگر مرادآبادی
جلیل قدوائی صاحب
جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ
حامد علیخاں (منشی) صاحب
حبیب الرحمٰن (پنڈت) صاحب
حسن برنی (سید) صاحب

حسین حسان صاحب ندوی

خالدہ ادیب خانم

دروکا کوروی

دل شاہجہانپوری

ذاکر حسین خاں (ڈاکٹر)

سعید انصاری صاحب

سلما لاگرلاف

سلیم الزمان (ڈاکٹر)

عابد حسین (ڈاکٹر سید)

عبدالجلیل صاحب ندوی (مولنا)

غلام الحسنین صاحب فاضل پانی پتی

لالہ لاجپت رائے آنجہانی

محمد مجیب (پروفیسر)

محمود حسین خانصاحب جامعی از ہائڈلبرگ

محمد یحییٰ تنہا صاحب وکیل غازی آباد

محمد حسین (مولنا) محوی صاحب از اورنگ آباد

نذیر (سید نیازی صاحب

نصیر الدین ہاشمی صاحب از پیرس

وہاج الدین صاحب

دنیائے علم وادب

کا

بہترین شاہکار

یعنی رسالہ خضر راہ کا شبلی نمبر منصہ جہان

جس میں

ہندوستان کے مایۂ ناز مصنف علامہ شبلی نعمانی کی حیات طیبہ اور آپ کی علمی خدمات کا تذکرہ کیا جائیگا اور ——— عہد حاضرہ کے مشہور ترین اہل قلم اور فاضل ترین امرء علم وادب کے گرانقدر اور بلند پایہ مضامین زیب صفحات ہوں گے۔

امام الاحرار مولانا ابوالکلام آزاد	مرزا فرحت اللہ بیگ رجسٹرار
فخر ملت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی	شوکت تھانوی، جگر مرادآبادی
صدر الصدور امور مذہبی مولانا حبیب الرحمان خانصاحب شروانی	سیماب اکبرآبادی
سر اقبال،	حامد شاہجہاں پوری
خواجہ حسن نظامی	لسان السند حضرت عزیز لکھنوی
مولانا عبدالماجد بی۔اے دریابادی	لسان القوم حضرت صفی لکھنوی
مولانا ظفر علیخاں صاحب	ظفر الملک صاحب علوی،
مولانا عبداللہ صاحب عمادی	حضرت ریاض خیرآبادی
سید حامد، دہلوی، ملا موزی،	شمس العلماء نواب علی حسن خان صاحب

وغیرہ کے اسماء گرامی اسکی عظمت وفضیلت کی کافی ضمانت ہیں

غرضکہ یہ تمام وہ جواہر بلند پایہ علمی ادبی مضامین پر مشتمل نظموں اور نثر سے مزین ہوگا جو اپنے انسانوں کا بہترین مجموعہ جسکا حجم تقریباً دو سو صفحات ہوگا ماہ مئی ۱۹۳۳ء میں آپ کے پیش نظر کیا جائیگا خواہش مند حضرات مستقل خریداروں مستند دکانداروں اور قومی لائبریریوں کو بالکل مفت "منیجر خضر راہ نیا گاؤں لکھنؤ"

اعلان

امید دے چہ قوم تہ بہ ډیر خوشحالی مقام وی چہ سرے دست پښتو اکیډمی مندرجہ ذیل کتابونہ ډیر خوب صورت او سپین چاپ کښ کړل سوے تہ دے چہ قوم ډ علم دوستی نہ پورہ یقین شے ۔ چہ ہغوئی بہ اکیډمی دکوشش استقبال ہوکړی او زیات زیاتہ بہ ډے چہ حسب المنشا کتابونہ فوآر ډیر راکړی فقط

نام کتاب	قیمت
پښتو فارسی لغات	صہ روپے
" عربی لغات	صہ "
" انجنیری لغات	صہ "
" جرمن ډکشنری	صہ "
" صرف نحو	صہ "
حقیقت الافغانی	۶ "
Pashto-English Grammar	للعہ "

ملنے کا پتہ

پاسبان پښتو اکیډمی کردی سکنہ وڈاکخانہ گردی ضلع پشاور

(صوبہ سرحدی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا سلیم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ۔ڈی

جلد ۱۴ | بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

۱-	ازمنہ وسطیٰ کے بعض ہندو شاعروں پر اسلامی اثر	ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب بی اے (جامعہ) ڈی لٹ (پیرس) ۸۲
۲-	مسئلہ اخلاص	ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی ایچ ڈی استاذ جامعہ عثمانیہ ۱۰۲
۳-	بہائیت	عبدالواحد صاحب متعلم جامعہ ملیہ ۱۱۸
۴-	ریل کی سڑک اور قبرستان	ترجمہ از اسرائیل احمد خانصاحب مدرس نشنل اسکول رنگون ۱۲۹
۵-	واقعی کون تھا سچا شاعر؟	احتشام الدین صاحب ایم اے دہلوی طلبہ جامعہ ۱۴۶
۶-	غزل	حضرت اصغر ۱۴۹
۷-	جنگی بیڑے	۱۵۰
۸-	شذرات	۱۵۳

ازمنہ وسطیٰ کے بعض ہندو شاعروں پر اسلامی اثر

دور سے اور سطحی طور پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام اور ہندو دھرم نے باوجود تقریباً آٹھ سو برس پہلو بہ پہلو رہنے کے ایک دوسرے کا کوئی گہرا اثر نہیں قبول کیا۔ دنیا ان دونوں مذہبوں کے اختلاف کو جانتی ہے۔ دنیا یہ نہیں جانتی کہ ان دونوں مذہبوں کے رسم و خیال کی تاریخ میں ایسی کوششیں بھی ہوئی ہیں، دانستہ اور کبھی غیر دانستہ جن کا منشا ہندو اور مسلمانوں کے خیال و عمل کی زندگی میں ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ ہندوستان کی ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں ان اعتقادی تصوروں کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے جو باہمی ہندوی اسلامی اثر سے پیدا ہوئے اور جنہوں نے بعد میں تحریکوں اور مستقل اداروں کی شکل اختیار کر لی۔ بیشتر اس قسم کے مذہبی رواداری کے خیال شہری زندگی کی خود غرضیوں سے دور گاؤں کے رہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں میں پیدا ہوئے جو آپس میں مل جل کر سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور جن کا تخیل تصنع سے اسی قدر پاک تھا جس طرح کہ اُنکا خلوص بے لاگ تھا۔ شمالی ہند میں اسلام اور ہندو دھرم کی پہلی مڈبھیڑ کے وقت ہمیں بہت سے ایسے ہندو بھگت شاعر ملتے ہیں جن کے خیال اور زندگی کو دیکھنے کے انداز پر اسلامی رنگ کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ شاعر محض شعری نہیں کہتے تھے بلکہ اپنی تعلیم اور زندگی سے ہندو دھرم کی اصلاح بھی کرنا چاہتے تھے۔ ازمنہ وسطیٰ کی مذہبی تحریک بھگتی انہیں شاعروں کی تعلیمات سے عبارت ہے۔ ہم ذیل میں ان شاعروں کا ذکر کرتے ہیں۔

ان میں سے ایک نامدیو ہوئے ہیں۔ انکے بھجن گرنتھ صاحب میں ملتے ہیں۔ بھگت مالا

کے بیان کے مطابق نامدیو پندھارپور ضلع شولاپور میں پیدا ہوئے۔ انکے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ چھیپی (کپڑا چھاپنے کا کام کرنے والے) تھے اور بعض دوسرے بیانوں کے مطابق وہ درزی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ انکی پیدائش اور موت کی کوئی قطعی تاریخ ابتک نہیں معلوم۔ وہ خود ایک جگہ ترکوں کی بت شکنی کا ذکر کرتے ہیں جس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ علاء الدین خلجی کے زمانے میں کسی وقت دکن میں تھے۔ ممکن ہے کہ وہ کبیر داس کے ہمعصر ہوں یا یہ کہ انکے پیرووں میں سے ہوں۔ اس لئے کہ انکی تعلیمات بیشتر وہی ہیں جو کبیر داس کی۔ انکا سماجی زندگی اور روح کے متعلق بھی وہی نقطۂ نظر ہے جو کبیر کا تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ نامدیو کی اندرونی زندگی کی فیصلہ کن تبدیلی اوندا ناگناتھ کے مندر میں واقع ہوئی۔ وہ مندر میں مہاشیوراتری کے دن بیٹھے اپنے بھجن گا رہے تھے۔ چاروں طرف مخلوق جمع تھی۔ ہر کوئی بھجنوں کے خلوص سے متاثر تھا۔ ایک طرف سے کہیں چند برہمن آرہے تھے۔ مندر کے مجاور نے انکے لئے راستہ صاف کرنے کو لوگوں کو مجبوراً تتر بتر کر دیا تاکہ یہ مقدس ہستیاں عوام الناس کی چھوت سے دور رہیں۔ نامدیو پر ان پنچ ذات والوں کی بے بسی کا بڑا اثر ہوا۔ انہوں نے دل میں ٹھانی کہ کسی نہ کسی طرح برہمنوں کے غرور کو نیچا دکھائیں گے۔ سفر سے واپسی پر انہوں نے اپنی زندگی تحریک بھگتی (خلوص وعقیدت) کو عام لوگوں میں پھیلانے کے لئے وقف کر دی وہ اپنے شخصی خدا کو وٹھوبا یا وٹھل کے نام سے پکارتے ہیں اور برہمنی ذہنی علوم کے خلاف عقیدہ کو نجات کا بہترین ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ کبیر کی طرح انہوں نے بھی ذات پات کی امتیازات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ نہایت بلند آہنگی سے بت پرستی کی ان لفظوں میں برائی کرتے ہیں۔

آنیلے کمبھ بھرے لے اوک ٹھاکر کو اشنان کراؤں
بیالیس لکھ جل میں ہوتے بچھو بھیلا کاٹے کراؤں
آنیلے پھول پروی لے مالا ٹھاکر کی ہوں پوج کراؤں

پہلے باسولے ہے بھورا بیٹھلا بھیلا کانی کراؤں
کنیلے دودھری دہی سے کھیر ٹھاکر کو نیوید کراؤں
پہلے دودھ ہو بٹاریو پھرے بچھلو کائے کراؤں
اپنے بچھل او بے بچھل بو سنا رو نا ہیں

(میں بت کو اشنان کرانے کے لئے ایک برتن میں پانی بھر کے لاتا ہوں۔ پانی میں بیا لیس لاکھ جانیں ہیں۔ اے بھائی! میں بچھل (خدا) کے لئے کیا کروں؟ میں بت کے لئے پھول لاتا ہوں اور ہار پروتا ہوں تاکہ پوجا کے وقت اسے چڑھاؤں۔ بھونرے نے پہلے ہی پھولوں کی خوشبو اڑالی۔ اے بھائی! میں بچھل کے لئے کیا کروں؟ میں دودھ لاتا ہوں۔ کھیر بناتا ہوں تاکہ بت کے سامنے پیش کروں۔ بھڑے نے پہلے ہی دودھ کو جھاڑ دیا۔ اے بھائی! میں بچھل کے لئے کیا کروں؟۔ خدا یہاں بھی ہے خدا وہاں بھی ہے۔ بغیر خدا کے دنیا نہیں قائم رہ سکتی)

دوسرے موقع پر نامدیو بت پرستی کے متعلق یوں کہتے ہیں:

ایکے پاتھر کیجے بھاؤ — دوجے پاتھر دھرے پاؤ
جو اہو دیو تو اوہو بھی دیوا — کہی نامدیو ہم ہری کے سیوا

(ایک پتھر کو لوگ پوجتے ہیں اور دوسرے پر پاؤں دھرتے ہیں۔ اگر ایک ہے تو دوسرا بھی خدا ہوا۔ نامدیو کہتا ہے کہ میں تو ہری کی سیوا کرتا ہوں)

اسلام اور ہندو دھرم کے امتزاج کا خیال بھی کبیر کی طرح نامدیو کی شاعری میں پایا جاتا ہے وہ نہایت بے تکلفی سے عربی فارسی الفاظ ہندی تلفظ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

میں گریب میں مسکین تیرا نام ہے ادھارا
کریما رحیما اللہ تو گنی
دریاؤ تو دھنہ تو بسیار تو دھنی
دوجا نہی ایک تو دیگر کوئی نہیں

تم دانا توں بینا میں بچارا کیا کری
ہندو اندھا ترکو کانا
وہن تے گیانی سیانا
ہندو پوجے دھرا مسلمان مسیت(۱)
نامے سوئی سیوا جہان دھرا نہ پرت

ذات پات کی تمیز انکے نزدیک بیکار ہے۔ زندگی کی نجات وہ اعتقاد میں سمجھتے ہیں۔

کہا کرد جاتی کہا کرد پاتی
رام کو نام جپو دن راتی

تیرتھ کی بے معنی رسوم کے متعلق نامدیو کی رائے سنئے:

گنگا جاؤ گودا وری جائے تے
کیجھی(۲) جاؤ کیدار ناہیو
گومتی کہس گودانو کیجے
کوڑی جو تیرتھ کرے
تتو جو ہوائے گارے
(رام نام سری تو نہ پوجے

(تم گنگا اور گوداوری کو تیرتھ کرنے جاتے ہو۔ کیدار ناتھ ہر بار ہویں سال نہانے جاتے ہو گومتی کے لئے ہزار گائیں دان کرتے ہو۔ چاہے تم ایک کروڑ تیرتھ کرو، چاہے تم اپنے جسم کو ہمالیہ میں (برف میں) گاڑ دو۔ لیکن یہ سب کچھ رام کے نام کی پرستش کے لئے ناکافی ہے)

نامدیو کبیر(۲) کی طرح انسان دوست (humanist) ہیں وہ انسانی خلوص

---

(۱) مسجد

(۲) ملاحظہ ہو ہمارا مضمون "کبیر داس اور انکی شاعری" رسالہ اردو۔ جنوری ۱۹۳۲ء

گہرائیوں کو رسم و آئین کے معیار سے نہیں جانچنا چاہئے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا میں تمام جگہ انسان دوستی کے مشرب نے بشریت کے احترام کو مذہبوں اور قانونوں سے بالاتر سمجھا ہے اور انسانی شخصیت کے حقوق کو برقرار رکھنے کے لئے رسوم کی سخت گیریوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے اس قسم کے انسان دوستی کے مشرب اکثر و مختلف شائستگیوں کے آپس میں ملنے سے وجود میں آتے ہیں۔ شائستگیوں کے ملاپ سے افراد جو مدتوں کے جامعتی رویہ اور چلن سے اپنی ذاتی شخصیت کھو بیٹھے ہیں، از سر نو بیدار ہوتے ہیں اور پھر سے اپنا کھویا ہوا اعتماد حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ انسان دوستی (humanism) کی تحریک ہندوستان کی ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں مسلمانوں کی رہین منت ہے۔

نامدیو کا خطاب کبیر کی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں سے ہے۔ وہ ایک جگہ کس سادگی سے اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ مسجد کا وجود عبادت کے لئے ضروری نہیں۔ انسانی خلوص درد دیوار اور اینٹ گارے کا شرمندۂ احسان کیوں ہو؟

دیہی ہیجدی من مولانا
سیج نیاج گجارے

(جسم مسجد ہے۔ دل مولانا ہے۔ جب یوں ہو تو نیاز گذارنا کیسا آسان ہے)

نامدیو کے خیال کی گہرائیوں میں ہندوی ہمہ اوستی تصوف کی صاف جھلک نظر آتی ہے۔ وہ ایک خدا کو پوجتے ہیں لیکن انکا خدا متصوفانہ داخل و ساری (immanent) خدا ہے۔

آپن دیو دھرا آپن آپ لگاوے پوجا
جل تے ترنگ تے ہے جل کہو سنن کو دوجا
آپہی گاوے آپہی ناچے آپ بجاوے تورا
کہت نامدیو تو میرو ٹھاکر جن اورا تو پورا

(وہ خود بت ہے خود مندر ہے۔ خود اپنی پوجا آپ کرتا ہے۔ پانی سے لہر بنتی ہے اور لہر خود

پانی ہے ۔ یہ بس کہنے سننے کو دو الگ چیزیں ہیں۔ وہ خود ہی گاتا ہے، ناچتا ہے اور آپ ہی مجیرے بجاتا ہے ۔ نامدیو کہتا ہے کہ تو میرا آقا ہے ۔ آدمی میں کچھ بھی نہیں ۔ تو مکمل ہے ۔

پندرہویں صدی عیسوی میں ایک ہندو صوفی دھرم داس ہوئے ہیں ۔ انکے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کبیر کے شاگردوں میں ہیں ۔ یہ بھی اعلیٰ ذات کے آدمی نہیں۔ انکے خاندان ریوا کے کسودن بنیوں میں سے تھا ۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ پندرہویں سولہویں صدی کے بیشتر ہندی صوفی بھگت نیچی ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں ایسی اور مثالیں اس کثرت اور تواتر سے کسی اور عہد میں نہیں ملتیں ۔ اس کی وجہ سوائے اسلامی اثر کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ اسلام کا وجود بجائے خود ہندوستان میں ذات پات کے خلاف ایک مستقل پروپگنڈے کا حکم رکھتا ہوگا اس لئے اس بات پر کوئی تعجب نہیں کہ اسلام کے ہندوستان میں آنے کے فوراً ہی بعد اس ملک کے تمام حصوں میں اور خصوصاً شمال میں جہاں اسلامی قوت سیاسی اور معاشرتی ، زیادہ زوردار تھی ، ایسے مفکر پیدا ہوئے جنہوں نے اسلامی خیال اور شائستگی کا اثر جذب کرنے کے بعد ہندو دھرم کی برائیوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ۔ دھرم داس بھی اور بھگت مصلحوں کی طرح اپنے پیام کو شاعری کی زبان سے لوگوں تک پہنچاتے ہیں ۔ ہم انکی شاعری کے بعض نمونے یہاں پیش کرتے ہیں :۔

واکرتا کو سیئے جن ترشٹی اُپجائے
کوٹن برہما وید پڑھی پڑھی جنا گنوائے
کوٹن وشنو ہوئی گئے کوئی پار نہ پائے

(اس خدا کی پرستش کرنی چاہئے جس نے دنیا پیدا کی ۔ کروڑوں برہمن وید پڑھ پڑھ کر اپنی جان کھو دیتے ہیں ۔ کروڑوں وشنو کو مانتے ہیں لیکن کوئی بھی پار نہیں ہوتا ۔

تیرتھ اور دوسری مذہبی رسموں کے متعلق بھی دھرم داس کی رائے سنئے ۔

تیرتھ گئے کوئی نا تیرے چلی چلی مر جائے

جل بچ آس لگائی کے مگر تن پاسے۔
جھوٹے پنڈت وید پڑھی پڑھی جگ بھرمائے
اُنکے پرکھا مری گئے ان کو وہ ناجیائی
کہہ کبیر دھرم داس سے ہنسا سبھائی

(جو نیر تھ کے لئے چلتے چلتے مرجاتے ہیں وہ تیرے نہیں۔ انکی امیدوں کی بنا پانی ہے۔ یہ مگرمچھ کا دوسرا جنم لیں گے۔ جھوٹے پنڈتوں نے وید پڑھ پڑھ کر دنیا کو دھوکے میں ڈالا ہے۔ انکے جو بزرگ مرگئے انہیں (تیرتھوں) سے زندہ کیوں نہیں کر لیتے؟ کبیر نے دھرم داس کو ہنس[1] یوں سمجھایا ہے۔

دھرم داس اپنے گرو کبیر کے متعلق ان لفظوں میں ذکر کرتے ہیں:

میرے من بسی گئے صاحب کبیر
ہندو کے تم گرو کراؤ مسلمان کے پیر
دو دین سے جھگڑا مانڈیو پیو نہیں سریر
شیل سنتوش دیا کے ساگر پریم پرتیت متی دھیر
وید کتیب میٹ کے آگر دو دین کے پیر
بڑے سنتن ہٹکری اکشرا مرسریر
دھرم داس کی بنو گوسائیں ناؤ لگا دے تیر

(میرے دل میں کبیر صاحب سما گئے ہیں۔ تم (کبیر) ہندوؤں کے گرو ہو اور مسلمانوں کے پیر ہو۔ دونوں مذہب ایک دوسرے سے لڑتے رہے اور انہیں تمہارا بھید نہیں ملا[2]۔ تم

---

(۱) بھگت شاعروں کے ہاں "ہنس" روح کے لئے استعمال ہوا ہے۔ کبیر جب روح کا ذکر کرتے ہیں تو ہنس کی تمثیل استعمال کرتے ہیں۔

(۲) اشارہ ہے کبیر کی موت کی طرف۔ ہندو جلانا اور مسلمان دفن کرنا چاہتے تھے۔ اسی بات پر ہندو مسلم فساد ہوا کہتے ہیں کہ لاش غائب ہو گئی۔ کچھ پھول ملے جنہیں ہندوؤں نے جلایا اور مسلمانوں نے دفن کیا۔ یہ دیسے

شناس، لطف وکرم، مہر و محبت، علم و عقل کے سمندر ہو۔ تم وید قرآن پر حاوی ہو اور دونوں مذہبوں کے پیر ہو۔ تم بڑے بڑے اولیا کے دوست ہو۔ تمہارا جسم ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ اے میرے آقا! دھرم داس کو پاک کر دو اور اس کی کشتی کو پار لگا دو)

ایک اور بھگت شاعر چار تھے۔ انکا نام رائے داس ہے۔ یہ رامانند کے شاگردوں میں سے تھے۔ اور اس لئے کبیر کے پیر بھائی ہوئے۔ یہ اپنی عوامی زبان میں تعلیم و تلقین کرتے تھے۔ انکے ہاں اسلامی رنگ کی جھلک ذرا اور زیادہ صاف نظر آتی ہے۔ یہ بھی ہندوؤں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ اور اس لئے بے معنی رسوم کی تنقید میں یہ ذرا سا بھی جھجکتے نہیں۔ کہتے ہیں:

کہا بھیو جے چرن پکھارے جو لو تو انہ چھینے
کہا بھیو جو مونڈ منڈائے کہا تیرتھ برتا کینے

(پیر دھونے سے کیا فائدہ جب تک کہ اس ذات کا خیال نہ کیا جائے۔ سر منڈانے سے کیا فائدہ اور تیرتھ اور روزوں میں کیا رکھا ہے؟)

دیگر

تھوتھی کایا تھوتھی مایا تھوتھی ہری بن جنم گنوایا
تھوتھی پنڈت تھوتھی بانی تھوتھی ہری بن سب کہانی
تھوتھی مندر بھوگ بلاسا تھوتھی آن دیوا کی آسا

(جسم خالی (بیکار) ہے، مایا (دنیا) خالی ہے۔ زندگی بغیر ہری کے خالی ہے اور گم ہے پنڈت اور اسکے وعظ خالی ہیں۔ بغیر ہری کے سب کہانیاں خالی ہیں۔ مندر خالی ہے اور عیش و طرب خالی ہے۔ کسی دوسرے خدا میں[1] (سوائے خدا کے) امید رکھنا خالی ہے)

تو ایک عوامی اور ناقابل یقین روایت ہی لیکن اسکی گہرائیوں میں ہماری قومی زندگی کا ایک بڑا اہم مسئلہ پوشیدہ ہے جس کا کوئی حل اب تک نہ مل سکا۔ عوامی تخیل بڑی بڑی حقیقتوں کو یوں ہی سیدھی سادی روایتوں میں بیان کرنے کا عادی ہے۔

(۱) الا اللہ

اپنی نیچی ذات کا وہ ایک جگہ یوں ذکر کرتے ہیں:-

ناگر جنم میری جاتی بکھیات چارن
رِدے رام گوبند گن سارن
سرسری سلل کرت بارونی
اے سنت جن کرت نہیں پانن
سورا پاوتر نتا اور اجل
اے سرسری ملت نہیں ہوئے آنن

(اے شہر کے رہنے والو! میری ذات پات مشہور ہے۔ میں چار ہوں۔ میرے دل میں رام اور گوونند تمام صفات کی روح بنکر رہتے ہیں۔ اگر شراب گنگا کے پانی سے ملا کر بنائی جائے تو بھی نیک لوگ اسے نہیں پیتے۔ شراب ناپاک ہے۔ اور دوسرا پانی ملنے سے بھی ناپاک ہستی ہے لیکن بہتی گنگا کے پانی میں اگر شراب ڈالدی جائے تو وہ ناپاک نہیں ہوتا)

دوسری جگہ کہتے ہیں:

برہمن ویش شدر ارو کھتری
ڈوم چنڈار ملیچھ من سوئی
ہوئی پُنیت بھگونت بھجن تے
آپو تاری تارے کُل دونی

(برہمن، ویش، شدر، کھتری، ڈوم، چنڈال اور ملیچھ[1] سب کی ایک روح ہے۔ اعتقاد وعبادت سے جو پاک ہو جائے بس وہی خود کو اور اپنے خاندان کو پار لگا سکتا ہے)

---

(۱) مدتوں تک برہمن مسلمانوں کو ملیچھ یعنی "ناپاک اجنبی" کے لفظ سے یاد کرتے تھے۔ مسلمانوں کی تخصیص نہیں۔ یونانی اور سیتھین قبائل بھی اس وقت تک قدیم ہندی کتابوں میں اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں جب تک کہ وہ ہندویت میں بالکل جذب نہ ہو گئے۔

مانے داس کو یہ فخر حاصل ہے کہ اسے رانی میرا بائی جیسا شاگرد ملا۔ میرا بائی والی مارواڑ دودھا راؤ کی پوتی تھیں۔ میرتھ دیا کے شاہی خاندان میں سنگھا جی کے بیٹے بھوج راج سے انکی شادی ہوئی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ میرا بائی کی تلسی داس اور بادشاہ اکبر سے بھی خط و کتابت تھی اور ایک مرتبہ خود اکبر مع تان سین میرا بائی سے ملنے کے لئے بادنوار آیا تھا۔ اگرچہ تاریخی ثبوت اس واقع کی تصدیق میں موجود نہیں لیکن ممکن ہے کہ اس عوامی روایت میں تھوڑی بہت صحت ہو۔ اکبر کے لئے جو خود ایک ایسا مذہب بنانا چاہتا تھا کہ جو اسلام اور ہندو دھرم دونوں کے عناصر پر مبنی ہو یقیناً میرا بائی سے ملنے میں ایک خاص دلچسپی ہو گی۔

میرا بائی بھی دوسرے بھگت شاعروں کی طرح انسان دوستی کے مشرب کو بطور اپنے مذہب اور روحانی ہدایت کے سمجھتی تھی۔ اس کی بھگتی کا قبلہ مقصود، بخلاف کبیر، دھرم داس اور رائے داس کے جو رام پر اعتقاد رکھتے تھے، سری کرشن تھے۔ وہ سری کرشن کو گردھر گوپال کے لقب سے پکارتی ہے۔ اس کے ہاں خدائے واحد کا تخیل بڑی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے عہد پران کی روایتوں اور بھگتی کی جذباتی اعتقادی تحریک سے علاکر اپنا ایک الگ خدا کا تصور پیدا کر لیا تھا۔ اس کی شاعری میں ایک ایسا اعتقادی جوش ہے جو اس عہد سے پہلے ہندوستانی خیال اور شاعری میں نہیں پایا جاتا۔ ممکن ہے کہ میرا بائی تھوڑی بہت فارسی جانتی ہو کیونکہ ازمنہ وسطیٰ میں فارسی ہندوستانی شائستگی کی زبان تھی اور ہندو امرا کے یہاں بھی اسی زبان میں کارروائی ہوتی تھی۔ وہ فارسی کے الفاظ نہایت بے تکلفی سے استعمال کرتی ہے۔ مثلاً

سب میں مہما تیری دیکھی کدرت(۱) کے کربان
مجھ پر تو پربھو کرپا کیجے بندی اپنی جان

---

(۱) قدرت

(۲) قربان

(ہر چیز میں تیری شان دیکھی۔ میں تیری قدرت کے قربان جاؤں۔ اے میرے پربھو مجھ پر کرم کرو اور اپنی لونڈی سمجھو)

ہندو دھرم کی رسوم کے خلاف وہ کہتی ہے:

اس دیہی کا گرب نہ کرنا مائی میں ملجاسی
کہا بھیو تیرتھ برت کنبھے کھالئے کروٹ کاسی
کہا بھیو ہے بھگوا پہریاں گھر تج بھئے سنیاسی
جوگی ہوا جگتی نہیں جانی اٹی جنم پھراسی

(تیرتھ اور روزوں میں کیا رکھا ہے؟ بھلا بنارس (کاشی) کی طرف کروٹ لیکر سونے سے کیا حاصل؟ اس جسم پر غسل بیکار ہے۔ یہ تو مٹی میں عنقریب ملجائے گا۔ رنگے ہوئے کپڑے پہننے اور گھر بار چھوڑ کے سنیاسی بننے کا کیا نتیجہ؟ لوگ جوگی ہوجاتے ہیں لیکن صحیح جگت (فقیری) سے ناواقف ہیں اور اپنی زندگی کو اتار راستہ چلاتے ہیں)

میرا بائی کی شاعری میں ایک خاص زور اور جوش ہے۔ وہ اپنے عشق کا اظہار اُس زبان میں کرتی ہے جسے یا تو عورتیں جانتی ہیں یا صوفیا۔ مثال کے طور پر ہم چند شعر نقل کرتے ہیں:-

میرے تو گردھر گوپال دوسرا نہ کوئی
دوسرا نہ کوئی سادھو دوسرا نہ کوئی
پریم کا متھنیاں ساتھی بھگتی سے بوئی
گھرت گھرت کاڑی لینھو چھانچ پیو کوئی
آنسواں جل سینچی سینچ پریم بیلی بوئی
اب تو بیل پھیل گئی آنند پھل ہوئی
سنتن ڈگ بیٹھ بیٹھ لوک لاج کھوئی

چھانڑ دی کل کی ریت کیا کری ہے کوئی
آئی میں بھگتی کان بھگت دیکھ موہی
واسی میرا گردھر پربھو تار واب موہی

(میرے تو گردھر گوپال ہیں اور کوئی دوسرا نہیں۔ اور کوئی دوسرا نہیں، ارے بھلے لوگو! اور کوئی دوسرا میرا نہیں۔ محبت کی متھانی سے میں متھتی ہوں اور اس منھانی کو اعتقاد خلوص گھماتے ہیں۔ گھی گھی سارا میں نے لے لیا اب باقی مٹھا جو بچا تو جو چاہے پی لے۔ آنسوؤں کے پانی سے محبت کی بیل کو میں نے جمایا ہے۔ اب بیل پروان چڑھی اور اسکا پھل اعلیٰ خوشی (آنند) ہے نیکوں کی صحبت میں بیٹھ بیٹھکر میں نے دنیا کی شرم وحیا کھو دی۔ ذات پات کی ساری رسمیں چھوڑ دیں۔ بھلا دیکھوں کوئی میرا کیا کرے؟ میں یہاں اپنا خلوص تذرچڑھانے آئی ہوں اور ساری دنیا مجھے دیکھتی ہے۔ اے میرے مالک اپنی لونڈی میرا کو پار اتار دو)

دیگر

ہری میں تو پریم دوانی میرا درد نہ جانو کوئی
سولی اوپر سیج ہماری کس بدھی سونا ہوئی
درد کی ماری بن بن ڈولوں ویدی ملا نہیں کوئی
میرا کے پربھو پیر مٹے گی جب وید ی سانولیا ہوئی

(اے ہری! میں تو محبت کی دیوانی ہوں۔ میرے درد کا حال کسی کو نہیں معلوم۔ میرا بچھونا سولی پر ہے، بھلا میں کیسے سو سکتی ہوں؟ درد کے مارے بنوں میں ماری ماری پھرتی ہوں۔ کوئی اس درد کو دور کرنے والا طبیب نہیں ملا۔ اے میرا کے مالک! میرا کا دکھ تو اسی وقت دور

---

(۱) گردھر بمعنی پہاڑ کو تھامنے والا اور گوپال گڈریے کو کہتے ہیں۔ یہ دونوں لفظ سری کرشن جی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

ہوگا جب سانوے رنگ والا اسکا طبیب ہوگا)

انہیں بھگت شاعروں کے سلسلہ میں ایک دادو دیال ہوئے ہیں کبیر کے بعد انکا اثر سب سے زیادہ گہرا اور پھیلا ہوا ہے۔ ان کی تعلیمات کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے اسلام اور ہندو دھرم کے بہترین روحانی عناصر کو ملا کر ایک اعتقادی نصب العین اپنے دیس والوں کے لئے پیش کیا۔ انکے ماننے والے آجتک راجپوتانے اور وسط ہند میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ دادو پنتھی کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ دادو دیال نے گجراتی، مارواڑی، ہندی اور فارسی میں شعر کہے ہیں۔ دادو دیال کے مذہبی اصول میں کوئی نئی بات نہیں ملتی۔ انسان اور خدا کے متعلق انکے خیالات بالکل وہی ہیں جو کبیر کے تھے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستان میں ازمنہ وسطےٰ کی پوری اعتقادی تحریک کا مبدا کبیر اور اسکی تعلیمات ہیں۔ کبیر کا وجود اس عہد کے خیال اور مذہب کی تاریخ میں مرکزی صورت رکھتا ہے۔

دادو دیال کی تعلیمات کا خلاصہ اچ اچ ولسن نے ان لفظوں میں دیا ہے:

"اُس کو قبلۂ توجہ بناؤ جس نے سب کچھ پیدا کیا۔ پنڈت اور قاضی پاگل ہیں۔ انہوں نے جو کتابوں کا ڈھیر جمع کیا ہے اس سے کیا حاصل؟ ویدوں کو پڑھنے میں اپنی زندگی مت برباد کرو[1]"

دادو دیال بلا واسطہ طور پر اپنے مشن کا روحانی تعلق کبیر سے یوں بتاتے ہیں:-

کبیر بچارہ کہی گیا بہت بھانتی سمجھائے
دادو دنیا باوری تا کے سنگ نہ جائے

(کبیر بچارہ نے طرح طرح سے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اے دادو! دنیا

---

(۱) "دی ریلیجن آف دی ہندوز"، صفحہ ۱۹۲

بولی ہے اس کے ساتھ نہیں چلتی)

معلوم ہوتا ہے دادو نے مسلمان صوفیوں کے ساتھ اچھا خاصہ وقت گذارا۔ وہ صوفیوں کے اصطلاحی لفظ بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں:

اللہ تیرا ذکر فکر کرتے ہیں۔
عاشک مشاک تیرے ترس ترس مرتے ہیں
ملک سیش دگرنیس بیٹھے دن بھرتے ہیں۔
دایم دربار تیرے گیر محل ڈرتے ہیں
تن شہید من شہید رات دن لڑتے ہیں
گیان تیرا دھیان تیرا عشق آگ جلتے ہیں
جان تیرا جند تیرا پاؤں سر دھرتے ہیں
دادو دیوان تیرا زرشہ یہ گھر کے ہیں

دیگر

دادو میں ہی میرا عرس میں ہی میرا تھان
میں ہوں میرو ٹھور میں آپ کہے رحمٰن

دیگر

نور ہی کا دھرم نور ہی کا گھر
نور ہی کا بار و میرا
نور ہی کا میلا نور ہی کا شیلا
نور اکیلا
نور ہی منجھی بسیرا
نور ہی کا انگ

ہوگا جب سانوے رنگ والا اسکا طبیب ہوگا)

انہیں بھگت شاعروں کے سلسلہ میں ایک دادو دیال ہوئے ہیں کبیر کے بعد انکا اثر سب سے زیادہ گہرا اور پھیلا ہوا ہے۔ ان کی تعلیمات کی بھی یہ خصوصیت ہو کہ انہوں نے اسلام اور ہندو دھرم کے بہترین روحانی عناصر کو ملا کر ایک اعتقادی نصب العین اپنے دیس والوں کے لئے پیش کیا۔ انکے ماننے والے آجتک راجپوتانے اور وسط ہند میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ دادو پنتھی کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ دادو دیال نے گجراتی، مارواڑی، ہندی اور فارسی میں شعر کہے ہیں۔ دادو دیال کے مذہبی اصول میں کوئی نئی بات نہیں ملتی۔ انسان اور خدا کے متعلق انکے خیالات بالکل وہی ہیں جو کبیر کے تھے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستان میں ازمنہ وسطےٰ کی پوری اعتقادی تحریک کا مبدا کبیر اور اسکی تعلیمات ہیں۔ کبیر کا وجود اس عہد کے خیال اور مذہب کی تاریخ میں مرکزی صورت رکھتا ہے۔

دادو دیال کی تعلیمات کا خلاصہ ایچ ایچ ولسن نے ان لفظوں میں دیا ہے:

"اُس کو قبلۂ توجہ بناؤ جس نے سب کچھ پیدا کیا۔ پنڈت اور قاضی پاگل ہیں۔ انہوں نے جو کتابوں کا ڈھیر جمع کیا ہے اس سے کیا حاصل؟ ویدوں کو پڑھنے میں اپنی زندگی مت برباد کرو[1]"

دادو دیال بلا واسطہ طور پر اپنے مشن کا روحانی تعلق کبیر سے یوں بتاتے ہیں:-

کبیر بچارہ کہی گیا بہت بھانتی سمجھائے
دادو دنیا باوری تا کے سنگ نہ جائے

(کبیر بچارہ نے طرح طرح سے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اے دادو! دنیا

---

(۱) "دی ریلیجن آف دی ہندوز"، صفحہ ۱۹۲

بولی ہے اس کے ساتھ نہیں چلتی)

معلوم ہوتا ہے داؤد نے مسلمان صوفیوں کے ساتھ اچھا خاصہ وقت گذارا۔ وہ صوفیوں کے اصطلاحی لفظ بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں:

اللہ تیرا ذکر فکر کرتے ہیں۔
عاشک مشتاک تیرے ترس ترس مرتے ہیں
ملک سیش دگرنیس بیٹھے دن بھرتے ہیں۔
دایم دربار تیرے گیر محل ڈرتے ہیں
تن شہید من شہید رات دن لڑتے ہیں
گیان تیرا دھیان تیرا عشق آگ جلتے ہیں
جان تیرا چند تیرا پاؤں سر دھرتے ہیں
داؤد دیوان تیرا زرشہ یہ گھر کے ہیں

دیگر

داؤد میں ہی میرا عرس میں ہی میرا تھان
میں ہوں میرو ٹھور میں آپ کے رحمٰن

دیگر

نورہی کا دھرم نورہی کا گھر
نورہی کا بار و میرا
نورہی کا میلا نورہی کا شیلا
نورا کیلا
نورہی منجھی بسیرا
نورہی کا انگ

نور ہی کا سنگ
نور ہی کا رنگ میرا[1]
نور ہی راتا نور ہی ماتا
نور ہی شاتا دادو تیرا

دیگر

دادو الکھ اللہ کا کہو کیسا ہے نور
بے حدو اکو حد نہیں سکل رہا بھرپور

(اے دادو! ان دیکھے اللہ کا ذکر کرو۔ اسکا نور کیسا ہے؟ وہ بے حد ہے۔ اسکی کوئی حد نہیں۔ وہ ہمیشہ بھرپور قایم رہتا ہے)

دادو کے ہاں کبیر کی طرح خدا کی وحدانیت کا تخیل بالکل متعین ہے: مثلاً

انتر جامی ایک تو آتم کے آدھار
جو تم چھوڑو ہاتھ تے کون سنوارھار

(اندرونی (یعنی روحانی) زندگی کو بس تو ہی اکیلا درست کرنے والا ہے۔ تو ہی روح کی ڈھارس ہے۔ اگر تو اپنا مدد کا ہاتھ چھڑا لے تو مجھے اور کون سہارا دے سکے گا؟)

دیگر

راکھن ہارا ایک تو مارن ہارا انیک
دادو کو دوا نہیں تون ہی آپ ہی دیکھ

(تو ایک اکیلا ہی حفاظت کرنے والا ہے۔ مارنے والے بے گنتی ہیں۔ دادو کے لئے اور کوئی دوسرا نہیں ہے۔ تو خود دیکھ)

---

(۱) صبغۃ اللہ۔ بالکل اسلامی اور سامی خیال ہے۔ اسلام سے پہلے ہندوی مذہبی خیال اس سے ناآشنا تھا۔

دیگر

دادو یہ تن پنجرا ماہیں من سودا
ایک ناؤں اللہ کا پڑھی جاپھی ہو دا

(اے دادو! یہ تن ایک پنجرا ہے جس میں دل ایک طوطے کی طرح قید ہے۔ یہ دل ایک اللہ کا نام پڑھ پڑھ کے اسکا حافظ ہو گیا ہے)

دیگر

صاحب میرا پڑا صاحب میرا کھان
سو صاحب سرتاج ہے صاحب پنڈ پران

(صاحب (اللہ) ہی میرا لباس ہے۔ صاحب ہی میری خوراک ہے۔ وہی صاحب میرا سرتاج ہے اور میرا بدن اور روح بھی وہی ہے)

دیگر

سوئی گیانی سوئی جگما سوئی صوفی سوئی سیش
سوئی سنیاسی سے بڑے دادو ایک ایش
سوئی کاجی سوئی ملا سوی مومن مسلمان
سوئی سیانے ست بھلے جے جاتے رحمٰن
رام نام کو بانجیا بیٹھے تاپے مڈیا ہاٹ
سائیں سیو دا کرنے دادو شولی کپاٹ

(وہی عالم ہے۔ وہی اصلی سادھو ہے۔ وہی صوفی اور شیخ ہے۔ وہی سنیاسی سے بڑا ہے جو اے دادو ایک خدا کی تشریح کرے۔ وہی قاضی اور ملا ہے، وہی مومن اور مسلمان ہے۔ وہی عاقل اور سچا ہے جو رحمٰن سے محبت رکھے۔ میں نے رام کے نام کی تجارت کر رکھی ہے اور ایک ہاٹ جما رکھا ہے۔ سائیں سے سودا کرنے میں دادو نے (دل کے یا دکان کے) دروازوں

کے پاٹ کھول دیئے ہیں۔

دادو دیدار الٰہی کو صوفیوں کی طرح اپنی زندگی کی نجات سمجھتے ہیں:۔

دین دُنی صدکے کردن دیکھن دے دیدار
تن من چھین کردن بہشت دوجگ بھی وار

(میں دین اور دنیا دونوں صدقہ کرتا ہوں۔ مجھے اپنا دیدار دیکھنے دے۔ تن من اور جنت دونوں سب (اس دیدار کی خاطر قربان)

ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی رسموں کے اختلاف پر اور اس اہمیت پر جو اس اختلاف کو دیدیجاتی ہے۔ دادو بہت افسردہ خاطر ہوکر یوں کہتے ہیں:

ہندو ترک نہ جانو دوئی
سائیں سبنی کا سوئی ہوئی
اور نہ دوجا دیکھوں کوئی
کوئی رام کوئی اللہ سناوی
پنی اللہ رام کا بھید نہ پاوی
کوئی ہندو کوئی ترک کری مانی
پنی ہندو ترک کی کھبری نہ جانی
دادو دیکھی آتم ایک
کہیا سینیا انت انیک[1]

(ہندو اور ترک (مسلمان) دونوں ناواقف ہیں۔ خدا سب کا ایک ہی ہے مجھے دوسرا

---

(۱) "دادو دیال کا شبد" صفحہ ۱۴۷۔ ہم نے دادو کے سب دوہے اور شبد اس کتاب یا "دادو دیال کی بانی" ہردو مطبوعہ ناگری پرچارنی سبھا سے لئے ہیں۔

خدا نہیں دکھائی دیتا۔ کوئی اللہ کہتا ہے اور کوئی رام کہتا ہے لیکن رام کا اصلی بھید انہیں نہیں معلوم۔ کوئی اپنے کو ہندو کہتا ہے اور کوئی ترک لیکن یہ سب ہندو اور ترک بننے کے راز سے بے خبر ہیں۔ داود کو تو ہر جگہ بس ایک روح مطلق نظر آتی ہے اور وہ اُسی ابدی ایک کا ذکر کرتا سُنتا ہے)

اُسے ہندو کے بُت سے بھی اتنی ہی کم دلچسپی ہے جتنی کہ مسلمان کی مسجد سے اس لئے کہ وہ بقول غالب دونوں کو راہ شوق میں تھکے ہوؤں اور پست ہمتوں کی پناہیں سمجھتا ہے۔ (۱) کہتا ہے:-

ہندو لاگے دیو ہرا مسلمان مہجتی
ہم لاگے ایک الکھ سون سدا نرنر پرتی

(ہندو بت پوجتا ہے۔ مسلمان مسجد میں عبادت کرتا ہے۔ ہم ایک ان دیکھے سے تعلق رکھتے ہیں جس کی محبت میں ابدیت ہے)

وحدانیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی؟

اوپر کے صفحوں میں ازمنہ وسطیٰ کی عوامی مذہبی تحریک کے مصلح شاعروں کا سرسری ذکر کیا گیا ہے۔ ان شاعروں کی تاریخ پیدائش و وفات کی صحیح تعیین اس قدر مشکل ہے جتنی کہ اُن کے کلام کی لسانیاتی تنقید۔ بعض دفعہ ایک ہی شاعر کی طرف مختلف عہدوں کی زبان منسوب کی گئی ہے۔ ہوا اصل میں یہ ہے، جیسا کہ اور دوسری جگہ بھی ہوا ہے، کہ بعد کی آنے والی

---

(۱) دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں
(نسخۂ حمیدیہ)

نسلوں نے نام سے فائدہ اٹھانے کے لئے اور خود اپنی باتوں کو موثر بنانے کے لئے اپنے متقدمین کی طرف اشعار منسوب کرنے میں کوئی اخلاقی ہرج نہ سمجھا۔ خصوصاً کبیر کے ہاں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ یہ عہد ہمارے مورخ اور ادیب دونوں کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جس قدر اہمیت زیادہ ہے اتنا ہی کم کام اس عہد کی تاریخ و ادب میں کیا گیا ہے۔ اس مذہبی تحریک کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت اسلامی تہذیب و تعلیم کا وہ گہرا اثر ہے جو ہندو خیال اور تمدنی نظاموں پر پڑا۔ سوائے اسلامی اثر کے اور وہ کیا تھا جس کے باعث چودھویں پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں شمالی ہند کا کونا کونا وحدانیت سے بھرے ہوئے گیتوں اور ذات پات کے نظام کے خلاف صدائے احتجاج کے شور سے گونج اٹھا۔ ہم نے جن بھگت شاعروں کا اوپر ذکر کیا انہیں کا روحانی سلسلہ برابر اٹھارہویں صدی عیسوی تک قائم رہا۔ ملوک داس، ہری چند، یاری صاحب (مسلمان بھگت شاعر ہوئے ہیں) دھرنی داس، دریا صاحب بہاری (مسلمان) سب کے سب ایک ہی راگ الاپنے والے تھے۔ ان سب کی تعلیمات وہی ہیں جو کبیر کی اور ان سب کے مخاطب گاؤں کے لوگ تھے۔

یہ سب بھگت شاعر صوفی تھے۔ اور تصوف ایک گہرا انفرادی نفسی تجربہ ہے۔ جو رسم و آئین سے بے نیاز ہے۔ جب وہ ادارہ بننا چاہتا ہے تو اس کے لئے تشکیل لازمی ہے۔ اور تشکیل بغیر رسم و آئین کے ممکن نہیں۔ یہ دیکھکر کچھ تعجب نہیں ہوتا کہ جنہوں نے ذات پات کو مٹانا اپنی تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا تھا انہیں کے پیروؤں نے خود اپنے آپ کو ذات پات کے تنگ دائرہ میں محدود کر دیا اور امتداد زمانے سے اُن کے ہاں بھی سخت گیریوں اور رسوم کی پابندی کو وہی جگہ حاصل ہوگئی جو ہندوؤں کے دوسرے طبقوں میں پہلے سے موجود تھی۔ مجھے اسکا پورا یقین ہے کہ کبیر اور اس کے اسکول

کے دوسرے صوفی مسلکوں کا یہ ہرگز منشا نہ تھا کہ ان کی تعلیم کو سننے اور ماننے والوں کے الگ گروہ بن جائیں۔ یہ سب لوگ انسان دوست تھے اور انسان دوستی کی ذہنی اور روحانی آزادیوں کو ہندو سماج میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ اسلام ان کے خیال و ذہن کے لئے محرک بنا۔ لیکن انکے بس کی بات نہ تھی کہ اپنے پیروؤں کو الگ ذات بننے سے روک سکتے۔ دنیا میں ہر جگہ یہ ہوا ہے کہ خیال اپنی موثری کے لئے تشکیل چاہتا ہے۔ یہی تشکیل ادارہ بن جاتی ہے۔ اداروں کا اصلی خیال سے قریب تر ہونا اُن کے حاملوں کے روحانی اور ذہنی توازن پر مبنی ہے۔ انسانی غرضوں نے اس توازن کو نایاب بنا دیا ہے۔

مسئلہ افلاس ہند

اور

جدید معاشیاتی تحقیقات

(گذشتہ سے پیوستہ)

مسئلہ توازن تجارت اور افلاس ہند

ہمیں معلوم ہو چکا کہ ہندوستانی زرعی پیداوار پر دو صحیح اعتراضات کئے جاتے ہیں اول تو یہ کہ ہندوستانی باوجود استطاعت کے اس قدر دولت ہی پیدا نہیں کرتے جو تمام آبادی کے لئے کافی ہو۔ دوسرے یہ کہ یہاں کی معاشی دولت زیادہ تر متوسط اور ادنیٰ درجہ کی ہوتی ہے اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں دیکھنا ہے کہ مسئلہ توازن تجارت کا تعلق افلاس ہند سے کیا ہے۔

توازن تجارت سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ کسی ملک کی درآمد و برآمد میں توازن رہے یعنی یہ کہ جس قدر قیمت کا مال کسی ملک میں داخل ہو اسی قیمت کا مال ملک کے باہر جائے، فرض کیجئے کہ ایران سے ہر سال بیس کروڑ کا مال جاتا ہے اور سولہ کروڑ کا مال آتا ہے۔ یہ چار کروڑ کی زائد برآمد مروجہ اصول کے مطابق ایران کے لئے "بچت ہے" اسکے حق میں "مفید" ہے لہذا معاشیین اس قسم کی تجارت کو تجارت موافق (Favourable Trade.) کہتے ہیں۔ اگر ایران سولہ کروڑ کا مال دوسرے ممالک کو بھیجے اور دوسرے ممالک سے بیس کروڑ کا مال ایران میں داخل ہو تو یہ تجارت اس کے لئے مضر ہے اور معاشیین اس کو "ناموافق تجارت" سے تعبیر کرتے ہیں ثبوت میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ملکی درآمد و برآمد شخصی آمدنی و اخراجات کے مماثل ہے جس طرح کسی شخص کی آمدنی سے اس کے اخراجات کا زائد ہونا معاشی پسماندگی کی علامت ہے اور آمدنی کا اخراجات سے زائد ہونا ترقی کی نشانی ہے ایسا ہی حال اقوام و ممالک کی درآمد

برآمد کا ہے کیونکہ درآمد برآمد سے بڑھی رہے تو دوسروں سے رقم واجب الوصول ہوتی ہے جو معاشی ترقی کی نشانی ہے لیکن اگر درآمد برآمد سے بڑھی رہے تو ملک کو رقم ادا کرنی پڑتی ہے جو معاشی تنزل کی علامت ہے لہٰذا زاید درآمد افلاس سے اور زائد برآمد دولتمندی سے تعبیر کیجاتی ہے۔ اسی غرض سے کم سے کم مجموعی درآمد اور مجموعی برآمد کی قیمتوں میں توازن مطلوب ہوتا ہے۔

معاشئین سمجھتے رہے ہیں کہ درحقیقت توازن تجارت کا نظریہ صحیح و مکمل ہے لیکن جدید معاشیاتی تحقیقات نے یہ بات واضح کردی ہے کہ نظریہ توازن تجارت صرف محدود معنی میں صحیح ہے اور وہ عام طور پر منطبق نہیں کیا جاسکتا لہٰذا درآمد برآمد سے بڑھی رہے تو یہ ہمیشہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ ملک مفلس ہو رہا ہے اور برآمد درآمد سے بڑھی رہے تو ملک معاشی ترقی کر رہا ہے کیونکہ بسا اوقات درآمد کا برآمد سے کم رہنا زوال کی نشانی ہے اور یہی ہندوستان کا حال ہے۔

ہندوستانی درآمد و برآمد کے اعداد و شمار کا جب مقابلہ کیا جاتا ہے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی تجارت کا رجحان تدریجی اضافۂ برآمد کی طرف ہے جو حسب ذیل اعداد سے عیاں ہے:[1]

سنہ	خالص زاید برآمد	سنہ	خالص زاید برآمد
۱۸۷۰	۸ کروڑ	۱۹۱۷	۳۶ کروڑ
۱۸۸۰	" ۱۴	۱۹۱۹	" ۴۹
۱۹۰۰	" ۶	۱۹۲۳	" ۷۲
۱۹۱۰	" ۴۳	۱۹۲۴	" ۵۳
۱۹۱۳	" ۲۱	۱۹۲۵	" ۹۹

انگریزی حکام، ماہرین سیاسیات اور عام اخبار نویس اس سے (خیالی نظریہ موافق ناموافق توازن تجارت کے بموجب) یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہندوستان امیر ہوتا جارہا ہے اور

---

[1] ماخوذ از Indian Economics مصنفہ بیری اور جاتھر مطبوعہ تاراپور والا ۱۹۲۹ء جلد دوم صفحہ ۲۰۹

سے زاید برآمد کی وجہ سے یہ مفید اور قابل رشک موقع مل رہا ہو کہ دوسروں سے کام کرائے یہی وجہ ہے کہ برطانوی عہدہ دار و سپاہی ہندوستان میں کام انجام دے سکتے ہیں اگر اس کی برآمد اسکی درآمد سے بڑھی نہ ہوتی تو اسے سخت مشکل کا سامنا ہوتا بہرطور ہندوستان کی مثال اس امیر کی سی ہے جس کی آمدنی بتدریج بڑھ رہی ہے اور جیسے جیسے اس کی دولت و آمدنی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے وہ زیادہ نوکر رکھتا ہے، زیادہ کھیل تماشہ دیکھتا ہے، زیادہ خدمات لیتا ہے، غرضکہ بحیثیت مجموعی بہتر زندگی بسر کرتا ہے۔

عام تعلیم یافتہ حضرات کا یہ خیال صحیح ہوتا اگر توازن تجارت کا نظریہ بھی صحیح ہوتا۔ مگر جیسا کہ ہم ابھی ثابت کرنے کی کوشش کرینگے یہ نظریہ قطعی طور پر صحیح نہیں، اور موافق و ناموافق توازن تجارت اور معاشی ترقی و تنزل میں کوئی ربط و تناسب نہیں، لہذا کسی ملک کی مادی بہبودی کا اندازہ کرنے کے لئے توازن تجارت پر کلی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

نظریۂ توازن تجارت کی قطعیت کے خلاف دلائل

فرض کیجئے کہ ہندوستان کا ایک تاجر دس ہزار روپیہ کا مراد آبادی سامان فروخت کی غرض سے جاوا بھیجتا ہے اور ہندوستان کے برآمد کے رجسٹر میں ۱۰۰۰۰ کی رقم درج کیجاتی ہے، اور یہی تاجر اپنے نمائندہ مقیم جاوا کو لکھتا ہے کہ جو کچھ رقم مراد آبادی سامان کے فروخت کرنے سے حاصل ہوا اسکی شکر قم ہندوستان بھیجا دو اس مثال میں بین الاقوامی تجارت کی سہل ترین ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ صرف سہولت تفہیم کی خاطر ہم نے اس سہل ترین صورت کو پیش نظر رکھا ہے۔ حالانکہ درحقیقت تجارت میں بالعموم دو فریق اور اقسام دولت ہی نہیں ہوتے بلکہ مختلف خریدار و فروشندے اور مختلف اقسام دولت ہوا کرتے ہیں۔ بہرطور دنیا کا کاروبار اسی نہج پر چل رہا ہے۔

یہی مراد آبادی سامان جاوا پہنچکر ۱۲۰۰۰ روپیہ کا ہو جاتا ہو کیونکہ تاجر کو سامان کے پیکنگ اور حمل و نقل کے اخراجات اور جاوا کا درآمدی محصول ادا کرنا پڑتا ہے، ان حالات میں دو صورتیں ممکن ہیں :-

اول یہ کہ مراد آبادی سامان کی قسم عمدہ نہ ہونے کے باعث اور سامان خوش وضع اور جاوا والوں کے احتیاجات کے لئے ناموزوں ہونے کے باعث اس کی مانگ جاوا میں زیادہ نہ ہو، اور اس سبب سے مال کسی طرح ۵۰۰۰ سے زیادہ پر نہ بک سکے۔ پس جاوا کے نمائندے نے مجبوراً ۵۰۰۰ کی شکر ہندوستان روانہ کی جو اخراجات حمل ونقل کو ملاکر مراد آباد پہنچنے پر ۶۰۰۰ کی ہوتی اور یہی رقم ہندوستان کے درآمد کے رجسٹر میں داخل کر دی گئی۔

موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۰۰۰۰ کا مال بھیجا گیا اور ۶۰۰۰ کا مال خریدا گیا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ توازن تجارت ہندوستان کے لئے موافق ہے اور نظریہ توازن کے مطابق ہندوستان کو ۴۰۰۰ کی رقم واجب الوصول ہے (کس طرح؟ کس سے؟) اس نظریہ کے حامی کہتے ہیں کہ ہندوستان نے ۱۰۰۰۰ کا مال بیچا اور ۶۰۰۰ کا خریدا، لہٰذا وہ منافع میں رہا مگر ہم کہتے ہیں کہ ہندوستان کو ۱۲۰۰۰ کے مال کے معاوضہ میں صرف ۶۰۰۰ کا مال ملا لہٰذا ہندوستان کو ۶۰۰۰ کا نقصان ہوا۔

اس تبادلۂ دولت کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اسی قدر مراد آبادی سامان عمدہ قسم کا ہونے، خوش وضع اور خوشنما ہونے، اور جاوا والوں کے احتیاجات کے مناسب بنائے جانے کے باعث ۲۰۰۰۰ روپیہ میں بکا اور جاوا والے نمائندے نے مراد آبادی تاجر کو ۲۰۰۰۰ کی شکر بھجوادی اور ہندوستان کے درآمدی رجسٹر میں ۲۰۰۰۰ کی رقم داخل کر دی گئی۔ نتیجہ موازنہ یہ کہ ہندوستان کے حق میں یہ ناموافق تجارت ہے۔ کیونکہ اس مرتبہ ہندوستان نے ۲۰۰۰۰ کا مال منگوایا حالانکہ اس نے صرف ۱۰۰۰۰ کا مال بھیجا تھا یہ زاید درآمد توازن تجارت کے "زریں" اصول کے مطابق ہندوستان کا نقصان ہے مگر جدید معاشیاتی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اس صورت میں ہندوستان کا سراسر نفع ہے کیونکہ ہندوستانی تاجر کو ۱۰۰۰۰ کا سامان بھیجتے وقت ۲۰۰۰ حمل ونقل کے لئے دینے پڑے، اور شکر منگانے کے لئے ۳۰۰۰ اس طرح کل ۵۰۰۰ کا مزید خرچ ہوا مگر ۲۰۰۰۰ کی شکر حاصل ہوئی یعنی ۵۰۰۰ کا منافع ہوا۔ مگر اس نظریہ کے خلاف رائے

کہنے والے، جو اس گہری نظر سے معاشی حقائق کا مطالعہ کرنے سے قاصر ہیں، اور حقیقت معاشیات سے واقف نہیں، یہی گمان کرتے ہیں: درآمد زیادہ برآمد کم نتیجہ معاشی تنزل!!

گویا موافقین نظریۂ توازن تجارت کی منطق کے مطابق اعلیٰ تنظیم، اعلیٰ کارکردگی، عمدہ مذاق اور عمدہ سم سامان ہو تو نتیجہ معاشی تنزل ہوتا ہے اور بدنظمی، ادنیٰ کارکردگی، پھوڑپن، بدمذاقی سے معاشی ترقی حاصل ہوتی ہے!!

نظریہ توازن تجارت کے سراسر ناقابل اعتماد ہونیکے ثبوت میں بہترین مثال یہ پیش کیجاسکتی ہے:- فرض کیجئے کہ وہ جہاز جو مرادآبادی سامان جاوا لیجا رہا تھا کسی وجہ سے غرق ہوجائے ظاہر ہے کہ جاوا والا نمائندہ اس مرتبہ ایک روپیہ کا بھی سامان اپنے مرادآبادی مالک کو نہ بھیج سکیگا۔ نظریہ توازن تجارت کے قائل فوراً اعداد و شمار سے یہ نتیجہ نکال لیں گے کہ برآمد ۰۰۰۰ اور درآمد زیرو۔ ہندوستان کی موافق تجارت یقیناً دس ہزار ہے جو دوسروں سے وصول طلب ہیں (جہاز کے ساتھ سامان بھی غرق ہوگیا تو پھر رقم کس سے اور کیونکر وصول ہو!؟)

جن لوگوں میں فہم عامہ اور وسیع ذہنیت موجود ہے، جن لوگوں کا دماغ سطحی معاشی نظریات سے مرعوب نہیں ہوتا، اور اصول معاشیات کے جاننے کے باوجود حقیقی حالات کے پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہے، جس نے نظریاتی معاشیات پڑھتے پڑھتے ذاتی غور و فکر کی طاقت سلب نہیں ہوگئی ہے۔ وہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ طرز استدلال صحیح نہیں، اور نظریۂ توازن تجارت کسی طرح قطعیت کا دعویدار نہیں ہوسکتا اور موافق و ناموافق توازن تجارت سے کسی ملک کی مرفہ الحالی یا معاشی تنزل کا پتہ نہیں چل سکتا۔

توازن تجارت کی موافقت و ناموافقت کے غلط تصورات اس قدر عام ہیں کہ وہ ماہرین سیاسیات، مصلحان قوم و معاشرت، رہبران سیاست، مقالہ نویسوں، رسالہ نگاروں اور عام پڑھے لکھے اشخاص کے علاوہ خود گروہ معاشیین میں پائے جاتے ہیں چنانچہ معاشیات کی اکثر "مستند" اور جامع کتب میں بھی توازن تجارت کی محدود صلاحیت انطباق (Limited range of

Applicability پر مطلق بحث نہیں ہوتی۔

اس غلطی و غلط فہمی کے اسباب کا پتہ چلانا آسان نہیں اس کے لئے نظریات قدر و قیمت کا بیان کرنا ضروری ہوگا، اور مسئلہ توازن تجارت و مسئلہ زر (توازن وادوستد) کے باہمی تعلقات ظاہر کرنے پڑیں گے۔ اگر مجھ سے یہ کام انجام پاسکے تو بھی یہاں اس کے تذکرہ کا کوئی موقع نہیں۔ مجبوراً اس اجمال پر اکتفا کرتا ہوں کہ توازن تجارت کا مسئلہ اس وجہ سے بھی غلط ہے کہ دار و مدار قیمت اشیاء (بوقت درآمد و برآمد) پر رکھا گیا ہے اور زیادہ تر مقدار زر کا لحاظ کیا جاتا ہے توازن تجارت کے اعداد شمار سے بندرگاہوں پر چیزوں کی جو قیمت ہوتی ہے اُسکا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اُن چیزوں کا کیا حشر ہوتا ہے، آیا وہ کم قیمت پر فروخت ہوتی ہیں، یا زیادہ داموں بکتی ہیں۔ وہ صرف میں آتی بھی ہیں یا یونہی اکارت جاتی ہیں، ان واقعات کا کچھ بھی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ میرے خیال سے توازن تجارت کا نظریہ اس وقت تک قابل اطمینان نہیں ہوسکتا جبتک کہ اس کی بنیاد دولت اور اُس کی اضافی و مطلق قدر پر نہ رکھی جائے۔ اسی طرح درآمد و برآمد کے اعداد ناقابل اعتماد ہیں اور اسپر نظر کرتے ہوئے علم و عمل میں بین اختلافات رہیں گے۔

یہ تو ثابت ہوگیا کہ موافق توازن تجارت بھی ملک کی معاشی تنزل کا سبب ہوسکتا ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہندوستانی تجارت کی حالت کچھ ایسی ہی ہے جو مال ہندوستان سے برآمد ہوتا ہے وہ زیادہ تر متوسط اور ادنیٰ درجہ کا ہوتا ہے، یعنی ہماری تنظیم و کارکردگی ادنےٰ ہونے کے باعث ہمارے مال کی قدر غیر ممالک میں زیادہ نہیں ہوتی اسی وجہ سے ہم بہت سامان کم قیمت میں بیچتے ہیں، اور تھوڑا مال زیادہ قیمت پر خریدتے ہیں جس کی وجہ یہی ہے کہ اُن کی تنظیم و کارکردگی اعلیٰ اور ہماری ادنےٰ ہوتی ہے چونکہ ہم بہ فصل زر خریدتے کم ہیں اور بیچتے زیادہ ہیں (حالانکہ اشیاء کی حقیقی قدر کا لحاظ کرتے ہوئے ہماری چیزیں مقابلۃً بہتر ہوتی ہیں[1]) ہمیں حقیقی

---

[1] یہاں یہ اصولی اعتراض ممکن ہے کہ جس چیز کی قدر زیادہ ہے اس کی قیمت کیونکر کم ہوسکتی ہے اور اسی طرح کم قدر

نقصان ظاہر و منافع کی شکل میں دکھائی دیتا ہے اور ہم اپنی نادانی و لاعلمی میں خوش و خرم ہیں اور "موافق توازن تجارت" کے حقیقی راز سے واقف نہیں۔ شکایت اگر کرتے ہیں تو صرف اس کی کہ ہندوستان میں توازن تجارت قائم نہ ہونے کے باوجود توازن دادوستد قائم ہے اور مالی کاروبار میں کوئی ابتری نہیں ہونے پاتی، وہ زیادہ تر مطالبات وطن کی وجہ سے جس سے ہندوستان پر بہت بڑا بار پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی تجارت کی درآمد سے برآمد اوسطاً بقدر ۶۰ کروڑ سالانہ بڑھی رہتی ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہندوستان کو یہ رقم دوسرے ممالک سے وصول بھی ہوتی ہے۔ کچھ حصہ اس کا تو قدر و قیمت میں تفاوت کے باعث بلاشبہ خود بخود غائب ہو جاتا ہے، اور بقیہ رقم جو واجب الوصول ہوتی ہے، اس کی ادائی نقد رقم کی شکل میں نہیں ہوتی۔ نہ اس قیمت کا مال ہندوستان بھیجا جاتا ہے اور نہ اس کے ذمہ قرض رہتا ہے بلکہ اس رقم کی ادائی خدمات کے ذریعہ کر دی جاتی ہے۔

ہندوستان ہر سال تقریباً ۴۰ کروڑ کا سامان بھیجتا ہے اور ۲۰ کروڑ کے قریب کا سامان درآمد ہوتا ہے جو رقم ہندوستان کو واجب الوصول ہوتی ہے وہ حقیقتاً ادا نہیں کی جاتی بلکہ زیادہ تر "مطالبات وطن" کی مد میں صرف ہو جاتی ہے۔ یہ ہندوستان والوں کی عام شکایت ہے کہ مطالبات وطن ہندوستان پر بیجا بار ہیں۔ اس معرکۃ الآرا مسئلہ کی بحث کا یہاں کوئی موقع نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے جدید معاشیاتی تحقیقات سے جو کچھ روشنی اس مسئلہ پر ڈالی جا سکتی ہے ہمیں صرف اسی کے متعلق تذکرہ کرنا ہے۔[1]

کی چیزیں کیونکر زیادہ قیمت میں بک سکتی ہیں اصولاً یہ بات صحیح ہے مگر عملی تجارتی واقعات سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس طرح ہندوستانی مال کم قیمتوں خریدا جاتا ہے اور وہاں کا مال زاید قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔ زیادہ تر تو "تجارتی چالاکیوں" کا نتیجہ ہے مگر ہندوستانیوں کی لاعلمی، عدم واقفیت، نااتفاقی وغیرہ بھی اہم اسباب ہیں۔

[1] کسی قدر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے (Indian Economics) از جاتھر و دیسری

مطالبات وطن مسئلہ افلاس ہند اور اقسام محنت و دولت

مطالبات وطن کا مسئلہ یعنی یہ کہ وہ جائز ہیں یا ناجائز، مفید ہیں یا مضر اور اگر مفید یا مضر ہیں تو کس حد تک، اُسی وقت بخوبی حل ہو سکیگا جبکہ ہم اقسام دولت و محنت سے بخوبی واقف ہو جائیں۔

اقسام دولت و محنت

عمرانیاتی تحقیقات کے بموجب دولت کی تقسیم اس اعتبار سے کہ انسانی احتیاجات یکساں اہمیت نہیں رکھتے یوں کیجا سکتی ہے کہ اُس قسم کی دولت جو انسانی لازمی احتیاجات (مثلاً بھوک، پیاس، پناہ) کے پورا کرنے کے لئے مستعمل ہو ہم ٹھیٹ معاشی دولت سے تعبیر کریں مثلاً صحت بخش غذا، توانائی پیدا کرنے اور بڑھانے والی غذا، رہنے سہنے کے لئے صاف ستھرے مکان، تن کو دھوپ اور سردی کی تکالیف سے بچانے کے لئے کپڑا، یہ سب چیزیں بقائے حیات و فلاح نسل کے لئے ضروری ہیں لہذا ہم اس قسم کی دولت کو جو انسان کی لابدی ضروریات پورا کرتی ہے ٹھیٹ دولت اور جس محنت سے یہ اشیا تیار ہوتی ہیں قطع نظر اس کے کہ وہ مادی ہوں یا غیر مادی محنت قسم اعلیٰ کہتے ہیں مثلاً عام طور طبیب کی محنت، کسان کی محنت، جلاہے کی محنت، معمار کی محنت، دوم اس قسم کی دولت کو جو انسان کی لابدی و قطعی احتیاجات کو نہیں

طبع Karaphorevala بمبئی ۱۹۲۹ء جلد دوم صفحہ ۳۰۰ تا ۳۱۴ سخت تعجب کی بات ہے کہ اس اہم موضوع پر ابتک انگریزی زبان میں بھی کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی اور نہ نظریہ Drain کو کسی نے ترتیب دینے کی کوشش کی ہے خصوصاً جبکہ مطالبات وطن معاشیات ہند کے سب سے زیادہ بحث طلب مسئلہ Drain پر مبنی ہے نظریہ ڈرین ابتک مکمل طور پر کبھی بھی پیش نہیں کیا گیا۔ وہ کس درجہ نامکمل صورت میں ہے اسکا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ پروفیسر شاہ جیسے محقق معاشیات ہند نے اس کا اندازہ ۲۱۸ (دو سو اٹھارہ!!) کروڑ کا کیا ہے ملاحظہ ہو
Shah and Khambata "The wealth + Taxable Capacity of India تاراپوری والا ۱۹۲۶ء صفحہ ۲۰۳ اور ۲۳۴

بلکہ تمدنی احتیاجات کو پورا کرنے، یعنی بقائے حیات و نسل انسانی کے علاوہ کسی قدر چین و آرام، ترقی و خوشحالی کے لئے ضروری ہوں ہم تمدنی دولت سے تعبیر کرتے ہیں، مثلاً میز کرسی، پلنگ، سائیکل، سینے کی مشین، ادبی کتابیں، سبق آموز اور مہذب دلچسپ ناولیں، شائستہ اخبار، مفید رسالے وغیرہ۔ تمدنی دولت کو پیدا کرنیوالی محنت کو محنت قسم اوسط کہہ سکتے ہیں سوم:۔ دولت کی تیسری قسم وہ ہے جو انسان کی حقیقی یا تمدنی احتیاجات و ضروریات کو نہیں بلکہ انسان کی نفسانی خواہشات کو پورا کرتی ہو۔ یعنی وہ دولت جو عیش و عشرت، نمود و نمائش اور نفس پرستی کے لئے کام آتی ہو۔ مثلاً تمام مشروبات، تمباکو، سگریٹ، زیورات، سونے چاندی کے برتن محض جنسی جذبات کو مشتعل کرنے والے ناول، مضر اخلاق، فضول، لغو خبریں شائع کرنیوالے اخبار اور رسالے، اس قسم کی دولت آسائشی دولت ہے، اور وہ محنت جس سے عیش و عشرت میں کام آنے والی دولت پیدا کیجاتی ہے اسے ہم محنت قسم ادنیٰ کہتے ہیں۔

ٹھیٹ دولت کے متعلق تو کسی کو زیادہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ اس میں کونسی چیزیں داخل کیجانی چاہئیں مگر تمدنی دولت اور شاید آسائشی دولت کے متعلق یہ قطعی طور پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، ساتھ ہی فہم عامہ سے مدد لے کر انسان تمیز و تفریق ضرور کر سکتا ہے مثلاً کسی شخص کے برتن مٹی یا تامچینی کے اور کانٹے چمچے جرمن سلور کے ہوں تو ہم بآسانی اسکو تمدنی دولت تصور کر سکتے ہیں، اور اگر کسی کے ہاں سونے کے برتن، چاندی کی رکابیاں اور نہایت نفیس جوشنما گلاس اور چمچے ہوں تو اس دولت کو بلاشبہ آسائشی دولت میں شمار کرینگے۔

ٹھیٹ دولت، تمدنی دولت، آسائشی دولت اور محنت قسم اعلیٰ اوسط اور ادنیٰ کا مطلب سمجھ جانیکے بعد ہم اس کے چند کلیے بیان کرتے ہیں، جن کا جاننا بھی ضروری ہے، تاکہ مسئلہ افلاس ہند کا ان سے تعلق بھی ظاہر ہو جائے۔

فرض کیجئے کہ افریقہ کے دو گاؤں ہیں جو ایک دوسرے اور باقی دنیا سے بالکل علٰحدہ معاشی زندگی بسر کرتے ہیں۔ پہلے گاؤں میں اگر فرض کیجئے کہ ۱۰۰ میں سے نصف بیکار پڑے

رہتے ہیں اور بقیہ نصف میں سے ۲ محنت قسم ادنیٰ کرنیوالے مثلاً گانے بجانے، ڈھول پیٹنے، منہ پر رنگ کرنے والے، بھانڈ وغیرہ ہیں اور صرف ۲۰ آدمی ملکر کھیتی باڑی اور ضروری کام کاج کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس گاؤں کی مادی بہبودی زیادہ نہیں ہوسکے گی کیونکہ تقسیم کار اقسام محنت کے اعتبار سے صحیح نہیں۔ دوسرے گاؤں میں فرض کیجئے کہ سو میں سے صرف پانچ بیکار رہتے ہیں، پانچ کھیل تماشے، نقالی وغیرہ کرتے ہیں، ۱۰ فیصدی آسائشی دولت مثلاً شراب وغیرہ تیار کرتے ہیں اور پندرہ فیصدی تمدنی دولت پیدا کرنے میں مصروف ہیں، اور بقیہ ۶۵ ٹھیٹ دولت پیدا کرتے ہیں، تو ہم یہ توقع کرینگے کہ اس گاؤں کی مرفہ الحالی زیادہ ہوگی۔

مثال بالا سے حسب ذیل کلیے اخذ کئے جاسکتے ہیں اور انکی تشریح بھی آسان ہے۔

اقسام دولت ومحنت اور مرفہ الحالی کے اصول

(۱) جس قدر جس ملک میں تقسیم کار کا عمل اقسام محنت کے اعتبار سے صحیح ہوگا اسی قدر اس ملک کی مادی بہبودی مستحکم اور دیرپا ہوگی۔

(۲) جس قدر جس ملک میں محنت قسم اعلیٰ کرنیوالے یعنی ٹھیٹ دولت پیدا کرنے والے زیادہ ہوں گے اسی قدر اس ملک کی مرفہ الحالی زیادہ ہوگی۔

(۳) کسی ملک میں اگر ادنیٰ محنت کرنیوالے حد سے زیادہ ہوں گے تو اس ملک کی معاشی زندگی دشوار ہوجائیگی۔

تبادلہ مختلف اقسام دولت کا افلاس ہند پر اثر

مسئلہ افلاس ہند کی تحلیل کے لئے مبادلہ دولت کا سوال نہایت ضروری ہے فرض کیجئے کہ دو گاؤں بلکہ معاشی زندگی بسر کرتے ہیں اور بقیہ عالم سے انکے کوئی تعلقات نہیں۔ ایک گاؤں کے لوگ باقاعدہ محنت ومشقت کرکے ضروری سامان مہیا کرتے ہیں، اور دن دن بھر محنت کرکے دولت پیدا کرتے ہیں، اور دوسرے گاؤں سے ہر روز چار چار پانچ پانچ آدمی آکر کھیل تماشے دکھاتے ہیں چند لوگ آکر گانا گاتے ہیں غرضیکہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ خوش کرکے بہت سا خلہ وغیرہ لیجاتے ہیں پہلے گاؤں والے اس طرح روز کھیل تماشے اور گانے بجانے کو پسند تو کرتے نہیں مگر کمزور طبیعت ہونے کی وجہ سے مستقل مزاج

نہیں ہوتے، اور دوسرے گاؤں والے انکی کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں، گویا اپنی نقصانی خواہشات کو پورا کرنیکے لئے انہیں گودی بھر بھر کے چاول آٹا گیہوں وغیرہ دینا پڑتے ہیں۔

چند روز اور اگر یہی لیل و نہار رہا تو دونوں گاؤں کی معاشی بہبودی میں کیا فرق واقع ہوگا؟ اول الذکر گاؤں کی دولت میں تخفیف ہوگی اور دوسرے گاؤں کی دولت میں اضافہ ہوگا۔ کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ محنت قسم اعلیٰ کا تبادلہ محنت قسم ادنیٰ سے ہوا۔ ایک نے دوسرے کی نقصانی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر علی الاعلان استحصال کیا۔

اسی طرح فرض کیجئے کہ دو گاؤں ہیں، اور دونوں میں کاشت بھی ہوتی ہے مصنوعات بھی تیار کیجاتی ہیں، ایک گاؤں دوسرے گاؤں کو چاول بھیجتا ہے اور اسی قدر قیمت کا گیہوں منگاتا ہے، اسی طرح مصنوعات میں بھی تبادلہ ہوتا ہے اور ایک گاؤں کے لوگ دوسرے گاؤں جاکر اپنے کھیل تماشے اور سرکس کے کرتب دکھاتے ہیں تو دوسرے گاؤں کے لوگ پہلے گاؤں جاکر شعبدے دکھاتے ہیں گانا سناتے ہیں، اس طرح محنت قسم اعلیٰ کا تبادلہ قسم اعلیٰ سے، محنت قسم اوسط کا قسم اوسط سے، محنت قسم ادنیٰ کا قسم ادنیٰ سے ہوتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اس تبادلہ سے دونوں گاؤں میں کسی کی دولت کم نہیں ہوئی۔ بلکہ دونوں کو اس اعتبار سے کہ موافق مبادلہ عمل میں آیا۔ فائدہ ہوا۔

جس طرح ہم نے "دو گاؤں اور دو تین چیزیں فرض کر لی تھیں، اسی طرح ہم کئی فریق اور کئی قسم کی دولت فرض کریں تو ہمارے پیش نظر بین الاقوامی کاروبار کا ایک خاکہ ہو جائے گا۔ نتیجہ ہمیشہ وہی نکلے گا کہ اقسام دولت کے اعتبار سے تبادلہ اس طرح ہونا چاہئے کہ ٹھیٹ دولت کے معاوضہ میں ٹھیٹ دولت دیجائے۔ اگر کمتر قسم کی دولت کے معاوضہ میں ٹھیٹ دیجائیگی تو ٹھیٹ دولت دینے والے کو نقصان ہوگا۔

اقسام دولت و محنت کا مفہوم سمجھ لینے اور انکے تبادلہ کے اثرات سے بخوبی واقف ہو جانے کے بعد ہمیں ان اصول و قوانین کو حالات پر منطبق کر کے دیکھنا ہے کہ افلاس ہند پر انکا کیا اثر پڑتا ہے۔

ہندوستان ہر سال کثیر رقم کی ایسی تمدنی و آسائشی چیزیں بھی منگاتا ہے جس کے معاوضہ میں ظاہر ہے یہاں سے روپیہ پیسہ یا سرکاری نوٹ تو جاتے نہیں بلکہ ٹھیٹ دولت بھیجی جاتی ہے۔ مثلاً ہر سال لکھوکھا روپیہ کی شراب، سگریٹ وغیرہ ہندوستان آتے ہیں، اور ہر سال ہندوستان لکھوکھا روپیہ کا اناج بیرون ہند بھیجنے پر مجبور رہے ہمارے چند گھنٹے تو لطف و سرور میں گذر جاتے ہیں مگر اسکا خمیازہ ہم ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہمارے ہی لوگ قلت غذا کی وجہ سے فاقہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ قومی نقطۂ نظر سے اس تبادلہ سے ہمیں نقصان ہوتا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ اقسام دولت میں فرق تھا۔ اگر یورپی مشروبات کے معاوضہ میں یہاں سے دیسی شراب جاتی تو ظاہر ہے کہ ہندوستانی بازار اناج پر اس تبادلہ کا مطلق اثر نہ پڑتا، نہ تو چیزیں گراں ہو جاتیں اور نہ آبادی پر گرانی کے مضر اثرات پڑتے۔

اسی طرح جب ہندوستانی نواب، راجہ، سیٹھ ساہوکار نمود و نمایش اور عیش و عشرت کے لئے Rolls Royce موٹریں خریدتے ہیں اور جب ہندوستانیوں کو "خوش" کرنے کے لئے کروڑہا فیٹ کی سینما فلس آتی ہیں اور ہزار ہا روپیہ کے ٹپانے آتے ہیں تو ہندوستان سے اسی قدر قیمت کا آسائشی سامان نہیں جاتا بلکہ ہزاروں کپاس کے گٹھے بیرونی ممالک کو روانہ کئے جاتے ہیں۔ دوسروں نے تو کھیل تماشے کر کے نسبتہً تھوڑی محنت و مشقت سے فلمیں تیار کر دیں مگر ہندوستان کو اس کے معاوضے میں قریب قریب اسی قیمت کی خام پیداوار بھجوانی پڑی، جس کے لئے زیادہ محنت اور دردسری کرنی پڑتی ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہوا کہ اقسام دولت میں اہم فرق ہونے کے باعث جو مبادلہ ہوتا ہے وہ ہندوستان کے حق میں سراسر مضر ہے۔

یہاں تک تو درآمدی و برآمدی سامان کے تبادلہ سے ہندوستان کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کا ذکر تھا۔ اب دیکھنا ہے کہ "مطالبات وطن" کے کیا اثرات پڑتے ہیں۔

مطالبات وطن کے ہندوستانی افلاس پر اثرات | مطالبات وطن سے مراد اس معاوضہ سے ہے جو ہندوستان

انگلستان کو انگریزی اصل اور انگریزوں کے حالیہ یا گذشتہ خدمات کے صلہ میں پیش کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سب کا سب حق بجانب ہے یا نہیں ہمارا نظریہ (جس کو میں امید کرتا ہوں کہ میں نے ثابت کر دیا ہے) حسب ذیل ہے :۔

اگر ٹیٹ دولت کا تبادلہ ٹیٹ دولت سے، تمدنی دولت کا تمدنی دولت سے، آسائشی دولت کا آسائشی دولت سے ہوتا رہے تو طرفین کو کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہوگا۔ مگر جب دولت قسم اعلیٰ کا تبادلہ دولت قسم اوسط یا ادنیٰ سے ہو تو آخر الذکر کو فائدہ اور اول الذکر کو نقصان ہوگا، اور جس قدر زیادہ تبادلہ ٹیٹ دولت کا آسائشی دولت سے ہوگا اسی قدر نقصان ٹیٹ دولت دینے والے کو ہوگا۔

ان بدیہات کو تسلیم کر لینے کے بعد غور کر کے دیکھئے کہ افلاس ہند میں کس طرح اضافہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر افواج ہند کو لیجئے :۔ معاشی نقطۂ نظر سے چونکہ امن و امان کا ہونا لازمی ہے اور سرشت بشری کچھ ایسی ہے کہ بغیر فوج و پولیس کے کام نہیں چلتا تو ماننا پڑے گا کہ وہ افواج اور پولیس جو بیرونی اور اندرونی دشمنوں اور بدمعاشوں سے ملک کو محفوظ رکھتے ہیں، ہمارے لئے قطعی ضروری ہیں یعنی یہ کہ وہ لوگ محنت قسم اعلیٰ کرتے ہیں اور اگر ہندوستانی محنت قسم اعلیٰ کر کے ٹیٹ دولت معاوضہ میں دیں تو کوئی مضائقہ نہیں چونکہ محنت قسم اعلیٰ کے لئے محنت قسم اعلیٰ کی گئی مبادلہ جائز اور فریقین کے لئے مفید ہے۔

برعکس اس کے افواج کا وہ حصہ جو دوسروں کو ڈرانے دھمکانے یا محض شان و شوکت یا رعب داب قائم رکھنے کے لئے یعنی نفسی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے رکھا جاتا ہے، معاشی نقطۂ نظر سے غیر ضروری ہے۔ پس افواج کا یہ غیر ضروری زائد حصہ (جدید عمرانیاتی تحقیقات کے بموجب) محنت قسم ادنیٰ کرتا ہے۔ مگر ہندوستان اس کے بھی معاوضہ میں ٹیٹ دولت دیتا ہے۔ پس یہ دولت ہندوستان کی رائگاں جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ افلاس ہند میں اس فوجی پالیسی سے اضافہ ہوتا ہے۔

اب صرف یہ تحقیق طلب ہے کہ ہندوستانی فوج صرف ہندوستان کی حفاظت کے لئے رکھی گئی ہے یا یہ کہ اسکا کچھ حصہ جبر و تشدد و نمود و نمائش یا کسی اور مصلحت سے رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر رائے دینے کا مجھے کوئی حق نہیں، لہذا میں دوسروں کے اقوال نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:۔

نیم سرکاری طور پر جو برطانوی ممالک کا انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا گیا ہے اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ "برطانوی حکومت ہند تقریباً ساڑھے چار لاکھ فوج رکھتی ہے، تاکہ وہ ملک کی حفاظت کرے اور وقت ضرورت برطانوی سلطنت کی فوجی امداد کر سکے"[1] اسی طرح انگلستان کے معروف محقق معاشیات سر رابرٹ گفن کہتے ہیں: "ہندوستانی فوج سے برطانوی اغراض اور عام ضرورتوں کے لئے اکثر کام نکالا جاتا ہے اور صرف ملک کی حفاظت کے لئے اس سے کام نہیں لیا جاتا"[2] برطانیہ کے موجودہ وزیر اعظم چیمبرلین سے میکڈانلڈ اپنی کتاب "حکومت ہند" میں لکھتے ہیں کہ "ہندوستانی افواج کا ایک بڑا حصہ (کم سے کم نصف) ایسا ہے جو ہم شہنشاہی ضرورتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں، لہذا اس کے اخراجات کی ادائی برطانوی خزانے سے ہونی چاہیئے"[3]

ان مختلف بیانات سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستانی فوج کا کچھ حصہ بیجا طور پر رکھا جا رہا ہے۔ اور یہ معاشی نقطہ نظر سے بلا سبب ہونیکی وجہ سے ناجائز ہے، اور قومی معاشی نقطہ نظر سے یہ

I "The Encyclopaedia of the British Empire"
Published by Rankin, Bristol 1923 vol. II P. 734

II "Economic Inquiries and Studies"
مطبوعہ Bell لندن ۱۹۰۴ء جلد دوم صفحہ ۳۷۵

III The Swarthmore مطبوعہ The Government of India
Press لندن ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۵۷

سراسر فضول خرچی ہی جو رقم اس سلسلہ میں ہندوستان کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس سے ہندوستانیوں کے افلاس میں بلاشبہ اضافہ ہوتا ہی۔ اس طرح ثابت ہوا کہ مطالبات وطن کے اس حصہ سے ضرور ہندوستانیوں کی غربت پر خراب اثر پڑتا ہے۔

افواج کے علاوہ انگریزوں کی خدمات، انتظامی امور، سیاسی رہبری عدالتی معاملات اور تعلیمات کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں۔

ان خدمات کے متعلق وٹلے وہی گو کسی قدر شوار ہے اور شخصی رائے کو بہت دخل ہے مگر بجز چند مستثنیات کے یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ تنہائی کام جو عہد برطانیہ میں ہمارے ملک میں انجام پایا وہ اوسط قسم کا تھا، نہروں کے بنانے میں بعض ریلوں کے افتتاح کرنے میں اور بعض عمارتوں کے تعمیر کرنے میں جو محنت انگریزوں کی صرف ہوئی وہ بلاشبہ محنت قسم اعلیٰ تھی مگر جو انصاف انگریزی ججوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کے حق میں کیا جاتا ہے جو معمولی کام۔ انگریز حکام۔ عہدہ دار۔ بڑے چھوٹے افسر مختلف یونیورسٹیوں کے علوم فطری و ذہنی کے پروفیسر انجام دیتے ہیں وہ اوسط قسم کا ہوتا ہے جن کی خدمات کا صلہ وہی ٹیٹ دولت کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک کا حال دیکھئے۔ امریکہ باوجود اس قدر امیر ہونے کے دوسرے ممالک سے صحیح طور پر تبادلہ کرتا ہی۔ امریکہ سے دس بارہ پروفیسر ہر سال جرمانیہ یونیورسٹیوں میں Anglo Saxon ادبیات و علوم کے متعلق اگر لکچر دینے جاتے ہیں تو ہر سال جرمانیہ سے بھی دس بارہ پروفیسر جرمانی علوم و فنون کے متعلق لکچر دینے امریکہ جاتے ہیں۔ امریکن فلیس جرمانیہ اور جرمانوی فلیس امریکہ جاتی ہیں۔ اسی طرح جرمن کتب امریکہ اور امریکی کتب جرمانیہ بھیجی جاتی ہیں۔ غرضیکہ صحیح اصول پر عمل ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے طرفین فائدہ میں رہتے ہیں نہ یہ کہ مثل ہندوستان کے ایک کو فائدہ اور دوسرے کو نقصان ہو۔

بہرطور جدید عمرانیاتی تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ہم محنت قسم اعلیٰ کر کے ٹیٹ دولت پیدا کرتے ہیں، مگر اپنی لاعلمی و نادانی سے اسکا تبادلہ تمدنی بلکہ اکثر صورتوں میں آسائشی دولت سے

کرتے ہیں جس سے ہم کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اور دوسرے ہماری نادانی سے استحصال کرتے ہیں
آخر میں اگر ہم اس مضمون کا لب لباب بیان کرنا چاہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید
معاشیاتی عمرانیاتی تحقیقات کے بموجب موافق توازن تجارت سے یہ لازمی طور پر نہیں اخذ
کیا جا سکتا کہ ہندوستان کی دولت و مرفہ الحالی میں مطلقاً یا نسبتہ اضافہ ہو رہا ہے۔ ہندوستانیوں
کی غربت و بیکسی کا باعث گوناگوں اسباب ہیں جن میں مضر طریق مبادلہ اور مطلق و اضافی اسراف
بھی داخل ہیں۔ بیشتر اسباب غربت ہم ہی لوگوں کی بے خبری، لاعلمی و ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہیں
یہ خصوصیات اعلیٰ تنظیم کی ضد ہیں لہٰذا اگر ہم ایک مختصر جملہ میں مسئلہ افلاس ہند اور جدید معاشیاتی
تحقیقات کا تعلق ظاہر کرنا چاہیں تو صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ "ہندوستان کی غربت کا اصلی سبب
نص و ناکافی تنظیم ہے" اور اس جملہ میں ہندوستانیوں کی تمام سیاسی سماجی اور معاشی ابتری
کا راز مضمر ہے۔

بہائیت

سید علی محمد باب

سید علی محمد جو "باب" کے لقب سے مشہور ہیں جنوبی ایران کے مشہور شہر شیراز میں یکم محرم ۱۲۳۵ھ (مطابق ۲ اکتوبر ۱۸۱۹ء) پیدا ہوئے۔ "باب" خاندان سادات میں سے تھے۔ بچپن ہی میں انکے سر سے سایۂ پدری اٹھ گیا۔ اس لئے بچپن میں انکی دیکھ بھال تعلیم و تربیت انکے ماموں نے نہایت توجہ سے کی۔

قدیم رسم کے مطابق انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی جس میں قرآن شریف کا حفظ کرنا اور معمولی حساب و کتاب کا جاننا تھا۔ اُن کے ماموں بوشہر میں رہتے تھے اور تجارت کرتے تھے۔ اس لئے باب کو بھی تجارت ہی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ جوں جوں انکا سن بڑھتا گیا انکا تورع و تقویٰ بھی روز بروز بڑھتا گیا۔ انکی شرافت، محبت، اخلاق اور خشیۃ اللہ زبان زد عوام تھی۔ باب کے مخالف جنہوں نے انہیں ہر قسم کی جانی مالی اور وطنی تکالیف پہنچائیں وہ بھی انکی شرافت طبع اور چال چلن پر حملہ نہ کر سکے۔ ہاں البتہ انہوں نے یہ کہا کہ کثرت ریاضت سے اُنکا دماغ چل گیا ہے۔

پچیس برس کی عمر میں یعنی ۱۲۶۰ھ (مطابق ۱۸۴۴ء) میں انہوں نے "بابیت" کا دعویٰ کیا۔ اس وقت ایران کے مختلف حصوں سے بہت سے لوگوں نے انکے دعوائے "بابیت" کی تصدیق کی اور باب کے پیرو کہلائے۔ ان لوگوں میں سے اٹھارہ لوگوں کو منتخب کیا اور ایران کے مختلف حصوں میں روحانی حقائق کی تعلیم کے لئے روانہ کیا باب نے ان مبلغین کی روانگی سے پیشتر انکے سامنے "بابیت" کی مکمل تشریح کر دی اور کہا کہ اسکا مقصد یہ ہے کہ میں ایک آسمانی معلم اعظم کے ظہور کے لئے بطور باب یا مبشر کے ہوں۔ یعنی قدرت کی طرف سے ایک مبشر کی حیثیت سے

لوگوں کو ہوشیار کرتے اور آنے والے دوحانی معلم کے استقبال کے لئے لوگوں کو تیار کرنے کے لئے آیا ہوں تاکہ تمام لوگ اپنے آپ کو تمام آلائشوں سے پاک و صاف کرکے "من یظہرہ اللہ" کی آمد کے منتظر ہیں۔

باب نے اپنے ان شاگردوں کو جنہوں نے انکے پیغام کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا۔ "حروف حی" کا لقب دیا۔ اس کے بعد باب حج بیت اللہ کے ارادے سے مع اپنے ایک مرید کے مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے انہوں نے ایک لاکھ حاجیوں کے سامنے اپنا دعوے مہدیت پیش کیا اور لوگوں کو ایک آنے والے کی بشارت دی۔ حج کے بعد بوشہر واپس آئے۔ اس عرصہ میں انکے پیروؤں نے ایران کے گوشہ گوشہ میں انکی تعلیمات کو پھیلایا اور باب کا نام ہر شخص کی زبان پر جاری تھا۔ ایرانی مجتہدوں نے باب کی سخت مخالفت کی۔ اب یہاں سے باب کی تکالیف اور مصائب کا دور شروع ہوتا ہے۔

باب بوشہر سے شیراز گئے جہاں مجتہدین انکے ساتھ نہایت سختی سے پیش آئے اور حکومت کی طرف سے بھی نہایت سختی سے نگرانی کی جانے لگی اور اپنے گھر میں نظر بند کئے گئے۔ یہاں تک کہ تمام بیرونی دنیا سے انکے تعلقات منقطع کئے گئے تاہم انکے شیدائی ان تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ باب کی تعلیمات کا سلسلہ وسیع ہوگیا چنانچہ ان کے پیروؤں میں ہر قسم کے لوگ شامل ہو چکے تھے جن میں امیر، غریب، علما، فضلا اور شعرا سب ہی قسم کے لوگ شامل تھے۔ باوجود سخت مخالفت اور رکاوٹ کے لوگ باب کے پاس آتے اور اظہار عقیدت کرتے تھے۔ دنیا کی مخالفت انکی ہمت اور استقلال کے سامنے پرکاہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ صبر و استقلال اور ہمت انکے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ دنیا کی کوئی طاقت انکے ارادے میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔

باب نے دوسرا سفر اصفہان کی طرف کیا جہاں انکے پیروؤں کی کافی تعداد ہو چکی تھی وہاں کے گورنر نے باب کا استقبال نہایت شاندار طریقہ پر کیا اور ان کی دعوت کو لبیک کہا۔ مختلف

طریقوں سے اظہار عقیدت کیا۔ اور اس نے باب کے قیام کے لئے ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں۔ اور عوام الناس کو انکے پاس آنیکا موقع دیا۔

ان واقعات نے اصفہانی مجتہدوں کے غصہ کو بڑھا دیا۔ یہانتک کہ وہ انکے قتل کے لئے تیار ہوگئے۔ مجبوراً گورنر نے باب کو حکومت ہی کے مکان میں پوشیدہ رکھا مگر چند دنوں کے بعد اس گورنر کا انتقال ہوگیا۔ لوگوں کو باب کے قیام گاہ کا علم ہوگیا۔ اور ایران کی مرکزی حکومت کی طرف سے انکی گرفتاری کا حکمنامہ صادر ہوچکا تھا۔ کہ انکو طہران روانہ کیا جائے۔ باب نہایت سخت نگرانی میں دارالسلطنت کی طرف روانہ کئے گئے راستہ میں جو شہر اور گاؤں پڑتے تھے لوگ جوق در جوق جمع ہوجاتے تھے اور باب کا پیغام سنتے تھے۔ یہاں تک کہ پہرہ داروں نے بھی انکے دعوئے بابیت کی تصدیق کی۔ اور بابی بن گئے۔

حکومت بابی تحریک کی روز افزوں ترقی دیکھ کر ڈری اور خیال کیا کہ ایسا نہ ہو کہ علمائے طہران برافروختہ ہوکر بلوہ کردیں چنانچہ باب کو ایران کے ایک قلعہ کا نام میں قید کردیا اس سفر کی وجہ سے باب کی شہرت اور تعلیم لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی۔

باب کے متبعین میں ایک مشہور شاعرہ اور خطیبہ عورت قرۃ العین نامی بھی تھیں جو علمی فضیلت اور خداداد قابلیت، عزم و استقلال اور دین کی محبت میں شہرۂ آفاق تھیں۔ اس خاتون نے دور ابتلاء و فتن میں نہایت جوش سے اس نئے دین کو پھیلایا۔ آخرالامر انہیں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔

جب حکومت نے دیکھا کہ تعلیمات تمام ملک میں نہایت سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہیں تو اس نے باب کو ماکو سے منتقل کرکے چہریق میں مقید کردیا اور مجتہدین ایران نے عوام الناس اور حکومت کو باب کے خلاف اکسایا۔

بالآخر یہ طے ہوا کہ مجمع عام میں تحقیق کیجائے اس مقصد کے لئے ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں باب کو چہریق سے بلایا گیا۔ بجائے بحث و مباحثہ اور تحقیق و تفتیش کے باب کی تذلیل کی گئی

اور باب کو عوام الناس کے سامنے کوڑے لگوائے گئے اور پھر چہریق میں دوبارہ قید کر دیا گیا۔ اب وہ زمانہ شروع ہوتا ہے جبکہ بابیوں کا قتل عام ہونے لگا۔ مجتہدین نے انکے مال اور خون کو عوام الناس کے لئے حلال کر دیا۔ بابی ہونا ہی جرم کے لئے کافی تھا۔ نہایت بے دردی اور سنگدلی کے ساتھ بابی بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کیا گیا اور انکے مکانوں کو جلایا گیا۔ ان واقعات کی تفصیل نہایت دردانگیز ہے۔ جگہ جگہ بابیوں پر منظم حملے کئے گئے اگرچہ بابیوں نے بھی کسی کسی جگہ مدافعانہ مقابلہ کیا لیکن ٹڈی دل کے مقابلہ میں قتل ہو گئے۔ مگر یہ مظالم بجائے رکاوٹ کے تحریک بابیت کی ترقی کا باعث ہوئے۔

آخرالامر صدر اعظم ایران نے بابی تحریک کی روز افزوں ترقی دیکھکر باب کے قتل کا حکم صادر کیا صدر اعظم کا یہ خیال تھا کہ یہ معاملہ اسی طرح ختم ہو جائے گا مگر اس کے برخلاف ہوا۔ باب چہریق سے صوبہ کے صدر مقام تبریز میں لائے گئے۔ اور وہیں ۹ جولائی ۱۸۵۰ء میں شہید کر دئے گئے۔

یہ واقعہ اس طریقہ سے بیان کیا گیا ہے کہ انکو مع انکے ایک فدائی کے قتل گاہ میں لایا گیا اور دونوں کو ایک دیوار کے ساتھ رسی سے جکڑا گیا۔ اور فوج کے ایک دستہ نے اُن پر گولیاں چلائیں گولی چلی اور دھوئیں کے چھٹ جانے کے بعد حاضرین کو یہ دیکھ کر حیرت اور استعجاب ہوا کہ باب مع فدائی کے نہایت اطمینان اور تبسم کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہیں اور تمام رسیاں جل چکی ہیں۔ گولی چلانے والے سپاہیوں نے دوبارہ گولی چلانے سے انکار کر دیا تب افسر نے دوبارہ دوسرے سپاہیوں کو گولی چلانے کا حکم دیا چنانچہ اب گولیاں کارگر تھیں اور چہرہ کے سوا تمام جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔ اور باب اور انکے فدائی نے ہمیشہ کے لئے دنیا کو خیرباد کہا۔

حکومت کی طرف سے باب کی نعش کی نہایت سختی سے نگرانی کی گئی مگر انکے شیدائی لاش کو نہایت جرأت اور دلیری سے اٹھا کر لے گئے اور مختلف اوقات میں مختلف جگہوں پر منتقل کرتے رہے۔ یہانتک کہ ۱۹۰۹ء میں تمام دنیا کے بہائی زائرین کے سامنے باب کے جسم کو عبدالبہاء نے کوہ کرمل (علاقہ شام) میں دفن کیا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ باب نے بالکل ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی لیکن اپنی علمی قابلیت کے سامنے بڑے بڑے مجتہد نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ باب نہایت تیز لکھنے والے تھے۔ چند گھنٹوں میں انہوں نے بڑی ضخیم کتابیں لکھ ڈالیں۔ باب نے اپنی قید و بند کے زمانہ میں چند الواح اور توقیعات تحریر کیں تھیں جن کا مضمون زیادہ تر "من یظہرہ اللہ" کی بشارت ہے۔ ان الواح اور توقیعات میں باب نے اپنے پیروؤں کو نہایت تاکید اور تکرار کے ساتھ حکم دیا ہے کہ جب "من یظہرہ اللہ" ظاہر ہو۔ تم لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

بیان باب کی مشہور تصنیفات میں سے ہے جو فارسی اور عربی دونوں میں الگ ہے اسمیں قرآن مجید کے سربستہ اسرار کو ظاہر کیا گیا ہے۔ خاصکر قیامت و حشر اور دیدار خدا کی نسبت مفصل بیانات ہیں۔ ایک کتاب قیوم الاسماء اور "تفسیر سورۂ یوسف" بھی اسی سلسلہ کی ایک مشہور کتاب ہے۔

بہاء اللہ

میرزا حسین علی نوری جو بہاء اللہ کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ ماہ نومبر ۱۸۱۷ء طہران پایۂ تخت ایران میں پیدا ہوئے۔ اُنکا خاندان تمام ایران میں شریف و نجیب اور متمول خیال کیا جاتا تھا۔ بہاء اللہ کے والد اور دوسرے رشتہ دار حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے۔ والد کے انتقال کے بعد بہاء اللہ نے خاندان کی نگرانی اپنے ذمہ لی اور تمام جائداد کی دیکھ بھال اور اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتے تھے۔ بچپن ہی سے بہاء اللہ اپنے حسن اخلاق اور ذہانت کی وجہ سے مشہور تھے۔

بہاء اللہ اگرچہ معمولی لکھے پڑھے آدمی تھے مگر انکی علمی قابلیت اور فضیلت شہرۂ آفاق تھی۔ جس وقت باب نے "بابیت" کا اعلان کیا اور شیراز سے اپنے شاگردوں کو ملک کے اطراف و اکناف میں روانہ کیا اس وقت بہاء اللہ کی عمر ۲۷ برس کی تھی اور طہران میں مقیم تھے۔ جوں ہی باب کی

خبر طہران میں پہنچی بہاء اللہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس کی تصدیق کی اور "بابیت" کی نشر و اشاعت کے لئے ہمت و استقلال سے کمر باندھ لی اپنے قصبہ نور اور اس کے گرد و نواح میں بابیت کی اشاعت کرتے رہے۔

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ باب اور بہاء اللہ کا آپس میں کوئی خاندانی تعلق نہ تھا کیونکہ باب عربی النسل تھے اور بہاء اللہ خالص ایرانی النسل۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دونوں کی کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ لیکن دونوں کا قلبًا، روحًا اور خیالًا ایک زبردست تعلق تھا باب کے قتل تک دونوں کے درمیان خط و کتابت جاری تھی۔

جب باب کو معلوم ہوا کہ تبریز کی طرف منتقل کئے جا رہے ہیں اور قتل کی سزا ملنے والی ہے تو اس وقت انہوں نے اپنے مخلص پیرو کے ذریعہ تمام نوشتجات، قلمدان اور مہر ایک صندوقچہ میں بند کر کے بہاء اللہ کو پہنچا دی۔ بہاء اللہ اگرچہ باب کے زبردست حامیوں اور مددگاروں میں سب سے زیادہ مشہور تھے۔ مگر یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہی شخص آنے والا معلم روحانی ہے۔ باب کے قتل کے بعد بابیوں پر مصائب و آلام کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک نوجوان بابی جو باب کی تعلیمات سے بالکل بے خبر تھا اپنے احباب کے مصائب دیکھکر متاثر ہوا اور جوش مذہبی کی وجہ سے اس سے آپے میں نہ رہا گیا اور اپنے ہم مذہبوں کی بہتر حالت بنانے کے لئے اس نے شاہ ایران پر حملہ کیا۔ یہ شخص محرم تھا گرفتار ہوا اور درباریوں کے ہاتھوں قتل کیا گیا۔ مگر وزرائے حکومت نے بغیر تحقیق و تفتیش کے اس جرم کو تمام بابی جماعت کی طرف منسوب کیا۔ کتنے بے گناہ بابی قتل کئے گئے کتنے بچے یتیم کئے گئے کتنی عورتیں بیوہ کی گئیں۔ صرف یہ خیال ہی ثبوت جرم کے لئے کافی تھا کہ اگر کوئی شخص یہ شبہ کرے کہ فلاں شخص بابی ہے تو اسکی سزا دار کا تختہ تھی۔ اسی بابی عوام الناس میں تقسیم کئے گئے جن کو طرح طرح کی تکلیفیں دے کر قتل کیا گیا۔

نمونے کے طور پر چند واقعات ان بابیوں کے یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے ہفتے

ہوئے اپنی جانیں اپنے محبوب کے اشتیاق میں دیں اور مستانہ اداؤں سے اپنے جلادوں اور قاتلوں کے لئے باعث عبرت اور تحیر بنے۔ ایک بابی کو جلاد نے گردن مارنے کی ضرب لگائی۔ انکا سبز عمامہ سر سے گر گیا اس بوڑھے بابی نے عمامہ کو اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے اپنے سر پر رکھ لیا۔

اے خوش آں عاشق سرمست کہ در پائے حبیب سر و دستار نداند کہ کدام انداز د

ایک دوسرے بابی کو جلاد قتل گاہ کی طرف بازنجیر لیجا رہے تھے اور وہ جلادوں کو مصری کی ڈلیاں بانٹتا جا رہا تھا اور کہتا تھا کہ تمہارے ذریعہ آج مجھکو بڑی عزت ملنے والی ہے اس کی خوشی میں تمہارا منہ میٹھا کرنا چاہتا ہوں۔

ایک نوجوان بابی حاجی سلیمان نامی کے بدن میں لوگ زخم کر کے جلتی ہوئی موم بتیاں ٹھونستے جاتے تھے اور شہر کا گشت لگوا رہے تھے وہ ہنستا بولتا اور خوش ہوتا چلا جا رہا تھا اور گیت گا رہا تھا جس کا پہلا شعر یہ تھا ؎

باز آمدم باز آمدم از راہ شیراز آمدم باعشوہ و ناز آمدم ہذا جنون العاشق

اگرچہ بابیوں پر تمام دنیا کی مصائب و ابتلا ڈالی گئیں مگر وہ اس قدر ثابت قدم رہے کہ ایک انچ بھی نہ ہٹے تمام بلیات اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا ایک یورپین سیاح ان واقعات کے مشاہدہ کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ "جب مورخ ایران کی تاریخ لکھے گا تو ان واقعات کو نہایت جلی حرفوں میں لکھے گا"

اس مصائب و آلام کے زمانے میں بہاء اللہ اپنی عجیب و غریب شجاعت کے ساتھ بابی دوستوں یا مظلوموں کی امداد کے لئے آگے بڑھے۔ حکومت نے چار سال تک بہاء اللہ کو نہایت سخت قید و محن میں بند رکھا جب تحقیق ہوئی اور یہ بات ثابت ہوئی کہ بابیوں کا دامن سازش سے بالکل پاک ہے تو بہاء اللہ حکومت ایران اور ترکی کی باہمی مفاہمت سے ایشیائی ترکی کے شہر بغداد میں جلا وطن کئے گئے۔ اس کی وجہ یہ خیال کی گئی کہ بہاء اللہ کا تعلق بابیوں سے منقطع رہے گا۔

اور یہ لوگ انکی رہنمائی سے محروم رہیں گے۔

چنانچہ بارہ برس کے قریب بہاء اللہ بغداد میں نظر بند رہے اسی زمانہ میں انکا ایک رشتہ دار سفیر بغداد ہوکر آیا اور انکے خلاف ایک سازش میں ساتھ دیا اور حکومت ایران کو شکایت لکھی کہ "بہاء اللہ کا بغداد میں رہنا ایران کے مومنین کے لئے اچھا نہیں ہے کیونکہ بہت سے ایرانی باشندے عتبات عالیہ کی زیارت کو جاتے ہوئے بغداد سے گذرتے ہیں اور بعض بابیوں سے ملکر بابی ہوجاتے ہیں" چنانچہ سفیر کی یہ کوشش کامیاب ہوئی۔ حکومت ایران نے حکومت عثمانیہ کو درخواست کی کہ بہاء اللہ کو بغداد سے ہٹائے۔ سلطان عبدالعزیز نے سب کو قسطنطنیہ بلایا اور پانچ ماہ تک وہاں نظر بند رکھا۔ اور اس کے بعد ادرنہ (ایڈریانوپل) بھیجدیا۔ جہاں وہ ایک عرصہ تک مصائب و آلام میں گرفتار رہے۔ ایڈریانوپل میں بہاء اللہ نے اعلان کیا کہ جس شخص کی بشارت باب نے دی اور جس کی راہ میں انہوں نے اپنی جان قربان کی تھی وہ میں ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ کو من یظہرہ اللہ کہا۔ سب لوگوں نے انکے دعوے کو سچا مانا مگر ایک شخص جو صبح ازل کے نام سے مشہور تھا اس نے انکار کیا اور آخر وقت تک بہاء اللہ کے دعوے کو نہ مانا۔

اس کے بعد بہاء اللہ نے سب سے پہلا یہ کام کیا کہ دنیا کے تمام بادشاہوں اور حکمرانوں کے نام خط لکھے۔ ان خطوط میں سے جو خط شاہ ایران کے نام تھا اور جس کو ایک شخص بدیع نامی شاہ ایران کے پاس لے گیا اس خط کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

"خدا کی قسم! اگر دکھ درد کے صدمے مجھے کمزور بنا دیں بھوک اور پیاس کی تکلیفیں مجھے ہلاک کردیں۔ سخت پتھر میرا بستر بنا دیا جائے اور جنگل کے جانور اور درندے میرے مونس و ہمدم کردئے جائیں تو میں مطلق فریاد و زاری نہ کروں گا۔ خدا کی مدد سے جو ازل کا مالک اور قوموں کا پروردگار ہے ویسا ہی صبر کروں گا جیسا کہ دور اندیش اور اپنے ارادے پر ثابت قدم رہنے والوں نے کیا ہے۔ میں ہر حالت میں خدا کا شکر ادا کروں گا۔ . . . .

آخر میں اس جملہ پر یہ خط ختم ہوتا ہے "کہ ہمیشہ بلا و مصائب کی موجودگی میں خدا کا حکم جاری

ہوا ہے۔ یہی خدا کی سنت ہے جو اگلے وقتوں سے اسی طرح جاری ہے۔"

خط لانے والا یعنی بدیع شاہ ایران کے حکم سے طرح طرح کے دکھ دینے کے بعد مار دیا گیا۔

تین سال تک بہاء اللہ اپنے متبعین کے ساتھ ایڈریانوپل میں نظر بند رہے۔ تکالیف و مصائب میں بجائے کمی کے اور اضافہ ہوا اب دشمنوں نے بہاء اللہ کے خلاف مختلف الزام لگائے آخر میں سلطان نے تنگ آکر بہاء اللہ اور اس کے ساتھیوں کو مختلف مقامات پر جدا جدا قید کر کے بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سب لوگوں کو صدمہ ہوا بہاء اللہ کے بڑے بیٹے عبدالبہا عباس آفندی نے اس حکم کو منسوخ کرانیکا ارادہ کر لیا ایک ہفتہ کی محنت کے بعد عبدالبہا عباس آفندی اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اس اثناء میں غلطی سے کسی نے بہاء اللہ کے ایک فدائی کو خبر دی کہ حکم ابھی تک منسوخ نہیں ہوا ہے۔ اس نے اپنا گلا کاٹ لیا اور کہا کہ اگر اس دنیا میں ہم اپنے محبوب کے ساتھ نہیں رہ سکتے ہیں تو دوسری دنیا میں جا کر انتظار کریں گے لیکن زخم کاری نہ تھا خود بہاء اللہ نے اس کو بچا لیا۔

اب حکومت ترکیہ نے بہاء اللہ کو ایڈریانوپل سے جلاوطن کر کے عکہ (جو شام میں ہے) بھیجنے کا حکم صادر کیا۔ بہاء اللہ اور انکے ساتھی سب اکٹھے روانہ ہوئے ابھی تک ان لوگوں کے دلوں میں یہ خیال موجود تھا کہ مبادا حکومت انکو مختلف مقامات پر جدا جدا قید کر کے روانہ کرے۔ ہمراہی افسر بھی انکے دلوں میں اس خیال کو تازہ کر رہے تھے۔ راستہ میں جہاں جہاں جہاز بدلتا تھا سب لوگ ایک ہی کشتی میں سوار ہوتے تھے اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دوسرے سے جدا کئے جائیں چنانچہ ایک فدائی نے جسے دوسری کشتی میں بٹھا کر جدا کرنا چاہتے تھے اس نے سمندر میں کود کر اپنے آپ کو عمیق موجوں کے حوالہ کیا ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہاء اللہ کے فدائی اس سے کس قدر محبت و عقیدت رکھتے تھے۔

۱۸۶۸ء میں بہاء اللہ شہر عکہ میں نظر بند کی حیثیت سے لائے گئے اور انکے ساتھ ۷۰ فدائی تھے جو ایران اور مختلف ملکوں کے بڑے بڑے لوگ تھے جو اپنی عیش و عشرت کو خیرباد کہہ کر

ہمیشہ کے لئے بہاء اللہ کے ساتھ رہنا اپنی خوش نصیبی خیال کرتے تھے۔

۱۸۶۸ء سے لیکر ۱۸۹۲ء تک بہاء اللہ عکہ میں نظر بند رہے اور پچھتر سال کی عمر میں چار سال کی سخت قید اور چالیس سال کی متواتر نظر بندی کے بعد عکہ سے ایک میل کے فاصلہ پر باغ بجی میں رحلت کی اور اپنا کام اپنے بیٹے عبدالبہاء عباس آفندی کے سپرد کیا۔

بہاء اللہ کی شخصیت کے متعلق مشہور مستشرق پروفیسر براؤن اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے :-

"میرا رہنما ایک پردہ کے قریب تھوڑی دیر ٹھہرا۔ یہانتک کہ میں نے اپنے بوٹ اتارے اس کے بعد میں پردہ اٹھا کر ایک وسیع کمرہ میں داخل ہوا۔ میرے سامنے ایک مسند تھا اور دروازہ کے قریب دو تین کرسیاں رکھی تھیں مجھے کچھ یونہی سا خیال پیدا ہوا کہ کہاں لیجایا جا رہا ہوں اور کس سے ملاقات کرنے والا ہوں۔

دو تین سکینڈ گذرے ہوں گے کہ رعب اور تعجب سے میرا دل دھڑکنے لگا کیونکہ وہ کمرہ خالی نہ تھا کمرہ میں مسند پر ایک صاحب وقار اور محترم بزرگ کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ایک ٹوپی جو درویشوں کے تاج کی طرح تھی بلکہ اس سے ذرا اونچی انکے سر پر تھی اور اس تاج کے گرد ایک سفید چھوٹا سا عمامہ لپٹا ہوا تھا۔ اس چہرہ کو جس پر میری نظر پڑ رہی تھی کبھی نہیں بھول سکتا ہوں اگرچہ اسکا بیان کرنا میری قوت سے باہر ہے چمکتی ہوئی آنکھیں جو انسان کی روح کو دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں کشادہ پیشانی جس سے جلال و بزرگی ہویدا تھی۔ پیشانی اور چہرہ کی جھریاں جو کبر سنی کا اظہار کر رہی تھیں۔ انکے سیاہ بال اور سیاہ داڑھی اس کی تردید کر رہے تھے یہ بات بتلانے کی ضرورت نہیں کہ میں کس کے حضور میں کھڑا تھا۔ تقدیم مراسم تعظیم کے لئے اُس کے سامنے جھک گیا جس کی ایسی محبت کیجاتی ہے کہ اولوالعزم شہنشاہ رشک کرتے ہیں۔

ایک ملائم مگر پُر رعب آواز نے مجھے بیٹھنے کا حکم فرمایا" "الحمدللہ تم فائز ہوئے۔ تم ایک

قیدی، جلاوطن سے ملنے کے لئے آئے ہو۔" اس کے بعد یوں اپنے ارشاد کو جاری کیا "ہم لوگ بجز اصلاح عالم کے کچھ نہیں چاہتے ہیں مگر ہم لوگوں سے مفسدوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے ہم چاہتے ہیں کہ تمام قومیں متحد ہو جائیں۔ تمام انسان بھائی بھائی بن جائیں۔ انسانوں میں محبت و اخوت کا رشتہ مضبوط ہو جائے مذہبی اور قومی تنازعات انکے درمیان سے اٹھ جائیں۔ ان باتوں میں کیا عیب ہے؟ یہ تمام جھگڑے اور تباہ کن لڑائیاں برطرف ہو جائے گیں۔ انکے بجائے صلح اکبر قائم ہو گی۔"

عبدالبہا عباس آفندی

عبدالبہا عباس آفندی ۱۸۴۴ء مئی کی اسی جمعرات کو پیدا ہوئے جس جمعہ کو باب نے "بابیت" کا دعوے کیا تھا۔ عبدالبہا کی زندگی کا آٹھواں سال تھا کہ یسانی آرام کا زمانہ ختم ہو گیا انکے والد بہاءاللہ طہران میں قید کر دئے گئے اور اس کے بعد تمام موروثی جائداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط ہو گئی اور جو بچی کچھی تھی وہ بھی لٹ گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ باب تازہ قتل کئے گئے تھے اور بابیوں کے خلاف ایران میں ایک محشر بپا تھا۔ اگر کوئی جھوٹ موٹ بھی بابی مشہور ہو جاتا تو جان کی خیر نہ تھی تمام بابی مخفی طور پر زندگی گذارتے تھے۔ رات کو تہ خانوں میں بغیر چراغ اندھیرے میں ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تھے۔

غرض عبدالبہا بھی کمسنی میں ان مصائب میں گرفتار ہوئے اپنے باپ کے ساتھ بغداد میں جلاوطنی اختیار کی مصائب و تکالیف میں باوجود کمسنی اپنے باپ کے دست و بازو بنے۔ عبدالبہا نے کسی کالج یا مدرسہ میں بالکل تعلیم نہیں پائی تھی کیونکہ موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ہاں البتہ کچھ ابتدائی تعلیم اپنے باپ یعنی بہاءاللہ سے حاصل کی تھی۔ باوجود کمئی تعلیم کے بغداد کے بڑے بڑے علماء انکے تبحر علمی سے متحیر تھے۔ ایک مرتبہ ایک صوفی علی شوکت پاشا نامی نے بہاءاللہ سے اس حدیث کا مطلب پوچھا "کنتُ کنزاً مخفیاً"۔ بہاءاللہ نے عباس آفندی کی طرف اشارہ کیا اور اس کے نکلنے

کا حکم دیا۔ عبدالبہا عباس آفندی اس وقت پندرہ سولہ برس کے تھے۔ ایک رسالہ مندرجہ بالا حدیث کی تفسیر میں لکھا۔ اس رسالہ نے صوفی مذکور کو ورطۂ حیرت میں ڈالدیا۔ یہ رسالہ علمی دنیا میں کافی شہرت رکھتا ہے۔ اور اسکا نام "شرح کنت کنزاً مخفیاً" ہے۔ عبدالبہا اپنی نوجوانی میں اپنے اوقات کا ایک بہت بڑا حصہ غربا کی خدمت، بیماروں کی تیمارداری اور جاہلوں کی تعلیم میں صرف کرتے تھے۔ دوران نظر بندی ایڈریانوپل میں عبدالبہا کی ہر دلعزیزی مشہور تھی۔ عوام الناس ان کو "سرکار آغا" کے لقب سے پکارتے تھے۔ عکہ میں جب عبدالبہا اپنے باپ کے ساتھ نظر بند تھے۔ اس وقت بیماروں اور ناداروں کی خدمت کرنا انکا سب سے بڑا مشغلہ تھا۔ بیماروں کو خود اپنے ہاتھوں سے نہلاتے اور خود کھانا تیار کرکے ضعیفوں اور ناداروں کو کھلاتے تھے۔ چنانچہ ہر شخص عبدالبہا سے محبت کرنے لگا۔ اور عکہ میں "حامی الغربا والمساکین" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

بہاراللہ کے انتقال کے بعد عبدالبہا نے تمام کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اور بڑی شدومد کے ساتھ "بہائیت" کی نشرواشاعت کی کوشش کی۔ عبدالبہا اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق کوہ کرمل کے ایک پہلو میں ایک عمارت بنوا رہے تھے۔ جس میں باب کا مقبرہ اور کچھ کمرے عبادات اور مجلس روحانی کے انعقاد کی غرض سے بنائے گئے تھے۔

دشمنوں نے عبدالبہا کے خلاف حکومت سے شکایت کی کہ یہ شخص ایک قلعہ اس مقصد سے تعمیر کرا رہا ہے کہ حکومت کے خلاف لڑے اور ملک شام پر قبضہ کرے۔

چنانچہ ترکی حکومت نے عبدالبہا اور اس کے متبعین کو عکہ کی فصیل میں نظر بند کردیا یعنی عکہ کے اردگرد چند میل تک آجاسکتے تھے۔ سات سال تک عبدالبہا اسی نظر بندی کی حالت میں رہے مگر مذہب بہائی کی اشاعت باوجود اس رکاوٹ کے نہ رک سکی۔ امریکہ اور یورپ سے لوگ آتے تھے اور ہدایات لیکر پھر اپنے کام میں مشغول ہوجاتے تھے

۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء میں حکومت ترکیہ کی طرف سے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا تاکہ وہ ان الزامات کی تحقیق کرے جو عبدالبہا کے خلاف لگائے گئے تھے۔ عبدالبہا نے نہایت خندہ پیشانی سے ان الزامات

کی تردید کرتے ہوئے ہر اس حکم کو جو کمیشن اپنر لگانا چاہتا تھا قبول کیا۔

اسی اثنار میں اٹلی کے قنصل نے متعدد بار عبدالبہا سے درخواست کی کہ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے لئے جہاز بہم پہنچا سکتا ہوں اور جہاں چاہیں وہاں پہنچا دوں۔

مگر عبدالبہا نے کہا کہ میں صبر و استقلال کے ساتھ ان تمام مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کروں گا جو مجھ پر ڈالی جائیگیں۔ اور بہاء اللہ کے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ باپ نہیں بھاگا بیٹا بھی نہیں بھاگے گا۔

۱۹۰۸ء میں کمیشن نے اپنا کام ختم کیا قسطنطنیہ واپس گیا۔ اور باب عالی کے سامنے کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا کہ عبدالبہا کو یا تو جلاوطن کیا جائے گا یا سولی دیدی جائے گی۔ مگر عجیب اتفاق ہوا کہ ٹرکی میں انقلاب واقع ہوگیا اور نوجوان ترکوں نے تمام مذہبی قیدیوں کو رہائی دیدی۔ ۱۹۰۸ء میں عبدالبہا کو جبکہ انکی عمر چونسٹھ سال تھی قید سے آزادی ملی۔ چنانچہ فوراً انکو یورپ اور امریکہ سے دعوتیں آئیں۔

۱۹۱۱ء میں عبدالبہا مغربی دنیا کے پہلے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس سفر میں عبدالبہا کو ہر خیال کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اسی سال ستمبر میں عبدالبہا لندن پہنچے ایک ماہ تک وہاں قیام کیا۔ انگلستان کے پریس نے بہائی مذہب پر مضامین شائع کئے اور عبدالبہا کی تصویر شائع کی۔

اس عرصے میں عبدالبہا نے بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے لکچر دئے۔ جو بڑے زبردست فصیح و بلیغ ہیں اور جدید فارسی لٹریچر میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد عبدالبہا فرانس پہنچے وہاں بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے موجودہ ضروریات و مسائل پر خطبے دئے جس سے تمام فرنچ پریس گونج اٹھا۔ اس سفر کے بعد عبدالبہا مصر واپس آئے کچھ دن مصر میں آرام کیا۔ اس کے بعد ولایتہائے متحدہ امریکہ سے پرزور دعوت نامے آئے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۱۲ء میں عبدالبہا امریکہ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ امریکہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک

سفر کیا۔ ہر قسم کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بڑے بڑے پروفیسروں، پادریوں اور لامذہبوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور تمام یونیورسٹیوں میں لکچر دئے اور سب لوگوں کو صلح اور آشتی کا پیغام دیا اور امتیازات نسلی کے مٹانے کے لئے اپیل کی۔ مرد اور عورت کو برابر حقوق دینے پر زور دیا۔ امریکہ سے واپسی میں عبدالبہا پھر انگلستان گئے جہاں چھ ماہ تک قیام رہا۔ اسی اثنا میں لورپول، لندن اور ڈنبرا میں شہرہ آفاق لکچر دئے جو بہائی لٹریچر میں خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد جرمنی اسٹریا ہوتے ہوئے مصر میں اپنے اس تبلیغی سفر کو ختم کیا۔

ستمبر ۱۹۱۳ء میں عبدالبہا حیفا (علاقہ شام) میں واپس آگئے۔ یورپ اور امریکہ کے طویل سفر نے عبدالبہا کے جسمانی قوے کو کمزور بنا دیا چنانچہ اس زمانے میں عبدالبہا نے چند الواح لکھی ہیں جس میں اپنے متبعین کو بہائی ازم کے پھیلانے کی دعوت دیتے ہیں جن میں سے ایک لوح کا مختصر اقتباس پیش کرتا ہوں وہو ہذا۔

"اے دوستو! وقت آرہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہ ہوں گا جو کچھ مجھ سے ہوسکتا تھا میں کرچکا۔ امر بہائی کی میں نے استعداد بھر خدمت کی۔ اپنی زندگی میں دن رات اس کی خدمت میں مشغول رہا ہوں"

عبدالبہا نے اپنی زندگی کے بقیہ دن حیفا میں گذارے۔ زیادہ وقت بہائیوں کی تنظیمی اور تعلیمی اسکیموں کے تیار کرنے پر صرف کیا چنانچہ تنظیمی ترتیب کا ایک خاکہ یہ ہے۔

۱۔ ولی امراللہ یعنی ایک واحد قومی سردار کا انتخاب۔

۲۔ ایادی امراللہ یعنی مبلغین دین کا نظام مرتب کرنا۔

۳۔ محافل روحانی۔ مقامی اور بین الاقوامی کا قیام۔

۲۸ نومبر ۱۹۲۱ء کو عبدالبہا نے نہایت اطمینان وسکون کی حالت میں حیفا میں انتقال کیا اور اپنے پیچھے ایک کارکن جماعت چھوڑی۔

شوقی آفندی ولی امر اللہ

عبدالبہا نے شوقی آفندی کو ولی امر اللہ مقرر کیا۔ شوقی آفندی عبدالبہا کی سب سے بڑی بیٹی ضیا خانم کے بڑے بیٹے ہیں اور انکے والد کا نام میرزا ہادی شیرازی ہے۔ جو سید باب کے خاندان کے ایک فرد ہیں۔

مسند ولایت پر بیٹھتے وقت شوقی آفندی کی عمر پچیس برس کی تھی اور اس وقت اکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہاں سے بلائے گئے اور ولایت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ سب سے پہلے شوقی آفندی نے یہ کام کیا کہ محافل روحانی تمام بہائی آبادیوں میں قائم کرائیں اور باقاعدہ ایک نظام کے ماتحت تبلیغ اصول بہائی کے لئے نظام قائم کیا۔ اور تمام بہائی مردوں، بچوں اور عورتوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔ شوقی آفندی نے بہائی نظام کو اسقدر منظم کیا ہے کہ بڑی بڑی حکومتوں کے نظام بھی اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ اس وقت شوقی آفندی کی عمر ۳۲ سال کی ہے۔ انگریزی۔ عربی، فارسی ترکی اور فرانسیسی زبان پر کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ انکی علمی اور اخلاقی قابلیت کا سکہ تمام ملنے والوں کے دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔ حد درجہ منکسر مزاج ہیں انہوں نے اپنے تمام متبعین کو ہدایت کر دی ہے کہ مراسلات میں انکے لئے بڑے بڑے القاب نہ استعمال کریں۔ ہر بات میں مساوات اور اخوت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

مختلف ممالک کے اخبارات اور رسائل شوقی آفندی کی تصویر اور انکے موجودہ نظام پر مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ چند ماہ ہوئے کہ ٹائمز آف انڈیا کے ہفتہ وار ایڈیشن نے انکا فوٹو شائع کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بہائی مذہب پر ایک سلسلۂ مضمون بھی شائع کیا تھا۔ جس کے کچھ حصہ کا ترجمہ بمبئی وغیرہ میں نکل چکا ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں بہائی اصول اور تحریک بہائی کی موجودہ رفتار ترقی کا ایک مجمل خاکہ پیش کر کے اس مضمون کو ختم کروں۔

تعلیمات بہائی

خدا :- غیب لایدرک ہی اسکی حقیقت کو کسی نے نہیں سمجھا مگر اس کی ہستی پر ہر ایک ضمیر و وجدان اور عقل فہم گواہ ہی۔ جس پر کافی سے زائد علمی دلائل موجود ہیں۔ خدا کی قدرت اب بھی ویسی ہی ہے جیسے پہلے تھی۔ اس کی کوئی قوت کم نہیں ہوئی ہے وہ اپنی صفات کمال میں یکساں ہے وہ اپنی کائنات میں اپنی قدرت کے نئے نئے ظہور دکھاتا رہتا ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کے نام اور اس کی نسبت مختلف بیانات ہیں لیکن سب کا مقصد ایک ہی۔ اس کی قدرت کی کوئی ابتداد انتہا نہیں وہ ہمیشہ سے خالق و مالک ہی اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کی صفات میں کبھی حدوث نہیں ہوا نہ کبھی تعطل ہوتا ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً ایک باقاعدہ پروگرام کے اندر دنیا کو ہدایات دیتا رہتا ہے خاص خاص لوگوں کو اپنے کلام کا جلوہ گاہ مقرر کرکے اصلاح خلق کے لئے مبعوث کرتا رہتا ہے یہ سلسلہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ کیونکہ یہ اس کی صفت ربوبیت کا تقاضا ہے اور خدا کی کوئی صفت کبھی بھی مفقود نہیں ہوسکتی ہے۔

پیغمبر :- اس کی شان ہدایت سے مظہر ہوتے ہیں۔ سب پیغمبر حق ہیں۔ انکی شریعتیں خدائی پروگرام کے مطابق اپنے اپنے وقت کے لئے نہایت پر حکمت اور ضروری تھیں۔ ان سب کا مقصد ایک ہی تھا یعنی وہ انسانی دنیا کی بہبودی اور ترقی چاہتے تھے۔ سب پیغمبر واجب التعظیم ہیں۔ پیغمبر ہر ملک میں آئے ہیں۔ ہر پیغمبر کی عزت کرنی چاہیئے۔ سب پیغمبر دنیا کے لوگوں کو اتحاد و اتفاق کی تعلیم دیتے ہیں۔

دین :- وہ حقیقت جس کا خدا کی طرف ظہور ہوا اور جو انسانوں کی بہبودی کا صحیح ذریعہ ہے۔ حقیقت ایک ہی جو متعدد نہیں ہوتی اس لئے دین بھی ایک ہی۔ ہاں وہی حقیقت لباس جدید میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے اس لئے وہ مختلف صورتوں میں نظر آتی ہے لیکن ہے وہی ایک ہی حقیقت۔ اس واسطے وحدت ادیان یا اتحاد مذاہب ایک زبردست بنیاد ہے جس پر تمام قوموں کے

اتحاد کی تعمیر ہوگی۔ دین کے اصول کبھی نہیں بدلتے لیکن جزئیات ضرور بدلتے رہتے ہیں۔ دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ نوع انسان کے لئے ترقی کی راہیں صاف ہوتی جائیں۔ دین ہمیشہ تجدد حاصل کرتا رہتا ہے جیسا کہ حضرت آدم سے تا ایندم ہوتا چلا آیا ہے۔ بہائیوں کے عقیدہ میں آج دین حقیقت ایک نئی شکل میں جلوہ گر ہوا ہے۔

الہامی کتابیں: سب ایک ہی سرچشمہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ انکے لانے والے اگرچہ مختلف زمانہ میں ہوئے ہیں لیکن ان کا مدعا ایک ہی تھا۔ سب کتابیں حقیقت کی تعلیم دیتی ہیں۔ سب جو سکھاتی ہیں وہ سب ایک ہی منزل پر لیجاتی ہیں۔ ہر دور میں جو خدا کی طرف سے ایک مقرر مقدار کا ہوتا ہے۔ ایک الہامی کتاب شریعت نازل ہوتی ہے۔ اس کا دور ختم ہونے پر اس کتاب کی روحانی تاثیر بہت ہی کم ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کے ماننے والے قرون اولیٰ کی طرح ایمان و ایقان میں چست اور کامل نہیں ہوتے۔ اس وقت پھر خدا اپنے فضل سے جدید کتاب نازل کرتا ہے جو زندگی کا تازہ جام پلاتی ہے۔ خدا کی کتاب ہی حجت کاملہ ہوتی ہے۔ لوگوں کے تفسیری خیالات الہامی کتابوں کے برابر نہیں ہو سکتے ہیں۔ الہامی کتاب میں جو قدرتی طاقت ہوتی ہے وہ ایک نئی قوم بناتی ہے یا بالفاظ دیگر مردہ قوموں کو زندہ کرتی ہے۔ بکھری ہوئی جماعتوں کو ملاتی ہے۔

ترک تعصبات: بہائی تعلیمات میں سے ایک تعلیم ترک تعصبات ہے یعنی جنسی، وطنی، مذہبی، نسلی، لسانی وغیرہ ہر قسم کے تعصبات کا چھوڑ دینا ایک بہائی کا فرض ہے۔ دنیا میں مختلف فاتور کا خیال بالکل باطل ہے۔ تمام عالم صرف ایک ہے یعنی "انسان"، ہر طرح کی قومی تفریقیں جھگڑے ہیں انہیں دور کرنا چاہئے۔ تمام روئے زمین انسان کا وطن ہے۔ تمام زبانیں انسان کی ہیں جن کا مقصد اظہار ما فی الضمیر ہے۔ کسی کو کسی زبان سے نفرت نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن زبانوں کی کثرت کی وجہ سے انسانی تعلقات میں بہت کچھ مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ اسلئے بہائی تحریکات میں سے ایک تحریک لسانی عمومی کی بھی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ

تمام دنیا میں ایک مشترکہ زبان قائم کیجائے چنانچہ "اسپرنٹو" زبان کی ترقی میں بہائی سب سے آگے آگے ہیں جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا کی عمومی زبان ہوسکیگی۔

مساوات مرد و زن: بہائی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ ہے کہ مرد اور عورت کے حقوق برابر ہیں یعنی مالی اور تعلیمی حقوق میں مرد اور عورت کو یکساں ہونا چاہیئے۔ عبدالبہا کہتے ہیں کہ عالم انسانی ایک پرند کے مانند ہے جس کے دو بازو ہیں ایک مرد اور دوسرا عورت جب پرند کے بازو یکساں صحیح اور تندرست اور برابر قوت کے ہوں گے تو پرند خوب پرواز کرسکتا ہے۔ لہذا مرد و عورت کی مساوات ضروری ہے ورنہ عالم انسانی کا پرند ہوائے ترقی میں پرواز نہ کرسکے گا۔

تحصیل علم: بہائی تعلیمات میں سے ایک تعلیم فرضیت تحصیل علم ہے۔ نماز کی طرح ہر انسان پر فرض ہے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دلائے ابتدائی تعلیم جبری ہونی چاہیئے

کسب معاش: ہر بہائی پر فرض ہے کوئی نہ کوئی کام کرے جس سے دولت و ثروت پیدا کرے اپنے خاندان اور ناداروں کی امداد کرے اس کے ساتھ ساتھ گداگری بالکل قطعی حرام ہے۔ ہاں اگر اہاج لوگ ہیں تو انکے لئے متمول اور با ثروت لوگوں کو چاہیئے کہ ہر شہر میں محتاج خانے بنوائیں۔

انسداد غلامی: بہائیوں کے نزدیک غلاموں کا خریدنا بیچنا قطعی حرام ہے۔ بہائیوں کے نزدیک ہر طرح کی غلامی یعنی ذہنی اقتصادی اور دماغی غلامی کو دنیا کے تختہ سے اڑا دینا چاہیئے بہائی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ پیر و مرشد، مذہبی ملا شخصی حکومت اور سرمایہ داری غلامی کی زنگار رنگ زنجیریں انہیں توڑ دینا چاہیئے۔ مگر تشدد سے نہیں بلکہ قوت ضمیر اور تدبر سے۔

جمعیۃ الاقوام: بہائی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ بھی ہے کہ دنیا میں ایک بیت العدل قائم کیا جائے جس میں تمام اقوام کے نمائندے متحد ہو کر تنظیم عالم کی تدابیر اختیار کریں۔ جنگ کو دنیا سے اٹھادیں ہتھیاروں کو کم کردیں۔ باہمی رقیبانہ جذبات کو محبت کے جذبات سے بدل دیں۔

بہائیوں کے عقیدے میں یہ مندرجہ بالا احکامات خدائی احکام ہیں جو بہاء اللہ کے ذریعہ نازل ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ بہائی اسکو بھی مانتے ہیں کہ یہ سب باتیں ایک دن دنیا میں قائم ہو کر رہیں گیں۔

بہائی تحریک کی موجودہ رفتار ترقی

اس کے متعلق مختصراً عرض ہے کہ اس وقت دنیا کا ایسا کوئی ملک نہیں ہے جہاں بہائی کافی تعداد میں موجود نہ ہوں۔ ہر ملک میں بہائیوں کے اپنے ادارے موجود ہیں جس کے ماتحت بہائی مذہب کی نشر و اشاعت کرتے ہیں۔ ہر ملک اپنی قوت سے کام کر رہا ہے۔ ہر ملک میں بہت سے عالم و فاضل مرد اور عورتیں بہائی تحریک کو پھیلانے میں مصروف ہیں لیکن دنیا میں سب سے زیادہ ترقی اس تحریک کو امریکہ میں ہے امریکہ کی ایک کروڑپتی خاتون مسز ساف لاکر نے اپنی زندگی بہائی ازم کی تحریک کے نشر و اشاعت کے لئے وقف کر دی ہے۔ مسز موصوفہ نے سفر ہندوستان کے وقت ہماری جامعہ میں بھی تشریف لاکر بہائی تعلیمات پر ایک لیکچر دیا تھا۔ اور اسی طرح اعلیحضرت ملکہ رومانیہ بھی اسی تحریک کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے کوشش کر رہی ہیں۔

بہائی پریس

تعلیمات بہائی کی اشاعت کے لئے دنیا کے مختلف ملکوں میں مختلف ادارے ہیں۔ اخبارات اور رسائل کے نام تحریر کرتا ہوں۔

بہائی ائیر بک: ۔ یہ ضخیم اور مصور مجلہ نیویارک امریکہ سے سال میں ایک مرتبہ نکلتا ہے۔ جس میں تمام بہائی دنیا کی سالانہ رپورٹیں ہوتی ہیں۔

لانو واٹاگو: ۔ یہ ماہانہ رسالہ اسپرانتو زبان کی ترویج کے لئے شائع ہوتا ہے۔ اسکا مقام اشاعت برلن ہے۔

ہیرلڈ آف دی سنہوتھ :- یہ ہفتہ وار بہائی اصول کا آرگن ہے جو لیف نیوزی لینڈ سے نکلتا ہے۔

اسٹار آف دی ویسٹ :- یہ رسالہ ماہواری ہے انگریزی زبان میں چکاگو امریکہ سے شائع ہوتا ہے۔

خورشید خاور :- یہ رسالہ بھی ماہواری ہے اور فارسی و ترکی زبان میں عشق آباد روس سے نکلتا ہے۔

اسٹار آف دی ایسٹ :- یہ ماہانہ رسالہ انگریزی زبان میں ٹوکیو دار السلطنت جاپان سے شائع ہوتا ہے۔

چلڈرنس نیوز :- یہ ماہوار رسالہ کلیفورنیا سے بہائی بچوں کے لئے شائع ہوتا ہے۔

کوکب ہند :- یہ رسالہ ہر اتیسویں دن بہائی مہینہ کی پہلی تاریخ کو دہلی سے اردو زبان میں شائع ہوتا ہے۔ اور علاوہ ازیں یہ ادارہ بہائی اصول پر اردو کتابیں اور چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرتا ہے۔

کتاب الہدیٰ

قرآنمجید کی مضمون وار ترتیب میں معرکۃ الآرا تفسیر، جس کو سیٹھ یعقوب حسن صاحب نے ایام قید میں بڑی کاوش و محنت کے ساتھ مرتب کیا اور جسے تمام علماء کرام نے متفقہ طور پر قدیم التفسیر اور نہایت ہی مفید قاموس قرآن قرار دیا ہے۔ پہلا حصہ خلق مخلوقات (جو فی نفسہٖ خود ایک مکمل کتاب ہے)۔ **منیجر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی**

قیمت مجلد پارچہ چار روپے آٹھ آنے (للہ)

ریل کی سڑک اور قبرستان

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

ایک سال کے اندر اندر لارس مجلس نائبین کا صدر ہو گیا۔ سیونگ بنک کا بھی پریزیڈنٹ ہو گیا اور عدالت ثالثی کا سب سے زیادہ ذی اثر رکن بن گیا۔ الغرض جس جس عہدے اور منصب کی امیدواری کا اس کو استحقاق ہو سکتا تھا، اُن سب پر وہ بذریعہ انتخاب عام فائز ہو گیا!،

ضلع کی مجلس نمائندگان میں داخل ہونے کے ایک سال تک وہ مہر بہ لب رہا۔ لیکن دوسرے سال کے سیشن میں ایک خاص موقع کو منتخب کر کے اُس نے وہی پرہیجان منظر پیدا کر دیا جس کی نظیر وہ گرجا کی مجلس نائبین میں نڈ کے خلاف کر چکا تھا! یہاں بھی جو شخص جزدکل کا مالک اور سیاہ و سفید کا مختار رہا تھا اس کی مخالفت میں اچانک میدان میں آکر اُس نے ایسی اُس کی ہوا بگاڑی کہ اُس کو کامل شکست کا اعتراف کرنا پڑا۔ اور لارس پورے طور پر مظفر اور منصور ہو کر آئندہ اس نئے حلقۂ حکومت میں فرمان فرما بن گیا! اور یہاں پہنچکر اُس نے ملک کی پارلیمنٹ کی ممبری کی آخری معراج کی طرف پیشقدمی کی جہاں اُس کا شہرہ مقدمۃ الجیش بن کر پہلے ہی پہنچ چکا تھا لیکن دارالعلوم کے اس زبردست سیاسی اکھاڑے میں مدمقابل حریفوں کی کچھ کمی نہ تھی، یہی وجہ تھی کہ یہاں وہ کسی قدر دبا دبا رہتا تھا اگرچہ اپنی ذاتی پوزیشن کو سنبھالنے میں پورا مضبوط و مستقل تھا۔ وہ کسی ایسے حلقے میں صدارت دریاست کے مرکز پر قبضہ کرنیکی کبھی نا عاقبت اندیشانہ کوشش نہ کرتا تھا جہاں لوگ اُس سے پورے طور پر شناسا اور اُسکی قابلیتوں کے پورے مرتبہ داں نہ ہوں! اس کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ پارلیمنٹ میں کسی نمود و اقتدار کی جگہ پر گرفت حاصل کرنے کی ناکام جدوجہد میں وہ اپنے وطن اور ضلع کی مقامی مجالس کی علمبرداری بھی کھو بیٹھے!

اس لئے کہ اپنے گھر کی وہ حاکمانہ زندگی اُس کے لئے بہت ہی لذت انگیز تھی۔ جس وقت اتوار کے دن وہ گرجے کی دیوار کے پاس کھڑا ہوتا اور ساری نمازگذار جماعت آہستہ آہستہ اور مودب انداز میں اُس کے بازو سے گذرتی ہوئی اس کو سلام نیاز پیش کرتی اور گوشہائے چشم سے مشتاق اور دزدیدہ نگاہوں کے ساتھ اُس کو دیکھتی جاتی اور ہاں اسی پرشوکت جلوس کے کسی فرد سے (اُس کو کھڑا کرکے) ازراہ التفات دو چار باتیں کرلیتا، تو سچ مچ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے "تنکے" کے بل پر گرجا کی ساری سلطنت پر ایک مطلق العنان شہنشاہ کی سی حکومت کر رہا ہے!

واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے اس اعزاز و اقتدار کا بجا طور سے مستحق تھا۔ گرجا کے لئے جو خدمات اُس نے انجام دی تھیں اُنکا اعتراف نہ کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ اُس نے گرجا کو جانیوالی سڑک کو کھلوا دیا تھا، وہ نیا گرجا جس میں لوگ اب جماعت یا اجلاس کیا کرتے تھے، اُسی نے تعمیر کرایا تھا، اور یہ سب باتیں۔ معہ شے زائد کے۔ گرجا کے نئے قائم شدہ سیونگ بنک کے منافعوں کے اولین اثمار تھے۔ بنک کی یہ سرسبزی اور بارآوری بھی اُسی کی آبیاری کی رہین منت تھی کیونکہ وہی اسکا منتظم و مہتمم تھا۔ گرجا کی جائداد و وسائل میں روزافزوں اضافہ ہوتا رہا تا آنکہ وہ تمام دوسرے کلیساؤں اور مذہبی اوقاف کے لئے حکومت خود اختیاری اور عمدہ نظم و نسق کی ایک شاندار، قابل تقلید مثال بن گیا!

نڈا کرے پبلک سرگرمیوں کے میدان سے بالکل ہٹ آیا تھا۔ شروع شروع میں اس نے مجلس کی بعض نشستوں میں شرکت کی تھی کیونکہ اس نے بعض لوگوں سے یہ وعدہ کرلیا تھا کہ وہ حتی المقدور اس مذہبی مرکز کے لئے اپنی ناچیز خدمات پیش کرتا رہے گا۔ اگرچہ اس میں اس کو اپنی غیرت و خودداری کو تھوڑا مجروح ہی کرنا پڑے! مگر جب اُس نے اپنی نئی حیثیت سے پہلی تجویز پیش کی تو اس نے دیکھ لیا کہ اُس کے لئے میدان بالکل تنگ ہوگیا ہے اور اس کے کامیاب رقیب نے اُسکے لئے گرجا کی پبلک خدمت کی زمین اس قدر گرم کردی ہے کہ وہاں اب اُسکے قدم جمنا مشکل ہے۔ چنانچہ نڈ کی محولہ بالا قرارداد کی پیشی کے وقت مشاق لارس نے پہلی اصطلاحی شکل یہ پیدا کی کہ صاحب تجویز

سے یہ درخواست کی کہ وہ ازراہ کرم اُس کی تمام تفصیلات و جزئیات پر ذرا روشنی ڈالیں۔ تڈ کچھ ایسا سراسیمہ ہوا کہ فروحات کے اس مطالبہ کو قبل از وقت قرار دینے کی کوشش میں اُس کی زبان سے نکل گیا کہ: "جب کلمبس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا تو اُس نے وہاں آبادکاری کے پہلے ہی قدم پر ملک کو کلیسائی حلقوں میں تقسیم کیا تھا بلکہ یہ سب ارتقائی منازل رفتہ رفتہ از خود ظہور میں آگئی تھیں!" لارس نے اس خطیبانہ انداز بیان پر فوراً گرفت کی اور اپنے جواب میں کہا کہ "تب ہم کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ہمارے دوست تڈ آکرے کی تحریک ایک ایسا ہی عظیم الشان اور معرکۃ الآرا تاریخی کارنامہ ہے جیسا کہ براعظم امریکہ کا اکتشاف!"

یہ ہجو ملیح ایک قیامت تھی! اُسی دن سے فریب تڈ کا نام ہی مجلس میں "اکتشاف امریکہ" پڑ گیا!!

تڈ نے جان لیا کہ اپنا "عہد اقبال" اب ختم ہو چکا ہے! اب عوام اُس کو بجز مذاق کا نشانہ بنانے کے کسی اور مصرف کا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اُس نے پبلک خدمات کے تمام اخلاقی مقتضیات کی ذمہ داری سے اپنے کو بری سمجھ لیا، اور مجلس نگراں کار کے آئندہ انتخابات میں اپنے کو پیش کرنے سے انکار کر دیا!

لیکن اس نے اپنے بعض مشاغل کو ترک نہیں کیا اور انہیں پوری تندہی سے انجام دیتا رہا اور اپنی قسمت سے یہ امید وابستہ رکھی کہ ممکن ہے میں آئندہ کبھی کسی کام کا اہل سمجھا جاؤں۔ چنانچہ اُس نے اپنے سنڈے اسکول پر توجہ مرکوز کی، اُس کو کافی وسعت دی، اور مختلف قسم کے چھوٹے اور بڑے چندوں اور مالی اعانتوں سے وہ اسکو اس حیثیت میں لے آیا اور اُس کے سارے سررشتہ کا خود ہی "خود کردہ را خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" کے بمصداق مختار و سربراہکار قرار پایا اس مرکز کی شاخیں اور شعبے دور دور گرد و نواح کے اضلاع میں بھی تھے۔ تڈ کی اس جد و جہد پر لارس نے یہ معنی خیز فقرہ کسا کہ "جب تڈ آکرے کسی مقصد کے لئے روپیہ جمع کرتا ہے تو وہ پہلے سے طے کر لیتا ہے کہ یہ رقم وطن سے ہزارہا میل کے فاصلہ پر خلق اللہ کو فیضیاب کرے گی!"

لیکن دونوں کے حلقۂ کار کے حدود اب اس قدر علیحدہ تھے کہ آپس میں کسی تصادم کا موقع نہ رہا تھا، اور اُنکی دست و گریبانی بالفعل ختم ہو گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے بھی نہ تھے، لیکن کوچہ و بازار میں جب کبھی اتفاقیہ مڈبھیڑ ہو جاتی تو رسمی علیک سلیک اور مزاج پرسی ہو جاتی! لارس کا خیال ہی آنے پر نڈ کے دل میں ایک ٹیس پیدا ہوتی لیکن وہ اس جذبۂ کاوش و کاہش کو دباتا اور اپنے دل کو سمجھاتا کہ تقدیر ہی میں یہ لکھا تھا کہ ایک نظاہرا دنے حریف سے ایسی زک اٹھانی پڑی، شاید صورت معاملات ہی اس طرح آن پڑی تھی کہ اپنا یہ انجام ناگزیر تھا! الغرض اُس نے اپنے دل کو ڈھارس دے لی تھی اور لارس کی طرف سے شاید تمام خلش و پرخاش کو نکالدیا تھا۔

اب یہ سالہا سال کے بعد ایک محفل شادی کا موقع تھا۔ نڈ اور لارس دونوں اس تقریب میں شریک تھے اور دونوں بہت خوش خوش تھے۔ نڈ ایک کرسی پر کھڑا ہوا اور لارس کے اعزاز میں ایک مداحانہ تقریر شروع کی! اُس نے "گرجا کی مجلس نمائندگان" کے صدر اور کلیسائی حلقے کے اولین نمائندۂ پارلیمنٹ" کے شاندار القاب سے لارس کی شخصیت کی طرف اشارہ کیا اور اپنے وطن کی اس مایہ ناز ہستی کا جام صحت تجویز کیا! نڈ اپنی تقریر سے خود متاثر ہونے لگا اور گویا اپنے سامعین میں وہ خود ہی سب سے زیادہ ہمہ تن گوش تھا! حسب معمول اس نے اپنے خیالات بڑی خوبصورتی و خوش اسلوبی سے بیان کئے۔ سب لوگ نڈ کی عالی منشی" اور سینہ بے کینہ" کے قائل ہو گئے۔ لارس بھی قدم بڑھا کر اُس کے پاس آیا اور کسی قدر حجاب اور دزدیدہ نگاہی کے ساتھ اس نے مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ "اس وقت کا طرز عمل نڈ آگرے جیسی ممتاز شخصیت کے عین شایان شان تھا! سچ یہ ہے کہ مجھکو جو کچھ [redacted] سب میرے اسی محسن و مربی کے فیض صحبت کا طفیل ہے اور میری اس وقت جو کچھ بھی حیثیت ہے اُس کے لئے تمام و کمال میں اپنے اسی محترم دوست کا مرہون احسان ہوں!"

ان دیرینہ دوستوں میں خوشگوار تعلقات کی بحالی کا یہ نتیجہ ہوا کہ آئندہ انتخاب میں نڈ گرجا کی مجلس نگراں کا رکن پھر پریزیڈنٹ تھا!

لیکن لارس کو کچھ معلوم نہ تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟! اگر وہ ان خیز نگیوں کے ظہور کی پیش بینی کرلیتا تو اس وقت وہ نڈ کا کبھی حامی و مددگار نہ ہوتا اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لیکر اس کو ہرگز اس منصب پر نہ پہنچاتا!

جس وقت نڈ دوبارہ گرجا کی نمائندہ مجلس میں داخل ہوا ہے تو وہاں ایک خاص نقشہ پیش تھا۔ لارس کے زمانۂ قیادت میں مجلس کے ارکان کے اندر ذاتی کاروبار کرنے کا ایک بُرا دستور قائم ہوگیا تھا اور یہ چسکا اب اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ بالکل ایک "جنون" سے تعبیر کیا جاسکتا تھا۔ تاجرانہ اور قمار بازانہ طریق تجارت نے ایسے تباہکن نتیجے پیدا کئے تھے کہ ہر شخص کی مالی حیثیت سخت معرض خطر میں تھی اور یہ ناعاقبت اندیشانہ شوق اپنی قربانگاہ پر اب قربانیاں مانگ رہا تھا! عام طور پر کہا جاتا تھا کہ اس اندوہناک صورت حالات کا بانی مبانی لارس ہاگسٹیڈ ہے کیونکہ اُسی نے بالارادہ تعلیم و تلقین کرکے اپنا یہ غلط تاجرانہ مذاق ساری مجلس میں عام کر دیا تھا۔ خود مجلس نگران کار اپنی سرکاری حیثیت میں ایک سخت جوئے باز جماعت تھی اور وہی دوسرے متوسلین کلیسا کے لئے ایک گمراہ کن مثال بنی تھی۔ اب اس خبط کی ہمہ گیری کا یہ حال تھا کہ دو پیسہ کا مزدور بھی سٹہ باز بننے کے لئے تیار تھا اور ایک ایک کے چھکے چھڑانے کی دھن میں تھا! لوگ اس زر پرستی میں جیسے حریص بن گئے تھے ویسے ہی فضول خرچ اور اپنی عادات میں بے اصول بھی ہوگئے تھے۔ اس جنگ زرگری کا ایک سب سے ناگوار نتیجہ یہ تھا کہ روپیہ کمانے کی جدوجہد اور کشمکش میں لوگ ایک دوسرے کو حریف و رقیب ہوگئے تھے۔ آپس میں رشک و حسد کا مادہ پیدا ہوگیا تھا، جو نفرت و عداوت کی شکل میں مبدل ہو رہا تھا! "مسجد کے زیر سایہ خرابات" کا یہ رنگ حد درجہ افسوسناک [redacted] نوبت یہ تھی کہ باہمی بددعا نتیجوں اور بدمعاملگیوں کے نتیجہ میں عدالتوں میں ایک دوسرے [redacted] قائم ہوئے تھے۔ یہ سعادت بھی گرجا ہی سے منسوب کیجاتی تھی اس لئے کہ لارس نے چیرمین بن کر جو پہلی اصلاحی و تادیبی کارروائی کی تھی وہ گرجا کے کہن سال اور محترم امام پر بعض مشتبہ اور خیانت آمیز کارروائیوں کے سلسلے میں مقدمہ کا چلانا ہی تھا! اگرچہ اس مواخذۂ قانونی میں لارس کو کامیابی ہوئی تھی لیکن گرجا کی ایک مقدس ہستی

کو عدالتی دارو گیر میں جکڑنا اور اس طرح اس کو رسوا کرنا بجائے خود ایک نازیبا اور بیدردانہ بات تھی، چنانچہ اس مقدمہ پر اگر بعض لوگوں نے لارس کے عمل کو حق بجانب اور قابل تعریف بتایا تو بعض نے اس کی مذمت بھی کی۔ اس لئے کہ غریب امام کو اس ثابت شدہ الزام کے سلسلے میں اپنے کلیسائی منصب سے مستعفی بھی ہونا پڑا تھا۔

اب لارس کی بے راہ رویوں اور مجتہدانہ کارروائیوں کے نتائج بد سامنے تھے۔ آپس کی چپقلش اور اس کے سلسلہ میں نزاعوں اور مقدمہ بازیوں کا یہ انجام ہوا تھا کہ ہر شخص قلانشی اور تباہ ہو گیا تھا۔ لارس کے عہد حکومت کے زیر سایہ گرجا اور نواح گرجا میں ان مصائب کا آخر رنگ لایا اور رائے عامہ میں گرجا کی مجلس نگراں کار کی اس رہنمائی کے اثر و ہر دلعزیزی کے بارے میں ایک یکسر انقلاب ہو گیا! اور ان باغیانہ خیالات کو سربراہی کے لئے بہت جلد ایک لیڈر بھی مل گیا۔ یہ نڈآکرے تھا جس کو لارس ہی نے "مارآستین" بنا کر مجلس میں صدارت کے عہدے پر فائز کرادیا تھا!

معرکہ آرائی فوراً شروع ہو گئی۔ وہ سارے نوجوان جنہوں نے اپنے زمانہ طالبعلمی میں نڈ کے سامنے زانوے ادب تہ کیا تھا اب بڑے ہو گئے تھے۔ پبلک معاملات میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور گرجا کی مجلس نائبین کے بھی بڑے کامیاب اور صاحب اثر ممبر تھے۔ مجالس کی کارروائیوں میں وہ خوب طاق و مشاق ہو گئے تھے [redacted] ان کے ما و ما علیہ پر پورا عبور رکھتے تھے۔ یہی لوگ نڈآکرے کے علم کے نیچے جمع ہونے [redacted] اور لارس کا انہی سے مقابلہ تھا۔ یہ ساری جماعت بچپن ہی سے لارس پ [redacted] ر اس سے انتقام لینے کے لئے موقع کی منتظر تھی۔ ایک دن شام [redacted] کا ایک طوفانی اجلاس ختم ہو چکا تھا لارس اپنے مکان کے پیش در وازے پر کھڑا ہوا تھا اور سامنے نظر آنیوالے گرجا، اسکی اراضیات و متعلقات ایک خاص منظر پیش کر رہے تھے، ابر آلود مطلع میں اس نے زبردست رعد و برق سنی۔ ان سماوی تنبیہوں کو لارس کے واہمہ نے سیاسی موسم کے خوفناک تغیر کی علامات سے تعبیر

کیا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا کہ "جس دن ان لوگوں کی اقتصادی مصیبتیں اپنے عروج کو پہنچکر حادثہ پیش لائیں اُسی دن سے گرجا کے سیونگ بنک کا بھی خاتمہ ہے، اور اُسی کے ساتھ اقتدار کا بھی جنازہ اُٹھ جائے گا۔"

اسی کشمکش و چپقلش اور یاس و نا امیدی کا وقت تھا کہ ریلوے کے کمشنروں کی ایک ٹیم بسلسلہ تحقیقات اُدھر نکل آئی۔ یہ لوگ ایک نئی مجوزہ ریلوے لائن کے پیمائش و معائنہ پر مامور کئے گئے تھے۔ یہی گشت کرتے ہوئے ایک دن شام کو یہ انجنیر ہالسٹیڈ (لارس ہاگسٹیڈ کا گاؤں اور مسکن) میں وارد ہوئے۔ گرجا کے متعلقہ حلقہ اراضی میں داخل ہوئے۔ ہاگسٹیڈ پہلا قطعہ تھا ریلوے کمشنروں سے گفتگو کے دوران میں یہ حقیقت بے نقاب ہوئی کہ صیغہ ریلوے کے ارکان کے ہاں یہ تجویز زیر غور ہے کہ آیا جدید لائن اسی وادی سے نکالی جائے جس میں ہاگسٹیڈ وغیرہ کی زمینیں پڑتی تھیں۔ یا اُسی کے متوازی ایک دوسری وادی سے۔

ایک برق مثال تیزی سے اُس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ "اگر میں ریل کو اپنی زمین میں سے گذرنے کی اسکیم کو حکام ریلوے ہاں مقبول کرانیکی جدوجہد میں کامیاب ہوجاؤں تو اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یکبارگی ان گردوپیش کی اراضیات کی قیمتیں دوچند سہ چند ہو جائیں گی اور نہ صرف میں اس آنے والی تباہی سے بچ جاؤں گا بلکہ میرا نام زندہ جاوید ہوکر پشتہا پشت تک مشہور ہوگا۔ یہ اتنا دلفریب اور امید پرور خیال تھا کہ اُس کی دلکشی کے تصور میں وہ ہمہ تن غرق ہوگیا اور خوشی کی شدت میں ساری رات اس کو نیند نہ آئی یا وہ ایک نظروں کو خیرہ کرنیوالی روشنی اپنے عالم تخیل میں دیکھتا تھا اور انہماک و استغراق میں اس کو کبھی کبھی ریل گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ تک مسموع ہوتی تھی!

دوسرے دن صبح جب ریلوے والے زمین کو دیکھنے کے لئے نکلنے لگے تو اُس نے اپنا گھوڑا گاڑی اُنکو لیجانے کے لئے پیش کی، چنانچہ گاڑی انکو لے بھی گئی اور واپس بھی لائی۔ لارس اس تمام "گردآوری" میں اُنکے ہمرکاب تھا۔ دوسرے دن جب وہ دوسری وادی کے

معائنہ کے لئے جانے لگے تو اُس دن بھی اُس کی سواری اُنکے لئے حاضر تھی اور وہ خود بھی حسب معمول انکی دمبالہ روی میں تھا! کمشنر لوگ ہاگسٹیڈ کے موقع کی خوبصورتی سے بیحد متاثر ہوئے۔ روانگی کے وقت ان لوگوں کے اعزاز میں ایک عظیم الشان الوداعی جلسہ کا لارنس نے اہتمام کیا اور گرجا کی آبادی کے تمام سربرآوردہ لوگوں کو شرکت کی دعوت دی جلسہ بہت کامیاب رہا اور اُسکی ہنگامہ خیزیاں شام سے صبح تک جاری رہیں! لیکن افسوس کہ اصلی غرض وغایت کے اعتبار سے یہ ساری مصیبتیں بیجا ثابت ہوئیں کیونکہ ریلوے کے ہندسین جتنا غور کرتے تھے اس فیصلہ کی معقولیت اُن پر ظاہر ہوجاتی تھی کہ زیر پیمائش لائن کا ہاگسٹیڈ والے خطے سے لیجانا غیر ضروری مصارف کو برداشت کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس وادی کا دروازہ ایک تنگ اور دشوار گذار درہ میں سے ہوکر تھا اور جو ندی اس میں بہتی تھی وہ برسات کے موسم میں اس نواح میں ایک سیلابی کیفیت پیدا کردیتی تھی۔ پس اس طرح دو ہی چارہ کار تھے: یا تو لائن پہاڑی کے پہلو پہلو معلومہ پیدل شاہراہ کے محاذ میں نکالی جائے اور اس طرح اُس کو بلاوجہ ایک غیر معمولی بلندی تک لیجایا جائے اور ساتھ ہی ندی کو دو جگہ سے عبور کرنے کے لئے دُہرے دُہرے پل تعمیر کئے جائیں، اور یا پھر یہ ریل کی سڑک بخط مستقیم چلے اور اُس قدیم قبرستان میں سے گذرے جو اب غیر مستعمل تھا۔ گرجا کو اس موقع سے منتقل کئے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا اور ماضی قریب ہی میں آخری میت کی تجہیز وتدفین کے مراسم یہاں عمل میں آئے تھے۔

واقعی کون تھا سچّا شاعر؟

از جناب احتشام الدین صاحب ایم اے

گذرے اُردو کے ہر ایک عہد میں صدہا شاعر
شہر و قصبات میں دیہات میں ہر جا شاعر

مختلف قسم پہ ہے یہ بھی جماعت تقسیم
کوئی ادنیٰ کوئی اوسط کوئی اعلےٰ شاعر

چند اقسام پر اُن کی ہے ممکن تقسیم
کوئی کورا کوئی کچّا کوئی پکّا شاعر

ہیں جو انسان تو ہیں عیب زدہ بھی بے مثل
کوئی اندھا کوئی کانا کوئی لنگڑا شاعر

ذوق ہر ایک کا جدا طرز جدا رنگ جدا
کوئی میٹھا کوئی پھیکا کوئی روکھا شاعر

محفل شعر میں غول شعرا کیا دیکھا
کوئی ٹیڑھا کوئی بانکا کوئی بونگا شاعر

بعض کی وضع سے ظاہر ہے پٹھیچر ہونا
کوئی گدڑا کوئی چیتھڑا کوئی اُدھڑا شاعر

بعض فی "احسن تقویم" کے پتلے یعنی
کوئی پھپّس کوئی لمبا کوئی پدڑا شاعر

خوشنوائی کا سر بزم یہ عالم دیکھا
کوئی گونجا کوئی کڑکا کوئی ریمکا شاعر

لحن داؤدی بعضوں کو دیا قدرت نے
کوئی بلبل کوئی طوطی کوئی مینا شاعر

جس کے اشعار کہے جا سکیں اچھے نہ بُرے
بے مزہ اُس کا کلام اور وہ پھیکا شاعر

جو قصیدہ و غزل مثنوی تینوں میں کسی
صنف میں چل نہ سکے ہے وہی لنگڑا شاعر

بعض بحروں میں طبیعت ہو رواں بعض میں بند
ایک طرف سے اُسے کہہ سکتے ہیں کانا شاعر

صرف موزوں ہو کوئی بات نہ جس میں نکلے
اور کیا کہئے جو نہ کہئے اُسے کورا شاعر

درد اور الف سے اشعار ہوں خالی جس کے
کیا کلام اس میں جو کہئے اُسے روکھا شاعر

کر سکے جو نہ رجز اور رمل میں تمیز
شاعروں میں وہ بلاشبہ ہے اندھا شاعر

جو سر بزم غزل اپنی سناتے شرمائے
مرد وا ہو کے وہ بنتا ہے زنانہ شاعر

جو غزل اور کی سنکر نہ غزل اپنی سنائے
گو جگہ سے نہ ٹلے ہے وہ نگوڑا شاعر

جو سنانے میں غزل شعر کی صورت بن جائے
نقل محفل ہے وہ آپ اپنا تماشا شاعر

گا کے محفل میں جو داد اپنے سخن کی چاہے
کیا خبر ہے وہ سخنور کہ گویا شاعر

زہد اور تقوے سے لبریز ہوں جس کے اشعار
زیب دیتا ہے لقب اُسکا ہو مُلّا شاعر

جس کو تعقید و غلو اور اضافت کا مرض
نہیں شاعر وہ حقیقت میں ہے بنتا شاعر

شوق شاگردوں سے ہو جسکو اور اصلاح کا رٹ
"کام شاعر" پھرے آواز لگاتا شاعر

جس کے ممدوح بکثرت ہوں قصیدے ازاں
بھیک کیوں مانگے نہ وہ لیکے طنبورا شاعر

جس کے اشعار میں ہو حسن طلب کی کثرت
شعر کہتا ہے وہ یا پیٹ بجاتا شاعر

ہم بتائیں گے تو وہ رائے ہماری ہوگی
کیا خبر کون ہو مرغوب تمہارا شاعر

جرأت و سوز کوئی مصحفی و میر کوئی
کوئی چرکین و زٹل اور کوئی انشا شاعر

جتنے شاعر ہیں غرض اُتنی ہی قسمیں اُن کی
ایک سے ایک مشابہ نہیں پورا شاعر

غالب و میر و نظیر اکبر آبادی تینوں
آگرے میں ہوئے یہ نام کو پیدا شاعر

ہے مگر یہ بھی مسلم نہیں محتاج ثبوت
ان کو دلی ہی کی گلیوں نے بنایا شاعر

لیکے دیوان نہ خود دیکھ لو کیا پوچھتے ہو
کون اچھا تھا یہاں کون برا تھا شاعر

گرچہ سچا تھا مگر کچا تھا افسوس نظیر
اور غالب وہ تصنع سے بھرا تھا شاعر

چیستاں طرز سخن، معنی و مطلب مجہول!
عرض مطلب میں جو قاصر ہو وہ گونگا شاعر

سیل و طوفان و غریو طبل جنگ کہو
سیدا نشا تھا غرض زور بلا کا شاعر

درد میں درد و تصوف کا مزا ملتا ہے
اور مومن کو بھی سب کہتے ہیں اچھا شاعر

پختہ سودا تھا ہوا ذوق بھی کامل فن میں
مانتے اس کو مخالف بھی ہیں پورا شاعر

جرأت و مصحفی و سوز ہر ایک میں ایک بات!
کوئی پورا کوئی آدھا کوئی پونا شاعر

اُنگلی ایک ناک پہ انداز سے بولے رنگیں
جان صاحب بھی تھا کیا کوئی نگوڑا شاعر؟

میر جعفر کی زمیں میں بھی ہے جدت موجود ۔ گو کہ چرکین بھی موجد تھا پہ گندا شاعر
سادگی لطف زبان طرز ادا کی شوخی ان سے تسلیم ہوا داغ بھی یکتا شاعر
پختہ شاعر تھے امیر احمد مینائی بھی کہنہ مشاق مگر قافیہ پیما شاعر
جو دو غزلہ سے بھی بڑھ جائے سہ غزلہ کہئے شعر کہتا نہیں ہے جان کو آتا شاعر
مرثیہ قوم کا حالی نے بھی اچھا گایا بن گیا قوم کا ممدوح وہ بگڑا شاعر
شاعری چیزے دگر چیزے دگر استادی سخت مشکل کسی استاد کا ہونا شاعر
کم ہوئی جمع یہاں شاعری و استادی شعر و فن دونوں میں کامل تو ہے عنقا شاعر
ہاں مگر میر کہ شاعر بھی ہے استاد بھی ہے جس کو ہر عہد کے استاد نے مانا شاعر

آج بھی جس نے کلام اسکا پڑھا بول اٹھا
میر تھا میر تقی میر تھا تنہا شاعر!

انتخاب میر

حضرت میر تقی میرؒ کے کلام کا دلکش انتخاب معہ حالات و مقدمہ جس میں آپ کی خصوصیات و امتیازات شاعری پر دلچسپ بحث ہے از مولنا نورالرحمٰن صاحب بی۔ اے (علیگ) خوبصورت و مضبوط جلد عمدہ طباعت و کتابت۔

قیمت صرف ایکر و پیہ (عہ)

غزل

از حضرت اصغر

یہ راز ہے میری زندگی کا
پہنے ہوئے ہوں کفن خودی کا

پھر نشترِ غم سے چھیڑتے ہیں
اک طرز ہے یہ بھی دل دہی کا

کونین پہ اک نگاہ نفریں
اللہ رے دماغ بے دلی کا

پھر ڈھونڈھ رہا ہوں بیخودی میں
کھویا ہوا لطف آگہی کا

مجھکو نہیں جسم و جاں کی پروا
سودا ہے اک اور زندگی کا

الفاظ و بیان میں چھپنے والے
اب قصد ہے اور خامشی کا

مرنا تو ہے ابتدا کی اک بات
جینا ہے کمال منتہی کا

عالم پہ ہے اک سکون بیتاب
یا عکس ہے میری خامشی کا

ہاں! سینہ گلوں کی طرح کر چاک
دے مر کے ثبوت زندگی کا

یاس ایک جنون ہوشیاری
امید فریب زندگی کا

جنگی بیڑے

آج کل لندن میں مختلف دول کے نمائندوں کا جو اجتماع اس غرض سے ہوا ہے کہ جنگی بیڑوں کی روز افزوں قوت کے لئے کوئی حد مقرر کرے۔ اس کی کارروائی ہر اس شخص کے لئے نہایت اہمیت رکھتی ہے جسے دنیا کے سیاسی مستقبل سے کچھ بھی تعلق ہے۔ ذیل میں ہم چند اعداد و تشریحات اس لئے درج کرتے ہیں کہ اس کانفرنس کی کارروائی کو صحیح طور پر سمجھنے میں مدد ملے۔ ۱۹۱۴ء میں جرمن بیڑے کی بڑھتی ہوئی قوت نے انگلستان کو جنگ میں شریک کرایا۔ دنیا کو اس مصیبت میں مبتلا کیا جو جنگ عظیم کے نام سے تاریخوں میں یاد رہے گی۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں جرمن بیڑے پر سالانہ جو خرچ ہوتا تھا اس سے سہ چند سے بھی زیادہ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے گذشتہ سال میں اپنے بیڑے پر خرچ کیا یعنی ایک ارب ۱۲ کروڑ اڑتیس لاکھ روپیہ کے قریب! انگلستان نے بھی اس سال میں کوئی ۸۲ کروڑ روپیہ اپنے بیڑے پر صرف کئے۔

جرمنی کے پاس ۱۹۱۴ء میں جتنا بیڑا تھا آج امریکہ کے پاس اس سے ۳ لاکھ ٹن زیادہ وزن کا بیڑہ موجود ہے۔

دنیا کی سربرآوردہ دول کے بیڑوں کے وزن درج ذیل ہیں:-

ملک	تیار جہاز (ٹن)	جو جہاز تیار ہو رہے ہیں (ٹن)	میزان (ٹن)
امریکہ	۱۳۲۹۳۵۳	۲۰۴۰۲۰	۱۵۳۳۳۷۳
برطانیہ	۱۵۸۷۰۳۷	۱۷۸۶۴۰	۱۷۶۵۶۷۷
جاپان	۹۱۵۵۴۷	۹۰۹۴۰	۱۰۰۶۴۸۷
فرانس	۵۴۸۵۶۳	۱۶۱۰۰۳	۷۰۹۵۰۶
اٹلی	۴۰۷۴۰۵	۱۱۶۹۷۹	۵۲۴۳۸۴

ملک	تیار جہاز (ٹن)	جو جہاز تیار ہو رہے ہیں (ٹن)	میزان (ٹن)
جرمنی	۱۲۳۲۹۰	۳۴۰۰۰	۱۵۷۲۹۰
روس	۱۳۳۰۲۶	۱۵۲۰۰	۱۴۸۲۲۶

ان ملکوں کے جنگی بیڑوں میں جو آدمی کام کرتے ہیں انکی تعداد یہ ہے :-

امریکہ	۹۳،۳۲۳
برطانیہ	۸۹،۰۰۷
جاپان	۸۱۵۹۵
فرانس	۶۰۸۳۴
اٹلی	۴۵۲۹۷
جرمنی	۱۴۹۱۷
روس	۳۲۰۰۰

پچھلے پچیس سال کے اندر جنگی بیڑوں پر سالانہ خرچ میں جو حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے (سوائے جرمنی اور روس کے جہاں کمی ہو رہی ہے) وہ اعداد ذیل سے ظاہر ہو جائے گا :-

ملک	سنہ ۱۹۰۴ء	سنہ ۱۹۲۹ء	اضافہ یا تخفیف
امریکہ	۱۰۹۱۹۶۱۲۳	۳۷۴۶۰۸۰۵۴	+۲۶۵۴۱۱۹۳۱
برطانیہ	۱۷۳۵۴۸۰۵۸	۲۷۸۴۸۷۰۰۰	+۱۰۴۹۲۹۹۴۲
جاپان	۱۷۵۵۳۲۷۹	۱۳۱۲۲۲۷۲۲	+۱۱۳۶۶۹۴۴۳
فرانس	۵۹۷۴۰۲۲۲	۹۹۵۶۸۰۰۰	+۳۹۸۲۷۷۷۸
اٹلی	۲۳۵۲۲۴۰۰۰	۶۳۶۲۲۹۸۲	+۴۰۱۰۰۵۸۲
جرمنی	۵۰۵۴۴۰۰۰	۴۷۰۶۴۰۱۹	-۲۷۷۹۹۸۱
روس	۶۰۰۱۸۸۹۵	۴۲۳۲۹۲۸۹	-۱۷۶۸۹۶۰۶

کانفرنس میں جو جو قومیں شریک ہیں ان میں سے بعض چاہتی ہیں کہ بڑے جنگی جہاز بالکل بند یا کم کر دئے جائیں۔ کوئی آبدوزوں کے خلاف ہے کوئی کروزروں کی تعداد گھٹانا چاہتا ہے۔ اس لئے یہ معلوم ہونا بھی مفید ہوگا کہ ان مختلف اقسام کے جہازوں کی تیاری پر کیا لاگت آتی ہے اور سال بھر میں ہر ایک پر کتنا خرچ پڑتا ہے :۔

اوسط جنگی جہاز تقریباً ۱۰ کروڑ روپیہ میں تیار ہوتا ہے۔

اوسط کروزر " ۵ کروڑ میں

اوسط آبدوز " پونے دو کروڑ میں

ایک جنگی جہاز پر کل سالانہ خرچ تقریباً ۶۰ لاکھ روپیہ ہوتا ہے۔

ایک کروزر پر " " ۴۰ لاکھ روپیہ ہوتا ہے

ایک آبدوز پر " " ۱۳ لاکھ روپیہ ہوتا ہے

شذرات

"خود ہمارے ملک میں کیا کم کانفرنسیں ہوتی ہیں کہ ہم لوگ دنیا کے دوسرے سیاسی یا دیگر اجتماعوں کو بھی مستحق توجہ سمجھیں" یہ وہ جواب ہے جو لندن بحری کانفرنس کا ذکر آنے پر ہمارے ملک کے ایک ممتاز سیاسی کی زبان سے سنا گیا۔ اگر اس کے معنی ان بے معنی کانفرنسوں سے بیزاری کے ہیں جو صرف دفع الوقتی یا شخصی اقتدار کی خاطر ہمارے ہاں آئے دن ہوتی ہیں تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اگر دنیا سے بے تعلقی یا سیاسی قوتوں کے باہمی تاثرات سے بے خبری اس کی وجہ ہو تو افسوس ہے۔ شاید لندن کانفرنس ہم ہندوستانیوں کے لئے بڑی دلچسپی کی چیز بن جائے۔ اگر ہم کو معلوم ہو کہ اس کے فیصلوں کی وجہ سے ممکن ہے کچھ عرصہ بعد ہندوستانی سپاہی اسی فرانس کو فتح کرنے کے جائیں جس کو جرمن "بربریت" سے بچانے کے لئے انہوں نے ۱۵ سال قبل اپنا خون پانی کی طرح بہایا تھا۔ اور اسی جرمنی میں جہاں ہمارے سپاہی صرف جنگی قیدی کی طرح جاتے تھے۔ ہماری افواج کا خیر مقدم تہذیب و تمدن کے محافظوں کی حیثیت سے ہو۔ اسی طرح ہم اس کانفرنس کی روئداد سے بے تعلق نہ رہیں اگر ہم جانیں کہ اٹلی اور فرانس کے باہمی تعلقات پر اثر ڈال کر یہ سارے شمالی افریقہ کے مستقبل پر کتنا گہرا اثر ڈالے گی اور بالواسطہ ترکوں سے کے انگلستان و اٹلی کے ساتھ یا روس و فرانس کے ساتھ ہو جانے کا فیصلہ بھی شاید اسی کانفرنس کے نتائج پر مبنی ہو۔

ہم لندن کانفرنس کے ظاہری مقصد یعنی مختلف دول کی بحری قوت پر پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کے متعلق کسی دوسری جگہ چند اعداد دیتے ہیں جن سے معلوم ہو سکے گا کہ دنیا کی یہ عقل فرزانہ قومیں طاقت کے کس جنون میں مبتلا ہیں۔ کانفرنس کے پوشیدہ سیاسی نتائج و امکانات پر کسی

آئندہ اشاعت میں کچھ لکھیں گے۔ اس وقت ہم ناظرین کی توجہ موجودہ یورپین سیاست کی ایک خصوصیت کی طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں جو خود ہمارے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے۔

جنگ عظیم سے قبل کا یورپ باوجود اپنی اندرونی رقابتوں کے جنہوں نے بالآخر اس مہلک جنگ کی شکل اختیار کی، ایک مشترک خیال رکھتا تھا۔ یعنی مغربی تہذیب کے دوسرے تمدنوں اور تہذیبوں سے برتر و افضل ہونے کا یقین اور ان "پست" اور "نیم متمدن" قوموں سے ہر قسم کا سیاسی اور معاشی فائدہ حاصل کرنے کا خدا داد حق۔ جنگ نے اس یقین کو متزلزل کر دیا اور اس حق کو تقریباً مٹا دیا۔ خود ساری مغربی دنیا دو ٹکڑے ہو گئی اور جنگ کے ختم ہونے کے ۷-۸ سال بعد تک یہ ٹولیاں تقریباً اس طرح بندھی رہیں۔ لیکن یورپ نے محسوس کر لیا کہ معاملہ اس طرح زیادہ دن نہیں چل سکتا۔ دشمن دوست کی پرانی تقسیمیں آخر کب تک قائم رکھی جائیں۔ دول یورپ نے پھر اپنے تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش شروع کی۔ ۱۹۲۴-۲۵ء میں یورپین سیاست نے ایک کروٹ لی۔ سیاسی فضا بدلی۔ ہر طرف اتفاق و اتحاد کے چرچے ہونے لگے۔ اور سب ملکوں کے سیاسی خطیبوں کی متحدہ کوشش نے وہ چیز پیدا کر دی۔ جسے "لوکارنو کی ذہنیت" کہا جاتا ہے۔ لیکن خطیبوں کا پیدا کیا ہوا اتحاد بہت اتھلا اتحاد ہوتا ہے۔ چنانچہ یورپ میں بھی تھوڑے دن تو اتحاد و اتفاق کی یہ غیر حقیقی فضا رہی۔ مگر جب ہر ملک کے مدبروں نے اس فضا میں اپنے حقیقی مسائل کا حل نکالنا چاہا تو یہ اتفاق و اتحاد مشکل نظر آیا اور ہر قوم نے سمجھ لیا کہ ایک متحدہ یورپ بنانے کے لئے پہلے اپنے مخصوص مقاصد کی نگہبانی کر لینی چاہئے تاکہ جب مغربی تہذیب کے متحدہ ایوان کی بنیادیں پڑیں تو انکا مخصوص گوشہ نظر انداز نہ کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی سب با اثر اور مقتدر قومیں آج یورپ اور دنیا کے مستقبل کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھ رہی ہیں۔ ہر ایک کسی خیال، کسی تصور کا حامل اور حامی بنا ہوا ہے اور اس سے اپنی سیاست میں کام لے رہا ہے۔

انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ اینگلو سیکسن نسل اور انگریزی زبان کے اتحاد کے تصور کے زیر اثر اپنی رقابتوں کو طے کرنے پر آمادہ ہیں۔ خود برطانیہ میں سلطنت کے تصور کو پھر بہت فروغ دیا جا رہا ہے۔ ہوور اور میکڈانلڈ کی گفتگوؤں میں امریکہ کے صدر نے اگرچہ بالکل واضح کر دیا کہ ہمیں یورپ کے معاملات میں دخل دینے کی خواہش نہیں۔ یہ کام اینگلو سیکسن دنیا کی طرف سے انگلستان کو انجام دینا چاہئے، اور اس وقت سے یورپین سیاست میں انگریزی وزارت خارجہ کی بات کا وزن بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن موجودہ وزارت بظاہر بالڈون کی کمزور وزارت سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لے رہی ہے اور یورپ کی سیاسی الجھنوں میں آلودہ ہونے کے بجائے پوری کوشش کر رہی ہے کہ سلطنت برطانوی کے تصور کو زیادہ قوی کیا جائے۔ لارڈ بیور بروک نے اپنے سارے اخبارات اس خیال کی حمایت و اشاعت کے لئے وقف کر دئے ہیں، لارڈ ملنجت نے معاشی حلقوں کو اسکا ساتھی بنا دیا ہے۔ مصر سے معاملہ اور ہندوستان کو کانفرنس کا بلاوا اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ اس سال سلطنت برطانیہ کی جو کانفرنس ہوگی اس سے بھی تصور اتحاد کو بہت کچھ تقویت دیجائے گی۔

اپنے مخصوص مقاصد اور حد انتصب العین کا احساس اٹلی میں بھی بہت قوی ہے۔ اس نے فاشزم کے نئے مسلک کو فروغ دے کر اپنی ساری قومی زندگی کو اس کے تحت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ نیز دیگر ممالک میں جہاں پارلیمنٹی حکومت کے نقائص ظاہر ہو رہے ہیں اس تصور کو پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے وہ جنوب و مغربی یورپ میں بھی اپنا تسلط چاہتا ہے۔ اور شمالی افریقہ میں بھی۔ لیکن قوم میں ریاست کا ایک نیا تصور پیدا کر کے ایک نئے خیال کی تخلیق اور توسیعی قوت سے کام لے کر۔

فرانس کے جذبہ وطنیت اور اپنی تاریخی و تمدنی قوتوں پر اعتماد کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ وہ

یورپ ہی میں نہیں، افریقہ میں بھی اپنی زندگی و ہوسناکی کا سکہ جمانے کے درپے ہے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۹ء میں یورپ کے اندر اسکا بنا ہوا نقشہ ذرا بگڑنے لگا تھا۔ لیکن ۱۹۳۰ء سے یہ برابر اس کو مضبوط کرنے میں ساعی ہے۔ اس کی سیادت میں ائتلاف صغیر کی ریاستوں نے جو فوجی اور معاشی معاہدے کئے ہیں اُن سے اسکا ثبوت ملتا ہے۔ فرانس ہی یورپ میں اس وقت ایسی قوم ہے جس نے دس سال سے بھی زیادہ سے ریاستوں کا ایک جتھا بنا رکھا ہے جس پر اس کے نزدیک یورپ کے آئندہ امن چین کا بڑی حد تک دار و مدار ہے۔ یہی ایک ملک ہے جو اپنی مخصوص روایات، اپنی ملک پرستی کے باعث اپنے ماحول کے تغیرات و انتشارات سے سب سے کم متاثر ہے۔

جرمنی جو ابھی تک جنگ عظیم کے زخموں سے چور ہے وہ بھی جہاں یورپ کی دوسری قوموں کے اختلافات سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے وہاں اس سے بھی بے خبر نہیں کہ بغیر اپنے کسی مخصوص قومی خیال اور مقصد کے اسکا آگے بڑھنا مشکل ہے۔ اس نے بھی جرمانی الٰسان وسطی یورپ کے اتحاد کو اپنا قومی مقصد بنایا ہے۔ اور اس کے لئے نہایت مستعدی اور بہت کچھ کامیابی کے ساتھ ساعی ہے۔

روس تو تہذیب حاضر کی بنیادوں ہی کو بدل دینے کے درپے ہے اور اس نے اپنے نئے خیال کے ساتھ بے مایہ اور نادار طبقہ کی تلخی روحانی اور کرب قلبی کو ملا کر دنیا کی سیاست اور دنیا کی ذہنیت میں ایسے انقلاب کی طرح ڈالی ہے جس کی کامیابی یا ناکامی، نتائج و عواقب کی اہمیت و ہمہ گیری کے لحاظ سے تاریخ عالم کی بڑی سے بڑی تحریک کی کامیابی یا ناکامی کے ہم پلہ ہوگی۔

ان سب باتوں کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ ان سے ہندوستان کی موجودہ سیاست خصوصاً مسلمانانِ ہند کی سیاست کے لئے سبق ملتا ہے۔ یورپ کی طرح ہندوستان میں بھی تقریروں اور قراردادوں اور جلسوں اور اخباری تحریروں کے زور پر جسم سیاسی کے دو اہم ترین حصوں یعنی ہندو اور مسلمانوں میں، اتحاد و تعاون کی سبیل نکالی گئی تھی۔ یہ کوشش کامیاب ہوئی لیکن دیرپا نہ ہو سکتی تھی نہ ہوئی۔ یورپ کی طرح ضرورت تھی کہ مقرروں کی جگہ مرتب ذہن اور ٹھنڈے مزاج کے لوگ قومی مقاصد کا تعین کر کے معاملات میں مفاہمت کی کوشش کریں۔ مفاہمت نہ ہو سکے اور اختلافات اصولی ہوں تو ہاں لڑیں جھگڑیں بھی۔ لیکن یہ جانکر کہ کس چیز کے لئے لڑ جھگڑ رہے ہیں اور ایسی چیز کے لئے جس پر لڑنا جھگڑنا کسی جماعت کے شایانِ شان ہو ایسی چیزوں کے لئے جن میں عملی انہماک اس بات کا زندہ ثبوت دیتا ہو کہ یہ جماعتی زندگی کے لئے اصولی چیزیں ہیں جنہیں پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔

ہندوؤں میں ہندو مہاسبھا نے مخصوص ہندو اغراض کی تنگ دلی اور کوتہ بینی کے ساتھ ترجمانی کی لیکن ایک نہایت محدود قسم کی وطن پرستی کے علاوہ جو ایک مخصوص گروہ کی فلاح کی کوشش سے عبارت تھی اس نے خود ہندو قوم کے سامنے کوئی مثبت تصورِ تعمیری پیش نہیں کیا۔ تنفر اور بیزاری کے منفی جذبوں پر اپنے کام کی بنیاد رکھکر اس نے اس کام کی ناپائداری اور بے وقعتی کا انتظام کر لیا ہے۔ مسلمانوں میں بھی کسی جماعت نے کوئی مثبت مطمح نظر سیاسی اور تمدنی زندگی کا نہ اپنے لئے بنایا نہ دوسروں کے سامنے پیش کیا۔ افسوس کہ مقرروں اور خطیبوں کے بعد جن مدبروں کی ضرورت تھی وہ ہم میں نہ نکلے۔ اور ہم جب ملک کی دوسری جماعتوں سے ملے تو اس وقت بھی کوئی مخصوص اسلامی مطمح نظر ہم نے پیش نہیں کیا۔ کوئی مطمح نظر جو ہمارے مخصوص حقوق کو حق بجانب ہی نہ بناتا بلکہ خود ملک کی سیاسی اور تمدنی زندگی کو اپنے اثر سے بہتر اور جامع تر بنا سکتا۔ ہم جب اٹھے تو اس وقت بھی ہم نے تمدنی

زندگی کے کسی خاص تشکیل، قومی زندگی کے کسی خاص ذہنی عنصر کی خاطر ایسا نہیں کیا یا اگر کیا تو بے جانے اور اوروں کو جتائے بغیر۔ ہر شخص مسلمانوں کے لئے مخصوص نیابت کا حق مانگتا ہے، ہر شخص انکے لئے جگہیں محفوظ کرانا چاہتا ہے، نیابتی جماعتوں ہی میں نہیں ملازمتوں میں، مدرسہ میں طالبعلموں کی تعداد میں، وظائف میں، خطابوں میں، انعامات میں۔ لیکن کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں بتلاتا کہ حیات قومی میں مسلمان کن مفید چیزوں کے حامل ہیں، کن اچھے مقاصد کے حامی ہیں، زندگی اور اسکے مسائل کے حل کے لئے کیا خاص نقطۂ نظر انکے اثر سے فروغ پا سکتا ہے، یہ خود اپنی کن چیزوں کی حفاظت کے لئے نمائندگی و نیابت میں تحفظ کے طالب ہیں، اب اس وقت اپنی کوشش اور عمل سے اپنی جماعتی زندگی کے لئے ان چیزوں کے ضروری و لابدی ہونے کا کیا اور کتنا ثبوت دے رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ خود ہماری سیاسی زندگی میں آج جتنا انتشار ہے شاید پچھلے پچاس سال میں کبھی نہیں ہوا۔ کوئی مسلمانوں کے نام سے اپنی حیثیت کے سدھارنے یا برقرار رکھنے میں ساعی دکھائی دیتا ہے۔ کوئی اپنے لئے نوکری چاہتا ہے۔ کوئی اپنے عزیزوں کے لئے۔ کوئی خطاب کا طالب ہے۔ کوئی بس ایک تبسم لطف آمیز کا۔ یہ سب چیزیں محدود ہیں اور کچھ کو ملجائیں تو لازماً کچھ کو محروم رہنا پڑتا ہے۔ اس لئے ہر شخص کامیابوں کے زمرہ میں داخل ہونے کے لئے دوسروں کی ناکامی کا ارادۃً یا بلاارادہ سامان کرتا ہے۔

اگر مسلمانوں کا مطالبہ حقوق واقعی چند اشخاص کے شخصی فائدہ یا نقصان کا معاملہ ہوتا تو اس میں کچھ زیادہ فکر کی بات نہ تھی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس ملک کی حیات اجتماعی میں مسلمانوں کے بعض مخصوص وظائف ہیں جن کا صحیح طور پر انجام پانا مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ملک اور انسانیت کے لئے ضروری ہے۔ اگر مسلمان اکثر ہندوستان کی توہم پرستی میں آزادی خیال کے حامی رہے ہیں اور رہ سکتے ہیں، اگر بیجا جماعتی پابندیوں کی فضا میں یہ شخصیت انفرادی کے حق کی اہمیت جتاکر ایک صحیح جماعتی توازن پیدا کرنے کے باعث ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ اگر تنگ نظر ملک پرستی کی غلطی نے انکی وسعت نظر سے اصلاح پائی ہے اور اب بھی پا سکتی ہے، اگر انکی بین الاقوامی حیثیت سے آزاد ہندوستان کی سیاست کے لئے نہایت قیمتی خدمات انجام پا سکتی ہیں، اگر تمدن ہند

میں انکا حصہ، زبان میں، ادب میں، تعمیرات اور فنون لطیفہ میں، مذہبی اور معاشرتی تحریکوں میں ایسا رہا ہے کہ اس حصہ کا تلف ہو جانا ہندوستان کے تمدن کو اپنی موجودہ حیثیت سے برتر پست کر سکتا اور جس کا ترقی پانا اس تمدنی زندگی کو چار چاند لگا سکتا ہے۔ تو ان صفات کے حاملوں کو بہ حیثیت جماعت، قائم رکھنا، اور انکی ترقی کے وسائل بہم پہنچانا مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ ہندوستان اور انسانیت کی خدمت ہے۔ مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ اپنے ان مخصوص وظائف کا احساس اپنے اندر پیدا کریں اور اپنے عمل سے سب پر ثابت کریں کہ انکی جماعتی زندگی کی غایت انہیں مقاصد و خدمات کا پورا کرنا ہے۔ مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی سب سے اہم ضرورت ایسی قیادت ہے جو انکے تخیل کی سطح کو شخصی اغراض کی پستی سے اٹھا کر مخصوص جماعتی صلاحیت خدمت کے احساس پر پہنچا دے۔ اور ایسی جماعتیں جو ان مخصوص وظائف کو اس وقت سے بلا لحاظ اس کے کہ کوئی ہمارے حقوق کو تسلیم کرے یا نہ کرے، ہم کسی سے ملے ہوں یا روٹھے ہوں، استقلال و پامردی سے انجام دیتی رہیں کہ یہی مخصوص حقوق کے تسلیم کرنے کی تنہا ضمانت ہے۔ ان دونوں چیزوں کو افسوس کہ آنکھیں ڈھونڈتی ہیں پر نہیں پاتیں۔ نہ ہم میں وہ مفکر ہیں جو ہمارے سرمایۂ ذہنی کو زندہ رکھیں اور ترقی دیں، نہ خطیب و مبلغ ہیں جو اس سرمایہ کو ساری جماعت کی ذہنی ملک بنا دیں، نہ وہ اہل دل ہیں جو دوسرے کے دلوں میں ان اعلیٰ مقاصد کو عمل کا جامہ پہنانے کی لگن لگا دیں، نہ وہ مستقل مزاج کارکن ہیں جو ناکامی و کامیابی کی دھوپ چھاؤں سے بے نیاز اپنے کام میں لگے رہیں۔

اپنی محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

کیا یہ توقع بیجا ہوگی کہ مسلمانوں کی تعلیم گاہیں بہ حیثیت ذہنی مرکزوں کے اس صورت حال کے بدلنے میں کچھ مدد دے سکیں گی؟ اگر کچھ امید ہے تو انہیں سے ہے۔ باقی تو اللہ کا نام ہے اور بس۔

مطبوعات

ہندوستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ

۱۔ ازمنہ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات — از علامہ عبداللہ یوسف علی ایم اے۔ ایل ایل ایم

سی۔ بی۔ ای۔ مجلد قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ غیر مجلد ایک روپیہ۔

۲۔ اردو زبان اور ادب۔ از سید سلیمان ندوی۔ قیمت ایک روپیہ

۳۔ مغلوں سے پہلے عرب اور ہندوستان کے تعلقات — از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی

قیمت چار روپے (للعہ)

زیر طبع

۱۔ مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر۔ از مولانا محمد امین صاحب عباسی

۲۔ قرون وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن۔ از رائے بہادر مہامہوپادھیایہ پنڈت گوری شنکر ہیراچند اوجھا

۳۔ ہندی شاعری۔ از ڈاکٹر اعظم کریوی۔

۴۔ ناتن (جرمن ڈراما) ترجمہ مولانا محمد نعیم الرحمن صاحب ایم اے۔ ایم آر اے۔ ایس

۵۔ ترقی زراعت۔ از خانصاحب مولوی محمد عبدالقیوم ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت الہ آباد

ملنے کا پتہ: جنرل سکرٹری ہندوستانی اکیڈمی (یو۔ پی) الہ آباد

The Cultural Side of Islam

Madras Lectures on Islam

(NO. 2.)

BY

MUHAMMAD MARMADUKE PICKTHALL

DELIVERED AT MADRAS IN JANUARY 1927.

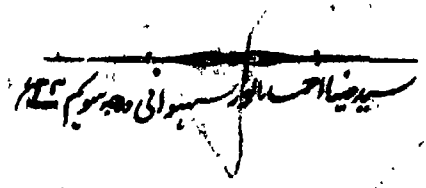

CONTENTS.

1. First Lecture—Islamic Culture.
2. Second Lecture—Causes of Decline.
3. Third Lecture—Brotherhood.
4. Fourth Lecture—Science, Art and Letters.
5. Fifth Lecture—Tolerance.
6. Sixth Lecture—The Charge of Fatalism.
7. Seventh Lecture—The Relation of the Sexes.
8. Eight Lecture—The City of Islam.

Price 8/-
Bound 12/-

TO BE HAD OF:—

NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY
BOOK DEPOT,
KAROL BAGH,
[illegible]

رجسٹرڈ

ایڈیٹر نمبر ۱۰۵۲

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۱۴ | بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر ۴

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

1927

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولنا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۴	بابتہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

۱۔ مسیح الملک مرحوم کا سفرنامہ یورپ	(قاضی عبدالغفار صاحب)	۲۴۲
۲۔ معتزلہ	عبدالجلیل صاحب ندوی متعلم جامعہ ملیہ	۲۵۲
۳۔ مالیات ہند	شفیق الرحمٰن صاحب بی۔اے، استاد جامعہ	۲۶۵
۴۔ مسئلہ تاوان جنگ	. . . .	۲۷۵
۵۔ کتب لغت عربی	مولوی محمد اسلم صاحب جیراجپوری، استاد جامعہ	۲۸۰
۶۔ باغبان	محمد مجیب صاحب بی۔اے (آکسن)	۲۸۵
۷۔ رائنر ماریا رلکے	ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب صدیقی پی ایچ۔ڈی	۳۱۰
۸۔ شذرات	. . . .	۳۱۰

مسیح الملک مرحوم کا سفرنامہ یورپ

مسیح الملک مرحوم و مغفور کی وفات کے بعد ہی میں نے کوشش کی تھی کہ اُن کے کاغذات و مسودات کو محفوظ کر دیا جائے اور جہاں تک میری دسترس تھی میں نے جستجو کی، لیکن یہ ایک تعجب انگیز اور تکلیف دہ حقیقت ہے کہ سوائے چند منتشر پرچوں اور دس بیس خطوط کے مرحوم کے سامان میں اور نیز دفتر میں کاغذات کا کوئی ایسا ذخیرہ نہ ملا جو اُنکے کسی سوانح نگار کے کام آسکتا۔ مسیح الملک مغفور اپنی زندگی میں ذاتی طور پر ہمیشہ بے سروسامان رہے۔ دولت اور عزت کی بہت بلند سطح پر پہنچنے کے بعد اُنکی زندگی میں معمولی ضروریات کا سامان بھی اسقدر کم تھا کہ جب کوئی لمبا سفر درپیش ہوتا تھا تو اکثر دھوبی کے یہاں سے دُھلے ہوئے کپڑے منگائے جانے کی فکر کیجاتی تھی، بگاڑھے کے چند کرتے اور پاجامے اور چند اچکنیں ایک پرانے سوٹ کیس میں، یہ سب سامان تھا جو اُنکے لئے کافی ہوا کرتا تھا اور اپنے اس توشہ خانہ کی بھی انکو کبھی خبر نہ ہوتی تھی کہ کتنے کپڑے پھٹ گئے اور کتنے باقی ہیں۔ خاص خاص نیازمندان چیزوں پر نظر رکھتے تھے اور جب کبھی اس "توشہ خانہ" کی خراب حالی کا ان میں سے کسی کو علم ہو جاتا تھا تو پانچ چار کرتے پاجامے تیار ہو جاتے تھے، مجھے یاد ہے ایک دفعہ غریب خانہ پر تشریف لے گئے تو تین برس کا ایک پرانا جوتہ پاؤں میں تھا جو غالباً سوداگر کی دوکان سے آنے کے بعد کبھی معمولی کپڑے سے بھی صاف نہیں کیا گیا تھا، پالش یا روغن کا تو ذکر ہی کیا! چمڑا گھس کر آدھا رہ گیا تھا، ٹانکے گھس کر کھل گئے تھے لیکن وہی جوتہ ہز ہائنس نواب صاحب رامپور کے ایرانی قالینوں پر بھی بے تکلف جاتا تھا اور بڑے بڑے عالی مقام مرنصیوں

مسیح الملک مرحوم کے سفر نامہ کا ایک صفحہ

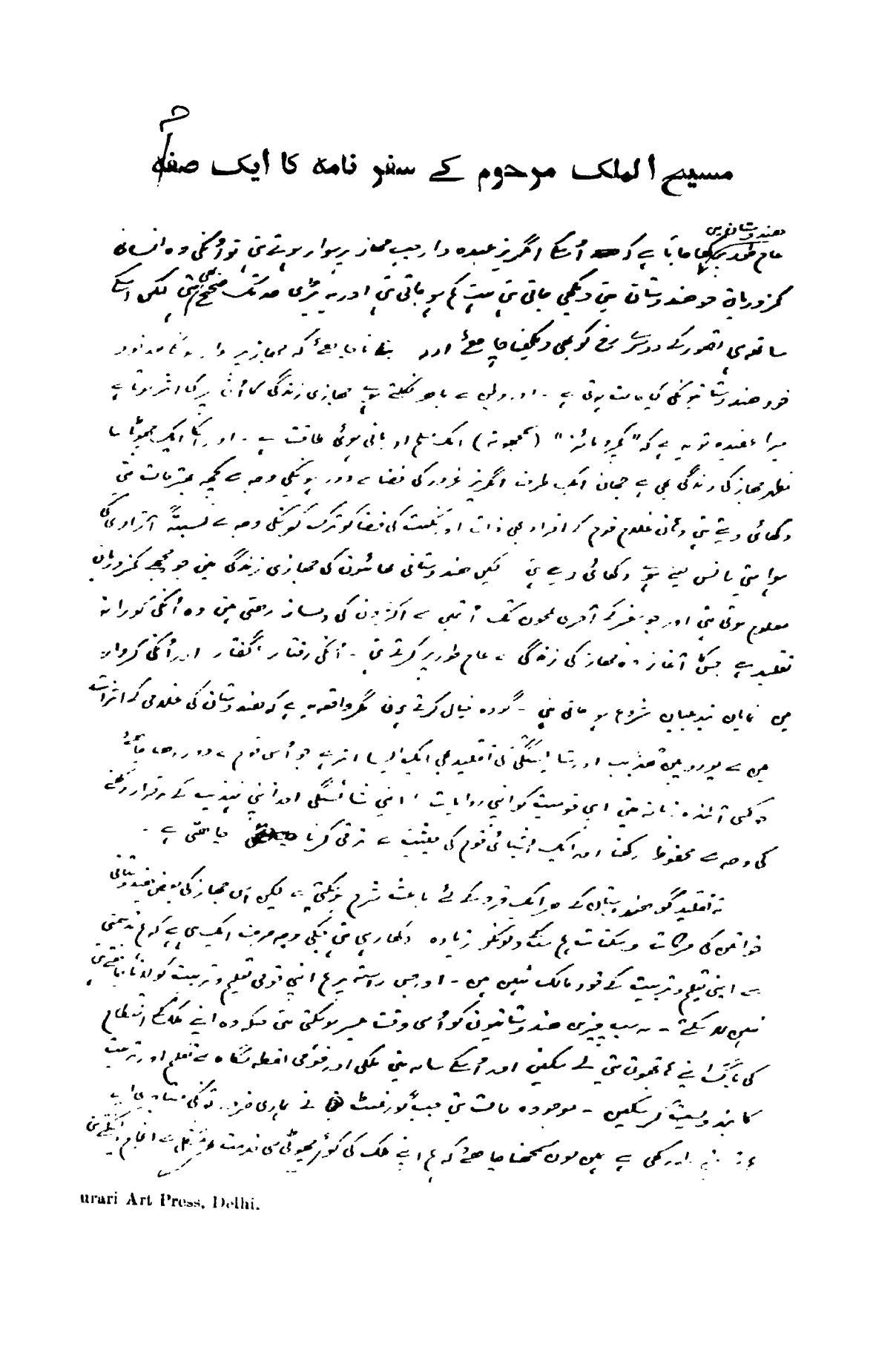

urari Art Press, Delhi.

کی آراستہ کھونٹیوں پر بھی۔ مجھے جوتے کی یہ حالت نہ دیکھی گئی تو بازار سے ایک نیا جوتہ منگوا کر میں نے دروازے پر رکھوا دیا اور پرانے جوڑے کو وہاں سے اٹھوا لیا جب موٹر میں سوار ہونے کے لئے اٹھے تو اتفاقاً جوتہ پر نظر پڑ گئی یا شاید پاؤں نے نئے اور پرانے جوتے کے فرق کو محسوس کیا، پاؤں آگے بڑھا کر نئے جوتے کو دیکھا پھر میری طرف دیکھا، مسکرائے، اور خاموش ہو گئے! میلی اچکن پرانی ٹوپی بوسیدہ جوتے، مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر اور بہترین انسان کی یہ شان اور یہ وضع تھی، دولت اور شہرت سے انکا نفس مستغنی تھا اور جسم و جان کی آرائش سے وہ ہمیشہ بے پروا رہتے تھے جس انسان کی بے نفسی کا یہ عالم ہو وہ دنیا میں اپنی بڑائی اور عالی مقامی کی کاغذی سندیں کیوں چھوڑ کر جائے! اس گذری ہوئی زندگی کا ایک افسانہ انکے نیازمندوں کی زبانوں پر ہے، کتابوں اور اخبارات کے صفحات پر وہ اصلی تصویریں نہیں مل سکتیں جن کو ہماری آنکھوں نے ایک دفعہ دیکھ لیا اور پھر کبھی نہ دیکھیں گی۔

۱۹۲۵ء میں جب صحت کی خاطر مرحوم کو سفر یورپ اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا، تو خوش قسمتی سے میں بھی اس زمانے میں فرانس میں مقیم تھا اور عرصہ تک اس سفر میں مرحوم کے ساتھ رہا۔ اس زمانہ میں انکے کچھ کاغذات میں نے ایک بکس میں محفوظ کر دئے تھے، وہی ایک چھوٹا سا بکس انتقال کے بعد میرے ہاتھ آیا۔ اور وہی انکے سوانح نگار کا سارا کاغذی سرمایہ ہے۔ ان کاغذات میں ایک نامکمل مسودہ حالات سفر کا بھی ہے جس کو انہوں نے سفرنامے کے رنگ میں لکھنا شروع کیا تھا، لیکن غالباً ہندوستان واپس آکر اس کو مکمل کرنے کا وقت نہ ملا۔ اور وہ اوراق منتشر حالت میں مجھ تک پہنچے، اس مسودہ کے چند صفحات جو آج شائع ہوتے ہیں "جامعہ" کے ناظرین کے لئے محض ایک تبرک ہے جس میں کہیں کہیں

مسیح الملک مغفور کے خیالات کی ایک جھلک بھی نظر افروز ہوگی۔

عبدالغفار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تمہید

میں اس سے پہلے ۱۹۰۴ء میں ہندوستان سے باہر عراق کی سیاحت کی غرض سے گیا تھا اور کچھ یادداشت سفر بھی لکھیں تھیں لیکن وقت نہ ملنے کی وجہ سے میں اُسے مکمل نہ کر سکا اور اس وجہ سے سفر عراق کے نتائج جو میرے دماغ میں تھے انہیں اوراق تک لانے کی نوبت نہ آئی۔

دوسرا سفر میں نے ۱۹۱۱ء میں یورپ کا کیا اس سفر میں انگلینڈ، فرانس، جرمنی آسٹریا اور ٹرکی کی سیاحت کی لیکن یہ سیاحت اُسی قسم کی تھی جیسی کہ آجکل امریکن مسافر کیا کرتے ہیں اسکے علاوہ میں نے دوران سفر میں کوئی یادداشت بھی نہیں لکھی تھی اس لئے یہ سفر بھی نتائج کے لحاظ سے عقیم رہا جس کا وہ مستحق بھی تھا۔

اب ۱۹۲۵ء میں پھر میں ہندوستان سے باہر جا رہا ہوں اور یہ ارادہ کرتا ہوں کہ حالات سفر برابر لکھتا رہوں گا کہ واپسی پر احباب کے سامنے ایک حقیر ہدیہ پیش کر سکوں۔

یہ تیسرا سفر دماغ اور اعصاب کو جن کی حالت برسوں کی متواتر تکان کی وجہ سے واقعی طور پر قابل رحم ہو گئی تھی آرام و سکون پہنچانے اور اس وجہ سے جو صدمہ عام صحت کو پہنچ گیا تھا اُسے دور کرنے کی غرض سے ناگزیر طور پر اختیار کیا گیا ہے۔

میرے محترم بھائی ڈاکٹر انصاری صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ اگر تم آرام کرنے کے خیال سے سفر کرنا چاہتے ہو تو میں تمہارے ہمسفر برابر رہوں گا۔ انکی اس برادرانہ محبت و ہمدردی نے جس کا میں شکر گذار ہوں بالآخر مجھے اس سفر پر آمادہ کر دیا۔

میرے ارادۂ سفر کی وجہ سے میرے عزیز دوست قمر شاہ خانصاحب بیرسٹرایٹ لا بھی

جو رامپور کے ایک معزز اور شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور آج کل بوڈ ڈشیل سکرٹری کی خدمات کو ریاست مذکور میں انجام دیتے ہیں آمادۂ سفر ہو گئے لیکن وقت پر بعض موانع کی وجہ سے وہ اپنی آمادگی پر قائم نہ رہے اور اس طرح سے افسوس ہے کہ ہمارے مثلث کا یہ زاویہ قائم نہ رہ سکا۔ مگر اسے زیادہ عرصہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ برادر مکرم نواب سر امیر الدین خانصاحب بہادر کی آمادگی سفر نے اس نقصان کی تلافی کر دی جو عزیز قمر شاہ خانصاحب کے ترک ارادہ کی وجہ سے اس مثلث کو پہنچا تھا۔

نواب صاحب کے ہمراہ حکیم محمد نبی صاحب سند یافتہ طبیہ کالج دہلی بھی بطور ایک سکرٹری کے تھے جن کی وجہ سے انہیں اور مجھے دونوں کو آرام مل رہا ہے۔

بہرحال ہم تین دوستوں کا مختصر گروہ بمبئی میں پہنچ گیا اور ۱۰ اپریل ۱۹۲۵ء کو "رزمک" جہاز پر دوپہر کے بعد سوار ہو گیا۔

بمبئی سے مارسیلز تک جہازی سفر

جس جہاز پر ہم سوار تھے اور جس کا نام رزمک ہے اسکا وزن دس ہزار ٹن ہے گو یہ جہاز بڑا نہیں ہے لیکن نیا بنا ہوا اور صاف ہے۔ ہندوستان سے مارسیلز کا سفر اس کا پہلا سفر ہے۔

اس جہاز کے پہلے اور دوسرے درجہ کے تمام مسافروں کی مجموعی تعداد ۱۸۳ ہے جس میں چھوٹی عمر کے لڑکے اور لڑکیاں شامل نہیں ہیں۔ اس جہاز کی رفتار فی گھنٹہ سولہ سترہ ناٹ کی ہے جو بحری میل ہے اور جو ہندوستان کے میل سے کسی قدر کم ہے

"رزمک" کے ممتاز مسافروں میں سے ہز اکسلنسی لارڈ ریڈنگ، مہاراجہ صاحب گوالیار اور سرہارکوٹ بٹلر گورنر برما ہیں۔ انکے علاوہ اور بہت سے ہندوستانی احباب بھی ہیں جنکا ذکر اس حصہ سفر میں کسی نہ کسی جگہ آجائے گا۔ لیکن غلطی ہوگی اگر ان احباب کی فہرست میں سے ایک دوست کو نمایاں جگہ نہ دیجائے۔ جو قابل اور باقابلیت ہونے کے علاوہ خاص خصائل کے مالک بھی ہیں۔ بہت کم آدمی انہیں انکے قیافہ سے سمجھ سکتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں سیدھے ہیں لیکن

جب کوئی بات تحقیق کی غرض سے انہیں سپرد کیجائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ سوراج کے زمانہ میں غالباً یہی شخصیت سی۔ آئی۔ ڈی کے محکمہ میں سب سے اوپر آنے والی ہے۔ انہیں بات کرنے کی بہت مرعادت ہے اور بظاہر بہت شرمیلے ہیں لیکن ضرورت کے وقت اپنے کھانے کی میز سے تیسری یا چوتھی میز کے کسی مرد یا عورت سے بے تکلف باتیں کرلیا کرتے ہیں۔ انکا مقولہ ہے کہ بات کرنے کے لئے کسی تعارف یا شناسائی کی ضرورت نہیں ہے۔

جہاز کی زندگی

جب کوئی شخص جہاز پر سوار ہوتا ہے تو وہ اپنے گرد و پیش کو بہت ہی تنگ دائرہ میں دیکھتا ہے اور اس وجہ سے اس کی مصروفیتیں بہت ہی محدود ہوجاتی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ واقعی طور پر چونکہ اس کے پاس کوئی خاص کام باقی نہیں رہتا اسلئے وہ اس مختصر دنیا میں بھی اپنے لئے مناسب اشغال پیدا کرلیتا ہے۔

صبح کی بیداری پر پہلا کام بستروں پر چائے نوشی ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد غسلخانوں پر حملہ شروع ہوجاتا ہے اس سے اور تبدیل لباس سے جب فراغت حاصل ہوتی ہے تو صبح کی حاضری کی گھنٹی جو ڈھنڈورے کی طرح جہاز کے ہر درجے میں ایک آدمی بجاتا ہوا تیزی کے ساتھ نکل جاتا ہے اسے کھانے کے کمرہ میں پہنچا دیتی ہے اس حاضری سے جب نجات ملتی ہے تو "ڈک" کی چہل پہل کا آغاز ہوتا ہے۔ رات کی نیند کی مزاج پرسیاں شروع ہوتی ہیں موسم کی گرمی یا سختی پر گفتگو ہوتی ہے۔ سمندر کی لطیف ہوا پر تبادلِ افکار ہوتا ہے اور وہ لوگ جو ڈاکٹر انصاری اور میری طرح بدقسمتی سے خوش قسمت یا خوش قسمتی سے بدقسمت نہیں ہیں۔ تنہا گردش کرتے ہوئے یا کرسیوں پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

عام طور پر "ڈک" کی مشغولیتوں کو اگر تقسیم کیا جائے تو ذیل کے نمبروں میں انہیں محدود کرکے بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) گشت

(۲) کتاب بینی

(۳) نیند اور خراٹے

(۴) رقص و سرود

(۵) جہاز کی رفتار پر شرط بازی

اگرچہ گشت کا سلسلہ دن بھر کم و بیش جاری رہتا ہے لیکن اس کی اہمیت اور دلچسپی رات کے کھانے کے بعد بڑھ جاتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جہازی اُن گھڑیوں کا آغاز (جو دن بھر کی سست زندگی میں کسی قدر چستی پیدا کر دیتی ہیں رات کے کھانے کے بعد سے ہوتا ہے۔ اور اس وقت تک خوشدلی باقی رہتی ہے جب تک کہ مسافر اپنے اپنے بستروں پر نہیں جاتے ہیں۔

عام طور پر ہندوستان میں کہا جاتا ہے کہ اس کے انگریز عہدہ دار جب جہاز پر سوار ہوتے ہیں تو اُنکی وہ انسانی کمزوریاں جو ہندوستان میں دیکھی جاتی ہیں بہت کم ہو جاتی ہیں اور یہ بڑی حد تک صحیح بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی تصویر کے دوسرے رخ کو بھی دیکھنا چاہئے اور بتانا چاہئے کہ جہاز پر سوار ہونے کے بعد خود ہندوستانیوں کی کیا حالت ہوتی ہے اور وطن سے باہر نکلتے ہوئے جہازی زندگی کا اُنپر کیا اثر ہوتا ہے۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ "کیپر ومانز" (سمجھوتہ) ایک مسلم اور مانی ہوئی طاقت ہے۔ اور اس کا ایک چھوٹا سا مظہر جہاز کی زندگی بھی ہے جہاں ایک طرف انگریز غرور کی فضا سے دور ہونے کی وجہ سے کچھ بہتر حالت میں دکھائی دیتے ہیں وہاں غلام قوم کے افراد بھی ذلت اور نکبت کی فضا کو ترک کرنے کی وجہ سے نسبتہً آزادی کی ہوا میں سانس لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی بھائیوں کی جہازی زندگی میں جو مجھے کمزوریاں معلوم ہوتی تھیں اور جو سفر کے آخری لمحوں تک ان میں سے اکثروں کی دمسازی رہتی ہیں وہ اُنکی کورانہ تقلید ہے جس کا آغاز وہ جہاز کی زندگی سے عام طور پر کرتے ہیں، اُن کی رفتار، گفتار اور اُنکی کردار میں نمایاں تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ گو وہ خیال کرتے ہوں مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی غلامی کے اثرات میں سے یورپین تہذیب اور شائستگی کی تقلید بھی ایک ایسا اثر ہے جو اُس قوم سے دور رہنا چاہئے جو کسی آئندہ زمانہ میں اپنی قومیت کو اپنی روایات

اپنی شائستگی اور اپنی تہذیب کے برقرار رکھنے کی وجہ سے محفوظ رکھنا اور ایک ایشیائی قوم کی حیثیت سے ترقی کرنا چاہتی ہے۔"

یہ تقلید گو ہندوستان کے ہر ایک فرد کے لئے باعث شرم ہو سکتی ہے لیکن اس جہاز کی بعض ہندوستانی خواتین کی حرکات و سکنات ہم سب کے دلوں کو زیادہ دکھا رہی تھیں جس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ ہم بدقسمتی سے اپنی تعلیم و تربیت کے خود مالک نہیں ہیں۔ اور جس راستہ پر ہم اپنی قومی تعلیم و تربیت کو لانا چاہتے ہیں، نہیں لا سکتے۔ یہ سب چیزیں ہندوستانیوں کو اسی وقت میسر آ سکتی ہیں جبکہ وہ اپنے ملک کے انتظام کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے سکیں اور اس کے سایہ میں ملکی اور قومی نقطۂ نگاہ سے تعلیم اور تربیت کا بندوبست کر سکیں۔ موجودہ حالت میں جب گورنمنٹ نے ہماری ضرورتوں کی مشاجری اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے ہمیں یوں سمجھنا چاہئے کہ ہم اپنے ملک کی کوئی چھوٹی سی خدمت بھی مشکل سے انجام دے سکتے ہیں۔

ہمارا جہاز گو عدن ٹھہرنے والا نہیں تھا لیکن یہ سنا گیا کہ ہز اکسلنسی لارڈ ریڈنگ کے نام بعض ضروری چٹھیاں عدن پہنچی ہوئی ہیں اس لئے "زرمک" کوئی پون گھنٹے کے لئے بندرگاہ سے آدھ میل کے فاصلہ پر ٹھہرا اور پھر سوئز کی طرف روانہ ہو گیا۔

۱۷ اپریل کو ہم نے عرب و افریقہ کے ساحلی خشک پہاڑوں کو دیکھا اور دن بھر دیکھتے رہے اس نظارہ نے میرے دل پر خاص اثر کیا۔ گذشتہ زمانے میں یہ دونوں جانب کی وسیع سرزمینیں اسلامی آزاد سلطنتوں یا ریاستوں کے تصرف میں تھیں لیکن اب وہ محکوم قوموں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ ہمارے سیدھے ہاتھ پر جو ملک ہے (عرب و فلسطین و شام) وہ ایک زمانہ میں انبیاء علیہ السلام کا گہوارہ تھا۔ اس کے ہر ایک ذرہ سے روحانی انوار اور حقیقی آزادی کے اطوار نمایاں تھے لیکن آج وہ یا تو شقاق و نفاق کا مرکز ہے اور یا محکومی و غلامی کی بدترین زندگی کا نمونہ۔ ان گہرے اور غم آلود خیالات کے ساتھ یہ دن ختم ہوا اور رات کے پردہ نے ان پر حسرت مناظر کو ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔

ہمارا جہاز رات کو تین بجے سوئز پر لنگر انداز ہوا، لیکن جب ہم صبح کو اٹھے تو پھر سوئز میں آہستہ آہستہ آٹھ دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا تھا۔ اول تو ہمیں کوئی آبادی نظر نہیں آئی البتہ وہ ریلوے جو قاہرہ سے پورٹ سعید گئی ہے اور اس کے تاروں کے کھنبے ہمارے بائیں ہاتھ پر برابر دکھائی دیتے تھے۔ ایک عرصہ کے بعد پھر کہیں کہیں سوئز کی چوکیاں دکھائی دیں اور جس قدر ہم پورٹ سعید کی طرف بڑھتے گئے اسی قدر آبادی کے آثار بھی بتدریج نمایاں ہوتے گئے۔ راستہ میں اسماعیلیہ سے بھی گذرے جہاں دو چار کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں اور گذشتہ جنگ کے زمانے میں جہاں سے ترکی فوج کا ایک حصہ عارضی پل کے ذریعہ سے نہر کو عبور کر کے ہماری بائیں جانب کی مصری حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہم القنطرہ سے گذرے جو گذشتہ جنگ کے زمانے میں انگریزی افواج کا جنگی مرکز تھا گو یہ اب ویران نظر آتا ہے لیکن اس وقت جو عارضی مکانات بنائے گئے تھے انکا ایک معقول حصہ اب بھی یہاں موجود ہے۔ اور اس لائن کا ابتدائی اسٹیشن بھی اسی القنطرہ میں ہے جو فلسطین کو جاتی ہے اس اسٹیشن پر عربی جلی حروف میں جو جہاز سے بھی نظر آتے ہیں "سکہ حدید سینا الحربیۃ" لکھا ہوا ہے۔

ہم سہ پہر کو چار بجے پورٹ سعید پہنچے ہمارا جہاز شہر سے کسی قدر فاصلہ پر لنگر انداز ہوا چونکہ شیخ محمد ماضی ابوالعزائم صاحب صدر لجنۃ التحضیریۃ العلیا لمجلس الخلافۃ کے دو عنایت نامے میرے پاس دہلی میں مسئلہ خلافت کے متعلق آئے تھے اور میں انکے جواب نہیں لکھ سکا تھا اس لئے بمبئی سے چلتے وقت میں نے انکے نام قاہرہ میں تار دیدیا تھا جس میں میں نے انکے خطوط کی رسید دی تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ میں پورٹ سعید سے زنک پر گذر رہا ہوں اس لئے اور نیز اسوجہ سے کہ بھائی شوکت علی صاحب نے جیسا کہ ہمیں پورٹ سعید پہنچکر معلوم ہوا تھا قاہرہ میں ایک تار اس مضمون کا دیدیا تھا کہ ہم دونوں (یعنی ڈاکٹر انصاری اور میں) زنک کے ذریعہ گذر رہے ہیں المقطم، الاخبار اور دیگر مقامی اخباروں میں ہمارے پورٹ سعید سے گذرنیکی خبر شائع ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ ابوالعزائم صاحب اور چند مصری و ہندی بھائی جن کے نام آئندہ لکھوں گا، قاہرہ سے زحمت

گوارا کرکے اس ماہ رمضان میں پورٹ سعید پہنچ گئے۔

ہم جہاز سے اُترنے اور پورٹ سعید جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ ایک کشتی میں ہمارے چند مصری بھائی ہم سے ملنے اور ہمیں شہر میں لیجانیکی غرض سے آئے۔ ان بھائیوں میں سے چند کے نام ذیل میں لکھ دینے مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) عبدالحمید سعید بے ایک ترکی مصری خاندان کے معزز رکن جن کے دل میں خاص طور پر اسلامی درد ہے اور جنکی خدمات اسلام کے لئے درجۂ امتیاز رکھتی ہیں جو مصر کی مشہور سیاسی جماعت حزب الوطنی کی جانب سے آئے تھے۔

(۲) سید حسنی مارڈینی دمشقی (جو ازہر کے تعلیم یافتہ ہیں اور خلافت کیلئے کام کر رہے ہیں اور اسی سلسلہ میں ہندوستان بھی آچکے ہیں۔

(۳) سید محمود سلامہ

(۴) سید محمود ماضی } یہ دونوں شیخ ابوالعزائم کے صاحبزادے ہیں۔
(۵) سید احمد ماضی }

(۶) کامل بک عثمان، وکیل المرکز یہ

(۷) ابراہیم محمد طوبجی تاجر المنیا

یہ سب صاحب سوائے عبدالحمید سعید بے کے شیخ ابوالعزائم کی طرف سے اس غرض سے تشریف لائے تھے کہ ہمیں پورٹ سعید لیجائیں جہاں شیخ موصوف اور دوسرے مصری بھائی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انکے علاوہ ابوالنصر سید احمد صاحب بھوپالی (جو کہ ریاست بھوپال کی جانب سے یہاں کی یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہیں) اور سید عبدالکریم صاحب حیدرآبادی (جو کہ ریاست حیدرآباد کی جانب سے دارالعلوم میں زیر تعلیم ہیں) بھی ہم لوگوں سے ملنے کے لئے زرقم تشریف لائے۔

چونکہ جہاز کی روانگی کے ٹھیک وقت کا بھی اس وقت تک علم نہیں ہوا تھا اور اور جس وقت علم ہوا تو وقت زیادہ باقی نہیں رہا تھا اس لئے ڈاکٹر انصاری صاحب اور میں نے عذر کیا

اور سب وقت کی تنگی کی وجہ سے پورٹ سعید پر نہ اترنے کی معافی چاہی اور شیخ ابو العزائم صاحب کی خدمت میں بھی زبانی پیام معذرت کہلا بھیجا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ شیخ صاحب خود جہاز پر معہ اپنے چند ہمراہیوں کے تشریف لے آئے ہیں اسلئے ہم اُن سے ملنے کیلئے گئے اور انکی تکلیف فرمائی کا مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ شیخ صاحب ایک بزرگ عالم ہونیکے علاوہ خلافت اور اسلامی معاملات کے ساتھ خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ انکی ملاقات کا ہم لوگوں کے دلوں پر اچھا اثر ہوا لیکن افطار کا وقت قریب آگیا تھا اس لئے مغرب سے کچھ پہلے واپس تشریف لے گئے۔

ہمیں یہ معلوم ہو کر افسوس ہوا کہ مصری خلافت کے متعلق دو گروہ ہیں ایک گروہ جس میں علمائے ازہر بھی شامل ہیں خلافت کی خدمت ملک فواد (سلطان مصر) کو سپرد کرنا چاہتا ہے اور دوسرا گروہ اس سے اختلاف رکھتا ہے۔ اس مسئلہ کے علاوہ خلافت کے سلسلہ میں اور بھی چند مسائل ہیں جن میں دونوں گروہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔

معتزلہ

اسلام ایک ایسا سیدھا سادہ دین ہے جس کو ایک عامی سے عامی شخص بھی آسانی سمجھ سکتا ہے بخاری میں ہے کہ ایک صحابی کو مسلمان غلام آزاد کرنا تھا وہ آنحضرت صلعم کی خدمت میں ایک حبشیہ کو جو صدرجہ احمق تھی لے آئے، اور آپ نے دریافت کیا کہ کیا یہ مسلمان ہے، آپ نے اس سے پوچھا کہ خدا کہاں ہے، اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھادی آپ نے فرمایا لیجاؤ یہ مسلمان ہے شروع شروع میں جبتک صحابہ زندہ تھے اسلام اپنی اسی سادگی پر باقی رہا وہ مافوق الفہم اسرار جن کے سمجھنے کی حیات انسانی کو حاجت نہیں اور نہ عملی زندگی کے لئے انکا علم ضروری تھا۔ اس کو اسی طرح سربستہ چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے تھے، وہ اس آیت کے مصداق تھے جو قرآن کی ابتدائی سورۃ میں بیان کیا گیا ہے

آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون کل آمن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ لانفرق بین احدٍ من رسلہ (بقرہ)	پیغمبر پر جو کچھ بھی اس کے خدا کی طرف سے اترا اس پر وہ اور تمام مومنین ایمان لائے، خدا پر اس کے تمام فرشتوں پر اسکی تمام کتابوں پر اور کل کے کل پیغمبروں پر وہ ایمان اور یقین رکھتے ہیں، اس کے پیغمبروں میں سے کسی ایک کی تفریق نہیں کرتے۔
یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالآخرۃ ہم یوقنون (بقرہ)	جو کچھ تجھ پر اور تیرے پیشروں پر اترا اسپر وہ (برگزیدہ لوگ) ایمان لائے ہیں اور آخرت پر بھی انکا ایمان ہے۔

اور حقیقتاً انکا یہ عمل منشاء ایزدی کے بالکل مطابق تھا چنانچہ ایک جگہ پر ارشاد ہوتا ہے۔

ہوالذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ہن ام الکتاب وآخر متشابہات	خدا نے تجھکو یہ کتاب دی جس میں کچھ آئین واضح اور صاف ہیں اور وہ اصل کتاب ہیں بعض متشابہ ہیں جو کج دل

فاما الذین فی قلوبہم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون اٰمنا بہ کل من عند ربنا وما یذکر الا اولوا الالباب

ہیں وہ فتنہ انگیزی اور اس کے مطلب کو حل کرنے کے لئے متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں۔ حالانکہ جو معنی کہ اس کے حقیقی ہیں وہ بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ کہ علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے یہ سب خدا کی جانب سے ہیں۔ اور عقلمندوں کے سوا کوئی عبرت نہیں پکڑتا۔

آیت بالا سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ قرآن کی صحیح تعلیم یہی ہے کہ لوگ خواہ مخواہ ان باتوں کے پیچھے نہ پڑیں جن کا علم انکو کسی حالت میں مفید نہیں وہاں یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ عرب کے بعض افراد با وجود اپنی فطری سادگی اور میلان طبع کے قرآن کی بعض آیتوں میں رد و قدح جھوٹی تاویلیں اور بلا ضرورت بہت سی باتیں من گھڑت بیان کیا کرتے تھے، احادیث کی روشنی میں بھی ہم اس حقیقت کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک روز آنحضرت نے مذکورہ بالا آیت ہو الذی الخ تلاوت فرمائی اور پھر کہا اذا رایتہم الذین یتبعون ما تشابہ منہ فاولئک الذین سمی اللہ فحذرہم۔ جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہات کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں تو جان لو کہ یہ وہی ہیں جن کا خدا نے نام لیا ہے تو تم ہمیشہ ان لوگوں سے بچتے رہو۔ اس کے علاوہ عربوں کی شاعری میں بھی اگر ہم ایسے لوگوں کا کھوج کریں تو یقین ہے کہ آسانی سے پا سکیں گے۔

مصنف ملل و نحل کا خیال ہے کہ یہ منافق لوگ تھے جنہوں نے خواہ مخواہ اپنی خاص غرض کو پوشیدہ رکھکر آیات متشابہات کی تاویلیں کیں اور اس طرح فتنہ کا ایک دروازہ کھولدیا چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

یہ تمام (۱) شبہات جو آخر زمانے میں پیدا ہوئے کفار اور منافقین کے پیدا کردہ ہیں جنہوں

(۱) الملل والنحل للشہرستانی صفحہ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹

نے ابتدائی زمانہ اسلام میں اسکی تخم ریزی کی۔ یہ لوگ پیغمبر کے بتائے ہوئے راستہ پر نہ چلے بلکہ غیر ضروری باتوں میں خیال آرائی کی، جس چیز کے غور و خوض سے منع کیا گیا اسی کے متعلق خواہ مخواہ سوالات کئے، غلط اور باطل باتوں میں مجادلہ اور مباحثہ کیا چنانچہ حدیث ذی خویصرہ التمیمی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت (صلعم) سے کہا کہ اے محمد عدل کر تو عدل نہیں کرتا۔ آنحضرت (صلعم) نے فرمایا کہ اگر میں عدل نہیں کرتا تو کون کرے گا۔ اس پر بھی وہ یعنی باز نہ آیا اور کہا کہ کیا تو اسی تقسیم سے اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے، یہ صریح بنی پر خروج نہیں تو اور کیا ہے اگر وہ شخص جو سچے امام پر اعتراض کرتا ہے خارجی ہو جاتا ہے پھر تو بدرجہ اولیٰ وہ شخص جو سچے رسول پر اعتراض کرے خارجی ہوگا تو کیا یہ نص اور امر الٰہی کے مقابلہ میں اپنی ذاتی عقل کا قیاس نہیں ہے؟ اس بنا پر آنحضرت نے فرمایا کہ عنقریب اس سے ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو دین سے کوسوں دور ہوگی جیسے کہ تیر کمان سے، اور یہی حال ان منافقین کا تھا جنہوں نے غزوہ اُحد میں کہا تھا کہ ھل لنا من الامر شی، یعنی کیا کچھ ہمارا بھی اختیار ہے؟ اور نیز یہ بھی کہا تھا کہ اگر ایسا ہوتا تو ما قتلنا ہہنا یعنی ہم یہاں قتل نہ ہوتے، کیا یہ صریحاً قدر نہیں ہے، ایک دوسرا گروہ مشرکین کا تھا جو یہ کہتے تھے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم بجز اس کے کسی کی عبادت نہ کرتے، لو شاء اللہ ما عبدنا من دونہ من شی، اور ایک جماعت ایسی بھی تھی جو کہتی تھی کہ کیا ہم اس کو کھلائیں جس کو خدا خود کھلانا نہیں چاہتا انطعم من لو یشاء اللہ اطعمہ، کیا یہ صریحاً جبر نہیں، اور اسی طرح اس جماعت کا بھی خیال کر جس نے اللہ کے جلال اور اس تصرف افعال میں بحث کی یہاں تک کہ انکو اس آیت سے روکا گیا، ویرسل الصواعق فیصیب بہا من یشاء وہم یجادلون فی آیت اللہ وہو شدید المحال، یہ واقعات سب اس زمانے کے ہیں جب آنحضرت زندہ اور صحیح و سالم تھے، اور یہ سب کچھ منافقین

نے کیا جو ظاہر میں اسلام کا اظہار کرتے لیکن باطن میں وہ منافق تھے۔

اسمیں شک نہیں کہ ابتدا سے ایک جماعت ایسی تھی جس کا مقصد یہی تھا کہ اسلام کی تعلیمات کو خلط ملط کرے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ مومنین کے دل میں اس قسم کے خیالات کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے۔ وہ بھی ان آیتوں سے جو بظاہر ایک دوسرے کی مخالف تھیں کھٹکے لیکن انکے قلب کی روشنی اور حضور کے فیض صحبت نے ان کے عقیدہ میں کسی قسم کا فتور نہ آنے دیا۔ چنانچہ حدیث (۱) میں آیا ہے کہ ایک آیت میں دو صحابہ کو آپ نے لڑتے ہوئے سنا تو آپ حجرے سے باہر آگئے چہرے پر غصہ کے آثار تھے فرمایا کہ تم سے پہلی قومیں کتاب میں اختلاف کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوئیں۔ اس کے علاوہ ترمذی میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور ابن ماجہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ باہر تشریف لائے کچھ صحابہ آپس میں بیٹھے ہوئے بحث و مباحثہ کر رہے تھے، آپ نے پوچھا کہ کس مسئلہ پر گفتگو ہے کہا گیا کہ مسئلہ تقدیر پر، یہ سنتے ہی آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا، راوی کا بیان ہے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی نے رخ مبارک پر انار کے دانے نچوڑ دئے ہیں، آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو اسی کا حکم دیا گیا ہے؟ کیا تم اسی لئے پیدا کئے گئے ہو؟ کیا میں یہی پیغام لیکر آیا ہوں؟ کیا تمہاری پیدائش کا یہی مقصد ہے؟ قرآن کی ایک آیت کو دوسری آیت پر پٹکتے ہو، تم سے پہلے بہت سی قومیں اسی بنا پر ہلاک ہوئیں۔ میں تاکید سے کہتا ہوں کہ اس میں جھگڑا مت کرو۔

بہرحال عقائد میں اختلاف گو منافقین کی طرف سے پیدا کرنیکی کوشش کی گئی اور صحابہ بھی کبھی کبھی خصوصی مسائل میں چونکتے ہوئے لیکن آنحضرت جب تک زندہ رہے اختلاف رونما نہ ہوسکا، عہد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں کبھی کبھی اس قسم کا خطرہ پیش بھی آیا تو خلفاء راشدین

---

(۱) مسلم جلد دوم صفحہ ۳۲۹

کے اثر و اقتدار نے انکو ابھرنے نہ دیا اس کے علاوہ فتوحات اور اشاعت اسلام نے اس طرف توجہ کا موقعہ بھی کم دیا، البتہ بنو امیہ اور عباسیہ کے زمانے میں جب فتوحات اسلامی کا سیلاب طرف اور اطراف سے گزر کر دور دراز مقام تک پہنچ گیا تھا مختلف قومیں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں تو اپنی اپنی فطرت کے مطابق اسلامی عقائد میں نکتہ چینی شروع کیں اور وہ تمام خیالات جو انکے قدیم مذہب میں تھے، قرآن کی آیتوں سے منطبق کرنا چاہا، کسی نے ان الفاظ سے جو ہاتھ پیر آنکھ ناک کے ہم معنی تھے مجازی معنی لئے کسی نے اس کے حقیقی معنی مراد لیکر خدا کو ایک بزرگ اور مقدس انسانی پتلا تصور کیا جو عرش پر بیٹھکر دنیاوی خداوندوں کی طرح حکومت کرتا ہو، اس کے علاوہ وہ اور بہت سے دوسرے مسائل جو کبھی دبا دئے گئے تھے ابھر آئے۔ الغرض اسی قسم کی اور بہت سی باتیں پیدا ہوگئیں جو علوم و فنون کی اشاعت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئیں۔

ایک طرف یہ تھا تو دوسری طرف امامت و خلافت کی بحث نے اختلاف عقائد و مذہب کا ایک وسیع دروازہ کھولا اور وہ اس طرح پر کہ جب آنحضرت صلعم کا انتقال ہوگیا تو جہاں اور بہت سے سوالات[1] پیدا ہوئے، مثلاً نبی صلعم آسمان کی طرف اٹھائے گئے ہیں، جو لوگ یہ کہتے کہ عام انسانوں کی طرح فوت ہوئے وہ غلط کہتے ہیں، دفن کا کونسا مقام ہوگا، نبی کی اولاد وارث نبی بن سکتی ہے یا نہیں، سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوا کہ آنحضرت کا خلیفہ کون بنے اور وہ کس خاندان کا ہو، لیکن بحمداللہ یہ تمام اختلافات صحابہ رضوان اللہ علیہم نے دانائی اور ہوشیاری سے مٹا دئے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت تک کوئی خاص اختلاف رونما نہ ہوسکا البتہ حضرت عثمان رض کے ملکی اور سیاسی طرز عمل سے تین جماعتیں پیدا ہوئیں، ایک علویہ تھی جن کا خیال تھا کہ خلافت اور امامت کا حق صرف حضرت علی رض اور انکے خاندان تک

---

(۱) تفصیلی بحث کے لئے مولانا شبلی کا الکلام دیکھو

(۲) الملل والنحل شہرستانی صفحہ ۱۹ و ۲۰

رود ہے ، دوسری عثمانی تھی جو حضرت عثمان رضی اللہ کے حامی تھے ، اور ایک تیسری جماعت
ارج کی تھی جو دونوں کے مخالف تھی ۔ عثمانیہ تو تھوڑے دنوں کے بعد ختم ہو گئے لیکن علویہ اور
ارج نہ مٹ سکے ۔ یہ جماعتیں ہمیشہ اپنے کو برسر حق اور دوسرے کو کافر کہتیں اور اس معاملے
ں ان سب کی دلیل قرآن کی یہ آیت ، من قتل مومنا متعمدا فجزاہ جہنم خالدا فیہا تھی ، بہرحال یہ حال
ے عرصہ تک قائم رہا کہ بنو امیہ برسر اقتدار ہوئے ۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ظلم اور سفاکی کا بازار اکثر
م رہتا ۔ اس لئے بہت سی طبیعتیں بنی امیہ سے متنفر ہو رہی تھیں ، انکا روحانی اثر ختم ہو رہا
ا کہ ملکی ضرورت سے بنو امیہ کی ایک طرفدار جماعت پیدا ہوئی ، اور یہ جہمیہ تھے جنہوں نے کہ
یہ زیادتیاں محض اس لئے ہیں کہ خدا کو ایسا کرانا منظور ہے ہمارے اعمال کی یہ سزا ہے ورنہ
دا چاہتا تو کیا روک نہ سکتا تھا ، انسان مجبور محض ہے وہ اپنے اعمال کا بالکل مختار نہیں اب
یہ کے مخالف ایک دوسرا فرقہ سبی گروہ قدریہ[1] کا پیدا ہوا اس نے قرآن کی بعض آیتوں کی
ا پر یہ دعوی کیا کہ انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے خدا نے اس کو اس کے افعال پر قدرت
ے رکھی ہے ، اس خیال کے پھیلانے میں بہت سے لوگ جان سے مارے گئے ۔ معبد[2] معبد
کے بعد غیلان دمشقی اور پھر کچھ دنوں کے بعد جہم بن صفوان ، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے سختی
ور ظلم کے بعد اس مسئلہ کو عام کرنا دین و مذہب کا ایک بڑا رکن بنا لیا ۔ بہرحال یہی قدریہ آگے
ر کر معتزلہ کے لقب سے پکارے گئے ۔

اسلام میں فرقہ سازیاں یہیں ختم نہیں ہوتیں بلکہ دن بدن اسمیں اضافہ اور زیادتی
ہوتی رہی ، بنو عباسیہ کے زمانے میں جب بہت سے علوم و فنون عربی زبان میں منتقل کئے گئے
یونانی فلسفہ کا چرچا ہر علمی اور مذہبی سوسائٹی میں ہونے لگا علاوہ ازیں ہر شخص کو رائے اور مذہب

---

۲ ، ملل و نحل للشہرستانی میں پوری تفصیل ہے ۔

کی عام آزادی دیدی گئی تو بیسویں فرقے اور پیدا ہوگئے ۔ مولنا شبلی لکھتے ہیں کہ
ملکی ضرورت[1] نے اگرچہ صرف جبر و قدر کے مسئلہ پر توجہ دلائی تھی لیکن جب ایک دفعہ
کسی وجہ سے خیالات میں حرکت پیدا ہوئی تو بڑھتی ہی گئی یہانتک کہ بنو امیہ کا دور ختم
نہیں ہوچکا تھا کہ خلق قرآن، تنزیہ و تشبیہ، صفات باری وغیرہ کی بحثیں چھڑ گئیں اور
جس کے منہ سے جو بات نکلی ایک مذہب بن گئی

بانی معتزلہ

اوپر کہیں ذکر کیا جاچکا ہے کہ قدریہ بنو امیہ کے ابتدائی زمانے میں پیدا ہوا تھا لیکن پھر بعد میں بعض ایسے حالات اور واقعات پیش آئے کہ اسی خاندان کے دور آخر میں انکی وہ پہلی شان نہ رہ سکی لیکن باوجود اس کے خیالات کا بیج جب ایک دفعہ بویا جاچکا تھا تو بالکل جڑ سے اکھاڑ پھینکنا مشکل تھا، اس لئے ٹھیک اس وقت (دوسری صدی ہجری) جب کوفہ اور بصرہ علوم و فنون کے مرکز بن رہے تھے، ہر طرح کے لوگ اور ہر فن کے امام وہاں موجود تھے، علما، تو علما عوام کو بھی حق رائے آزادی کے ساتھ حاصل تھا، اور پھر اس کے علاوہ یہ دونوں شہر ایسی جگہ پر واقع تھے، جہاں کہ فارس کی وہ موجیں جو شیعہ اور خوارج کی پیدا کردہ ہوتیں بآسانی آتی جاتی تھیں، ان تمام اسباب کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ آگ جو بنو امیہ کے ابتدائی دور میں کبھی جلی تھی اور دمشق میں بجھنے والی تھی اس کی ایک معمولی چنگاری یہاں ان رنگین طبیعتوں کو بھڑکانے کے لئے کافی تھی چنانچہ سب سے پہلے بصرہ میں واصل بن عطا نے اس آگ کو روشن کیا اور یہی وہ شخص ہے جس نے مذہب اعتزال کی بنا ڈالی۔

وجہ تسمیہ یہ جماعت خود اپنے کو اہل توحید اور عدل کے نام سے موسوم کرتی لیکن عوام اس کو

---

(۱) الکلام جلد اول صفحہ ۱۹

قدریہ کہتے، اس لئے کہ انکا عقیدہ یہ تھا کہ انسان اپنے اعمال پر قادر ہے جیسا کہ انکے پیشروں معبد جہنی اور غیلان وغیرہ کا مسلک تھا۔ ان لوگوں کو معتزلہ کہے جانے کی بہت سی وجہیں بیان کی گئی ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب واصل بن عطا نے اپنے شیخ حسن بصری سے اس ایک خاص مسئلہ میں اختلاف کیا کہ جو شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے اس کو کیا کہا جائے، شیخ کی رائے یہ تھی کہ وہ کافر ہے، واصل بن عطا نے ان سے اختلاف کیا اور کہا کہ ایسا شخص نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ ان دونوں کے درمیانی منزل میں ہے، یہ کہتے ہوئے جماعت سے اٹھ آئے، شیخ موصوف نے کہا لقد اعتزل عنا اسی مناسبت[1] سے یہ اور انکی جماعت معتزلہ کے لقب سے پکاری گئی لیکن بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ واصل[2] نے اس مسئلہ میں ائمہ سے اعتزال (علیحدگی) اختیار کیا جن کا یہ عقیدہ ہے کہ مرتکب گناہ کبیرہ مومن ہے لیکن فاسق کہا جائیگا، ایک تیسری جماعت بھی ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ اکثر اس مذہب کے شیوخ نے دنیا سے اعتزال (علیحدگی) اختیار کی اس بنا پر انکا نام معتزلہ رکھا گیا

معتزلہ کا مختلف فرقوں میں منقسم ہونا

ڈھائی سو سال کی مدت میں یہ جماعت بتدریج بائیس[3] شاخوں میں منقسم ہوگئی، بغدادی نے اس میں سے دو حالطیہ اور حمارہ کو غلاۃ میں شمار کیا ہے لیکن شہرستانی اور عزیزی نے معتزلہ میں انکو رکھا ہے۔ معتزلہ کے ان تمام فرقوں کے تدریجی حالات اور انکے مخصوص خیالات سے ناظرین کو روشناس کرنیکے لئے میں بہتر طریقہ یہ سمجھتا ہوں کہ انکو انکے حالات کے

---

(۱) ملل ونحل شہرستانی

(۲) الفرق بین الفرق

(۳) تعلیق، استاذ فیلیب جنبی علی مختصر الفرق بین الفرق

لحاظ سے تین بڑے بڑے تاریخی دور میں تقسیم کروں لیکن اس سے پہلے انکے عام عقائد کا مطالعہ جس پر کہ سبھی کا اتفاق ہے ضروری ہے۔

عام[1] عقائد

(۱) خدا سے صفات ازلی کا انکار یعنی جس کے معنی صاف لفظوں میں یہ ہیں کہ اللہ بذاتہ زندہ ہے قادر ہے صاحب ارادہ ہے حیات، قدرت اور علم و ارادہ کی وجہ سے نہیں، زمان، مکان، جسم و جوہر کے قیود سے آزاد ہے۔ اسی عقیدہ کی بنا پر وہ اپنے کو اہل توحید کہتے تھے، اس لئے کہ وہ تمام صفات کا انکار محض اس لئے کرتے تھے کہ شرک باری تعالیٰ نہ لازم آئے، غالباً یہ افلاطون اور غیر ڈوئس کے عقیدہ سے متاثر ہو کر یہ عقیدہ ان میں قائم ہوا یہ دونوں اس بات کے قائل تھے کہ خدا نہ کسی خاص صفت کے ساتھ موصوف کیا جا سکتا ہے اور نہ ادراک کیا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ

(۲) دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خود مختار ہے، خدا انسانوں کے افعال اور اعمال کا خالق نہیں، وہ خود اپنے اچھے برے کے آپ ذمہ دار ہیں اس لئے کہ خدا عادل ہے، انکے اس قول کی بنیاد قرآن کی بعض آیتیں ہیں مثلاً کل نفس بما کسبت رہینۃ (مدثر) من عمل صالحاً فلنفسہ ومن اساء فعلیہا وما ربک بظلام للعبید (حم سجدہ) قد جاءکم بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسہ ومن عمی فعلیہا وما انا علیکم بحفیظ (انعام) اس عقیدہ کی بنیاد پر اپنے کو وہ اہل عدل کہتے تھے

(۳) فاسق کے متعلق انکا یہ عقیدہ ہے کہ وہ نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ ان دونوں کے بیچوں بیچ والی منزل میں ہے۔

---

[1] الفرق بین الفرق، شہرستانی علی ہامش الملل والنحل لابن حزم اور تاریخ تمدن عربی نکلسن دیکھو۔

(۴) اس بات پر انکا اجماع ہے کہ کلام الٰہی حادث ہے قدیم نہیں (انا جعلناہ قرآنا عربیا) جعلنا کے معنی خلقنا کے ہیں۔

(۵) جمہور مسلمانوں کے خلاف انکا یہ عقیدہ ہے کہ خدا کو ان آنکھوں سے دیکھنا ممکن نہیں نہ وہ خود اپنے کو دیکھ سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا اس کو دیکھ سکتا ہے اور اس کے علاوہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مومن پر فرض ہے۔

پہلا دور

یہ دور دوسری صدی ہجری کے ساتھ ساتھ شروع اور ختم ہوتا ہے گو اس زمانے میں اس کو وہ اثر و اقتدار حاصل نہیں ہوا تھا جو آئندہ چلکر ہونیوالا تھا مگر پھر بھی واصل بن عطا اور عمر بن عبید (جن کا تذکرہ ابھی کرنا ہے) کی کوششوں سے اعتزال نے خواص میں کچھ کچھ مقبولیت حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس دور کا سب سے پہلا اور مشہور عام فرقہ واصلیہ ہے جو بانی فرقہ معتزلہ واصل کے نام سے منسوب ہے، اور دوسرا فرقہ عمریہ جس کی نسبت عمر بن عبید کی طرف کی گئی ہے لیکن عام طور پر مورخین ان دونوں فرقوں کو ایک شمار کرتے ہیں اس لئے کہ جسوقت واصل بن عطا اپنے استاد سے اس مسئلہ خاص میں جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے اختلاف کر کے استاد کے حلقہ درس سے اٹھ آئے عمر بن عبید کو یہ یقین تھا کہ واصل سے بحث و مباحثہ کر کے استاد کے حلقہ درس میں دوبارہ شامل کر دیں گے لیکن صاحب موصوف نے ان سے مناظرہ کیا تو بجائے اس کے کہ انکو اپنی رائے سے متفق کرتے خود انکے جال میں گرفتار ہو گئے، واصل نے اپنی بہن سے انکا نکاح کر دیا اور اس طرح تعلقات کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ دونوں اپنے خاص معتقدات کی اشاعت میں مشغول ہو گئے۔ واصل کا شمار اپنے زمانے کے مشہور متکلمین میں تھا اور نہ صرف یہی بلکہ لغت و ادب کے ماہر تھے، انکے ایک ہمعصر نے انکی مدح میں یہ شعر کہا۔

علیہم بابدال الحروف وقامع　　لکل خطیب یغلب الحق باطلہ

ابن خلکان کی روایت کے مطابق واصل ایک بڑا مصنف بھی تھا چنانچہ اسکی لکھی ہوئی کتابیں حسب ذیل ہیں: کتاب فی اضاف المرجیہ، کتاب فی التوبہ۔ کتاب المنزلہ بین المنزلین۔ کتاب معانی القرآن، کتاب السبیل الی معرفت الحق، کتاب الخطب فی التوحید والعدل۔ کتاب بینہ بین عمر بن عبید، کتاب فی الدعوۃ، کتاب طبقات اہل العلم والجہل،

واصل کی پیدائش مدینہ میں سنہ ۸۰ھ میں ہوئی بصرہ میں سنہ ۱۳۱ھ کو انتقال ہوا واصل اور عمر یہ دونوں ہوالی عرب سے تھے، واصل نے معتزلہ کے عام معتقدات کے ماوراء جس چیز کا اضافہ کیا تھا وہ اصحاب[1] جمل اور خوارج کے بارے میں تھا جمہور مسلمان حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور طلحہ و علی رضی اللہ عنہما کو کافر سمجھتے ہیں لیکن واصل کا عقیدہ اس کے بالکل برعکس یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ بعد قضیہ تحکیم ایک حیثیت سے کافر اور عائشہ رضی اللہ عنہا و طلحہ رضی اللہ بھی دوسری حیثیت سے کافر تھے۔

دوسرا دور

تیسری صدی ہجری معتزلا کا دوسرا دور بعض حالات اور واقعات کی بنا پر خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے یہی وہ زمانہ ہے جب جوق جوق بہت سے علما[2] اور وزرا اس جماعت کے رکن بنے، اعتزال نے حکومت پر جگہ حاصل کی، امام احمد[3] بن حنبل کو اور دوسرے[4] بزرگوں کو

---

(۱) مختصر الفرق بین الفرق

(۲) وہ علما، جو اپنے زمانہ کے ممتاز اور با اثر لوگوں میں تھے اور مذہب اعتزال اختیار کر لیا تھا ان کے اسما گرامی یہ ہیں، احمد بن داؤد، جاحظ، ابن عباد

(۳) قاضی احمد بن داؤد نے جو کہ معتزلین کا سردار تھا مامون الرشید کے کان میں مسئلہ خلق قرآن کو پھونک دیا اور اس عقیدہ فاسد نے مامون کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اس مسئلہ کی اشاعت کی کوشش کرے (بقیہ صفحہ پر)

سخت سے سخت مصیبتیں خلیفہ مامون الرشید اور معتصم کے ہاتھوں اٹھانی پڑیں اس زمانہ کا نقشہ مولانا ابوالکلام نے تذکرہ میں یوں کھینچا ہے:

تیسری صدی کے اوائل میں جب فتنۂ اعتزال و تعمق فی الدین اور بدعۃ مضلۃ متکلم باغلفہ وانحراف از اعتصام بالسنہ نے سر اٹھایا، اور صرف ایک ہی نہیں بلکہ لگاتار تین عظیم الشان

(بقیہ حاشیہ صفحہ)

۲۱۸ھ میں اسحٰق بن ابراہیم خزاعی کو بغداد میں لکھا کہ علمائے بغداد کو خلق قرآن کی طرف جبراً متوجہ کرے بعض روپوش ہوگئے اور بعضوں نے توریہ کیا، اور انکے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے حسب منشاء قبول کیا، امام احمد بن حنبل انکار کے جرم میں خلیفہ کی خدمت میں بھیجے گئے جسوقت امام موصوف رقہ میں پہنچے مامون کے مرنیکی خبر طوس میں آئی، اثنائے راہ سے بغداد کو واپس گئے لیکن مامون نے مرتے وقت اپنے جانشین سے یہ وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد مسئلہ خلق قرآن میں وہ بھی ایسی ہی کوشش کرے چنانچہ جب معتصم خلیفہ ہوا تو اس نے بہت بیدردی سے امام موصوف کو قید کیا، چار چار بوجھل بیڑیاں پیروں میں ڈالی گئیں یہیں لیں، اسی حالت میں بغداد سے طرطوس لے چلے اور حکم دیا گیا کہ بلا کسی مدد اور سہارے کے خود ہی اونٹ پر چڑھیں اور اتریں امام موصوف بوجھل بیڑیوں کی وجہ سے ہل نہیں سکتے تھے۔ اُٹھتے تھے اور گر پڑتے تھے۔ عین رمضان المبارک کے آخر عشرہ میں بھوکے پیاسے جلتی دھوپ میں بٹھادئے گئے اور لگاتار کوڑے اس طرح مارے گئے کہ ہر جلاد دو ضربیں پوری قوت سے لگاکر پیچھے ہٹ جاتا اور پھر دوسرا تازہ دم جلاد اسکی جگہ لیتا لیکن اس کے باوجود وہی رٹ القرآن کلام اللہ غیر مخلوق کی جاری تھی آخر باوجود سیکڑوں معتصم کی ترغیبات کے وہ اپنے عقیدے سے باز نہ آئے بلکہ اور سخت ہوتے گئے اور بالآخر رقہ میں ۲۸ روز قید رہکر اسی مصیبت میں امام موصوف کا انتقال ہوا (ابن خلکان، تذکرہ ابوالکلام، المامون رسالہ ابن تیمیہ وغیرہ دیکھو)

(۴) عبداللہ بن عمر القواریری اور حسن بن حماد وغیرہ دوسرے علما بھی قید ہوئے لیکن تاب شدائد نہ لاکر اقرار کرکے چھوٹ گئے۔

فرمارواؤں یعنی مامون، معتصم، واثق باللہ کی شمشیر استبداد اور قہر حکومت نے اس فتنہ کا سدباب کیا حتیٰ کہ بقول علی مدینی کے فتنہ ارتداد و منع زکوٰۃ (بعہد حضرت ابوبکرؓ) کے بعد یہ دوسرا فتنہ عظیم تھا جو اسلام کو پیش آیا۔

بغدادی نے اس زمانے میں جتنے فرقے معتزلہ کے پیدا ہو گئے تھے گیارہ بتایا ہے لیکن شہرستانی وغیرہ نے حمارؔیہ، حایطیہ، مرسیہ کو شمار کر کے ۱۴ بتائے ہیں۔ ہذیلیہ، نظامیہ اسوارؔیہ، معمرؔیہ، بشرؔیہ، ہشامؔیہ، مرادؔیہ، جعفرؔیہ، اسکافیہ، ثمامہ، جاحظیہ۔

ہذیلیہ یہ فرقہ ہذیل علاف مولیٰ عبدالقیس کی جانب منسوب ہے، شیخ موصوف بصرہ کی معتزلہ جماعت کے سردار تھے، بہت بڑے عالم تھے اپنے مذہب کے ثبوت میں بعض خاص مقالات لکھے ہیں بعض چھوٹے چھوٹے فرقے معتزلہ کے مثلاً نظامیہ، بشریہ، ہشامیہ جن کا تذکرہ آگے آئے گا اور جو بعد میں پیدا ہوئے بعض خیالات میں شیخ موصوف کے خوشہ چیں ہیں۔

ابوہذیل[2] ۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۲۶ھ میں فوت ہوئے، وہ خاص خیال جس کی وجہ سے یہ ایک الگ اور مستقل جماعت بن گئی وہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کے فنا ہو جانے کے بعد از سر نو اس کے بنانے پر قادر نہیں ہے۔

نظامیہ۔ یہ اپنے بانی ابراہیم بن یسار نظام کی جانب منسوب ہے یہ مدینہ میں ۱۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور عراق میں ۲۳۱ھ کو وفات ہوئی، انکا بھی شمار معتزلہ کے اہم لوگوں میں تھا فن بیان اور بلاغت کے امام تھے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ جاحظ جو مشہور امام فن بلاغت کا گزرا ہے صاحب موصوف کا شاگرد اور انہیں کا تربیت یافتہ تھا۔ وہ خاص مسائل جس میں انہوں نے عام جماعت سے اختلاف کیا وہ یہ ہیں (۱) جو صلاحیت جس چیز میں موجود ہوتی ہے اس کے

---

(۱) مختصر الفرق بین الفرق

(۲) ابن خلکان جلد اول صفحہ ۶۸۴

رسالہ ادب

"ادب" ہر حیثیت سے اسم با مسمّٰی ہے۔ اردو ادب کی خدمت اس کا شیوہ ہے اور تہذیب متانت اس کا شعار۔ تمام معاصرین نے اس کا شمار بہترین رسالوں میں کیا ہے۔ اور آئندہ بہت کچھ ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ دل آزاری۔ دریدہ دہنی۔ لفظی نزاع۔ جماعتی تنگ نظری۔ مذہبی تعصب اور سیاسی اختلافات کے دھبوں سے ادب کا دامن پاک ہے اس کی تنقیدیں بے لاگ ہوتی ہیں لیکن ادب کے دائرے سے خارج نہیں ہوتیں۔ ادب کسی خاص جماعت کا نقیب نہیں ہے تاہم ادب اہل ادب اس کی برادری میں شامل ہیں۔ ــــــــــ

"ادب" دنیا کو دکھانا چاہتا ہے کہ موجودہ صحافتی طوفان بے تمیزی میں بھی ادبی خدمات کا دامن تمام آلائشوں سے کیونکر پاک رکھا جا سکتا ہے۔ مذاق عام کی پیروی کے سائے میں پروان چڑھنا تو آسان ہے لیکن ادب کا مطمح نظر اس سے بلند ہے۔ وہ مذاق عام کی اصلاح اور ادبیت و ادبی خدمات کا صحیح معیار پیش کرنا چاہتا ہے۔ کیا اردو کے بہی خواہ اس مقصد مقاصد کے حصول میں ادب کی مدد کرینگے۔

اگر آپ کو اس رسالے کی شان۔ بلند نگاہی۔ اور متانت کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے چند پرچے ملاحظہ فرمائیے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ حجم کم از کم ۷۲ صفحے چندہ للعہ سالانہ ایک پرچے کی قیمت ۶ر

منیجر "ادب" متصل چوراہا یحییٰ گنج لکھنؤ

مطبوعات

ہندوستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد

۱۔ ازمنہ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات | از علامہ عبداللہ یوسف علی ایم اے۔ ایل ایل۔ ایم سی۔ بی۔ ای۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے غیر مجلد صرف

۲۔ اردو زبان اور ادب (یعنی زبان اور ادب کی مختصر تاریخ) از مولوی سید محمد ضامن علی صاحب ایم۔ اے۔ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ (صرف)

۳۔ عرب و ہند کے تعلقات | از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مجلد ۴۴۲ صفحات۔ قیمت چار روپیہ

۴۔ ناتن (جرمن ڈراما) | ترجمہ۔ مولانا محمد نعیم الرحمان صاحب ایم اے۔ ایم آر اے۔ ایس مجلد ۵۰۰ صفحات قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)

۵۔ فریب عمل (انگریزی ڈراما) | ترجمہ۔ بابو مکت موہن لال صاحب روہتگی۔ مجلد ۳۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپیہ (عہ)

زیر طبع

۱۔ قرون وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن | از رائے بہادر بھابھو پادھیائے پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا

۲۔ ہندی شاعری۔ از ڈاکٹر اعظم کریوی

۳۔ ترقی زراعت۔ از جناب مولوی محمد عبدالقیوم صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت۔

ملنے کا پتہ: جنرل سکرٹری ہندوستانی اکیڈمی۔ یوپی۔ الہ آباد

ہندو مسلم اتحاد کیونکر ہو سکتا ہے

بشرطیکہ ہم دوسرے مذاہب کا مطالعہ نیک نیتی اور انصاف پسندی سے کریں اور اظہار خیالات میں فریق ثانی کے جذبات و حساسیات کا احترام کرنا اپنا فرض سمجھیں مذہبی مناقشات کی سب سے بڑی وجہ غلط بیانی اور بدگمانی ہے ہندو مسلم فسادات کا سبب بھی یہی ہے اسلئے پرامن اور صلح کل زندگی بسر کرنے کیلئے مذہبی معلومات کا حاصل کرنا نہایت ضروری ہے یہ مقصد صرف

اخبار پیغام صلح

کے مطالعہ سے پورا ہو سکتا ہے جو لاہور کا ایک سہ روزہ مذہبی اخبار اور اسلامی و غیر اسلامی معلومات کا مخزن ہے پیغام صلح تمام دنیا کے مذہبی پیشواؤں کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے غیر مسلموں کو اسلام کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے اور انہیں صلح کا پیغام پہنچاتا ہے ہر مذہب و ملت کے اردو خواں سنجیدہ اور مذہبی مذاق رکھنے والے اصحاب اسکے بصیرت افروز مضامین سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں کتابت اور طباعت کے اعتبار سے بھی پیغام صلح

ایک اعلیٰ حیثیت رکھتا ہے

شروع چندہ سالانہ (چھ روپے) ششماہی (تین روپے) سہ ماہی (دو روپے) اطباء سالانہ (چار روپے)

ممالک غیر سالانہ (پندرہ شلنگ) نمونہ کا پرچہ مفت۔ منیجر اخبار پیغام صلح لاہور

کیا نام کہ ہم پھر آ گئے

حاجی الحرمین الشریفین حاجی ملنگ العلی المعروف بالبھول بحاجی بغلول نور اللہ مرقدہ

کیا نام کہ

صرف تین روپے سکہ رائج الوقت چہرہ شاہی کہ نصف جس کے ایک روپیہ آٹھ آنے ہوتے ہیں، دفتر رسالہ "کامیابی" دہلی میں پہنچکر آپ پورے ایک سال تک بحساب شمسی و قمری ہر مہینہ ہماری زیارت کر سکتے ہیں۔

کہ ہم کامیابی میں ہر مہینہ اتنی "سیاح" طبع کرا کر اور چھپوا کر پرنٹر و پبلشر کیا کریں گے۔

روپے بھیجنے کا پتہ:- منیجر رسالہ "کامیابی" پوسٹ بکس نمبر ۱۱۵ دہلی

ایجنٹوں کی ضرورت ہے

جو ہمارے ہر قسم کے دیسی اور ولایتی کپڑے کے آرڈر حاصل کر سکیں۔ تنخواہ تیس روپیہ ہوا سے سنوارد پیہ ہوا تک دیجائیگی ضمانت نقد مبلغ دو سو پچاس روپیہ داخل کرنا ہوگی، جو صاحب نقد ضمانت نہ داخل کر سکیں وہ درخواست کرنیکی زحمت نہ گوارا فرمائیں۔ جواب کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ آنا لازم ہے۔

سنٹرل کمرشل کمپنی لائل پور (پنجاب)

THE NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY.

BOOK-DEPOT

DELHI.

The Spirit of Islam: New and revised edition. A History of the evolution and ideals of Islam with a Life of the Prophet. Two new chapters have been added two this new addition, on the Apostolical Succession and on Mysticism, as well as considerable new matter in the Introduction and in the chapter on "The Rationalistic and Philosphical Spirit of Islam" By the Rt. Hon. Syed Amir Ali. P. C., L. L. D. C. I. E.

Rs. 20.

Studies in Persian Literature: An account of the birth of Mohammadan Persia and the Persian Language, and the rise of the Ghazna with a digression on Critics and Persian Literature and a Criticsmof the poetry of Firdawsi. Manuchehri and Unsuri. By Syed Hadi Hasan B.A..B.Sc.(Cantab)

Rs. 5.

Islamic Culture and National Education: By Dr. Sir P.C. Roy, with a Foreword by A. M. Khwaja, B. A. (Cantab) Bar-at-Law. As. -8-

Laolus and other Poems: Charmingly bound. printed at the Jamia Press in Clear type. The Volume makes an appropriate gift for those who not only appreciate handsome books but desire to read and re-read the books they possess By Eric Dickinson.

Rs. 2-4-

Thoughts on the present Discontent: Reprinted from the "Times of India" and the "Indian Spectator." By Maulana Mohammad Ali.

Re. 1.

ہمدرد کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
جلد ۱۳
شمارہ ۱۵
ریاست حیدرآباد مئی سنہ ۱۹۳۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولٰنا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۴ | بابتہ ماہ مئی سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر ۵

فہرست مضامین

۱۔ ہندوستان میں فن کا دور جدید	ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب پی ایچ۔ ڈی	۳۲۲
۲۔ رباعیات عزیز	مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی	۳۲۹
۳۔ سیاسیات پر چند عربی تصانیف	عبدالقادر صاحب بی اے (جامعہ)	۳۳۰
۴۔ سنجیدگی کا دوسرا رخ	قاضی عبدالغفار صاحب	۳۴۰
۵۔ جدید علم کلام	قاری سرفراز حسین صاحب	۳۴۹
۶ تاریخ نثر اردو	جناب احسن مارہروی	۳۵۸
۷۔ روس میں افسانوں کا ارتقاء	جناب عزیز احمد صاحب عثمان آبادی	۳۶۶
۸۔ ایک بدنصیب انسان	مولٰنا محمد حسین صاحب محوی	۳۷۷
۹۔ مزدور و سرمایہ دار (نظم)	" " "	۳۸۷
۱۰۔ تنقید و تبصرہ		۳۹۰
۱۱۔ شذرات		۳۹۵

ہندوستان میں فن کا دورِ جدید

(۳)

بمبئی آرٹ اسکول

سرعنوان بالا کے ضمن میں فن اور تنقید فن کے متعلق ہم سال گذشتہ کے جون کے پرچے میں اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں، یعنی یہ بتلا چکے ہیں کہ فن کا صحیح مفہوم کیا ہے اور تنقید فن کا موجودہ رنگ کیا ہے۔ اور کیا ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد ماہ ستمبر کے نمبر میں ہم نے ٹیگور اور ٹیگور کے شاگرد اور خوشہ چیں کے عنوان ضمنی میں ہندوستان کے سربرآوردہ فنی نمائندوں کے اوپر اظہار رائے کیا ہے اور ضمناً انکا یورپ کے دورِ جدید کے استادان فن سے موازنہ بھی کیا ہے۔ مضمون کے اس تیسرے حصہ میں ہم ٹیگور کے علاوہ جو اثرات موجودہ فن پر مسلط ہیں۔ اُن پر نظر ڈالیں گے۔ افسوس اس کا ہے اور وہ بھی کم نہیں بلکہ نہایت تنگی و افلاس کے ہاتھوں ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم جن مصوروں اور جن تصویروں کا ذکر کرتے ہیں ان کے مرقع بھی شائع کر سکیں۔ اس سے کہنے والے کی بات آدھی رہتی ہے۔ اور پڑھنے والا اگر یہ خشک بیانی جھیل بھی لے گیا تو آخر تشنہ رہتا ہے۔ بہرصورت۔

گذشتہ مضمون میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان میں ٹیگور کا کیا عمل اور کیا اثر رہا ہے اور ان کے اثر سے گریز ہر کس و ناکس کے لئے کس درجہ دشوار ہے۔ البتہ وہ لوگ اس سے آزاد ہیں جو حکومت حال کے زیر سایہ فن کے یورپی نہیں بلکہ انگریزی نقطہ نظر کے حامل ہیں۔ اور جن کی تعلیم بالذات یا بالصفات انگریزی روش کے سب سے بڑے مدرسہ یعنی بمبئی آرٹ اسکول میں ہوئی ہے۔ اس رنگ کا صحیح اندازہ لگانیکے لئے ضروری ہے کہ اس اسکول کی سالانہ نمائش میں بمبئی

کے سربرآوردہ مصوروں اور صورت تراشوں کے کارناموں کو دیکھا جائے۔ ان نمائشوں میں اگر آپ جائیں تو دیکھیں گے کہ دیواروں پر شروع سے اخیر تک بھڑکیلے دھان تصویریں نہایت بے ڈھنگے پن کے ساتھ لدی ہوئی ہیں اور ان میں سے بے شمار نمونوں کے نیچے۔ خدایان ذوق کہئے یا ممتحنان فن کے مختلف الشدت نعرہ ہائے تحسین چسپاں ہیں۔ کسی چٹھی پر لکھا ہے کہ "خوب" کسی پر "نہایت خوب" کسی پر "تمغۂ نقرئی" کسی پر "تمغۂ طلائی" کسی پر دو سو کا انعام سرکار کسی پر اسیقدر انعام دربار وغیرہ وغیرہ اور جس پر کچھ نہ ہو اس کو جانئے کہ امتحان میں فیل۔ پھر اس شدت رائے میں بالعموم جس بدمذاقی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ کچھ دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ تصویروں کو دیکھئے تو ان میں رنگوں کی وہ بے معنی بھرمار کہ ان میں کہیں انفرادی ذوق نگاہ کا پتہ نہیں چلتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسٹیشن پر انگلستان کے بنے جرمنی کے چھپے Visit Kashmir یا Visit Benares کے اشتہار لٹکے ہوئے ہیں جس طرح ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے اسی طرح مغرب کے جہانیاں جہاں گشتوں کو پورٹ سعید کے اس طرف بس رنگ ہی رنگ کی بوچھار نظر آتی ہے اور انکے مصوروں کے یہاں سال بھر ڈلوں کی ہولی رہتی ہے۔ ان کے زیر اثر ہمارے غریب ہم ملک بھی سبز سرخ کی چٹک مٹک "ڈبل میں آپ ہی آپ" بنانے لگتے ہیں یہ نہیں کہ آدمی رنگوں کے چٹخارے کا قائل نہ ہو یا اس سے منکر ہو کہ ہندوستان بلکہ سارے مشرق میں رنگوں کا نکھار خاص بات رکھتا ہے۔ لیکن رنگ صرف سطحی چیز ہے اور نیا آنیوالا ایک نئی دنیا میں صرف سطحی چیز کو دیکھتا ہے اگر خوش نیت ہے تو شوخی رنگ و بو کی محظوظ ہوگا اگر بدنیت ہے تو مس میو کیطرح مایوں میں منہ ڈالکر خود پراگندہ ہوگا اور دوسروں کو پراگندہ کریگا۔ مگر ہم تو ہندوستان میں بسنے نہیں ہیں۔ ہم خدا کے بندے یہ رنگ و آب کیوں بھریں۔ ایک جنج ہے کہ رنگ، رنگ، رنگ! رنگ اے جنٹا میں نہیں؟ مغل روش میں نہیں؟ راجپوت مصوری میں نہیں؟ لیکن ہمارے رنگوں کے پس پشت جو شے ہے دیکھنے والا اسکو دیکھے اور دیکھنے والا یہ دیکھے کہ ہمارے رنگ کبھی بے درد نہیں ہوتے اور انسے گہرائی پھوٹ پھوٹ کر نمایاں ہے انکے پس پشت ہم کہیں گوتم بدھ کا شدت سکون نظر آتا ہے تو کہیں نٹ راجا کے رقص کی شدت حرکت کہیں

جہانگیر کے عیش و طرب کا شدت لطف تو کہیں سرمد شہید کا شدت جذب بمبئی میں ہم کو یہ نہیں ملتا بمبئی میں ہم دیکھتے ہیں تو ہیں وہاں کے فیل، فیل اور پاس بالعموم در فیل نظر آتے ہیں۔ "کولا کو" کی خیرا کشہ تصویریں اچھی ہوتی ہیں بقول بمبئی والوں کے "چلین گا" لیکن اس سے زیادہ نہیں اور وہ بھی اس نا ہندی رنگ میں رنگے ہیں جو چند مستثنیات کو چھوڑ کر بمبئی کے بالعموم تمام مصوروں پر چھایا ہوا ہے۔ ان مستثنیات میں ایک بہتر شخصیت ہیں "اہی ڈی" لیکن وہ بمبئی اسکول کے ہاتھوں نہیں بلکہ بہت کچھ پھر ٹیگور ہی کے ہاتھوں۔ تاہم اہی وای کا طرز نہایت خاص ہے۔ انکا راستہ بنگال اسکول سے بڑی حد تک جداگانہ ہے۔ ان کی تصویروں میں ایک بہتر تصویر ہے "بھگت ہریداس" جسکو دیکھنے سے اس دعوے کی دلیل ملتی ہے لیکن بمبئی کے خدایان فن کے منتخب ترین بندوں میں مسٹر ٹاسکر معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ ان کو اپنے موقلم پر بہت کچھ قابو ہے اور وہ خود داری میں بھی کوشاں ہیں لیکن ایک تو ان کی یہ ہوس ان کو تباہ کرتی ہے کہ دریائے گنگا کے بہ شدت ہندی کناروں پر روم اور یونان کے سستے بے مزہ رنگ ڈھنگ پیش کریں اور دوسرے ان کی بت گری میں ان پر راوی ورما کا بدمذاق اور بے وقار رنگ حاوی ہے جو کھاتے پیتے حلوائیوں، دربان بیڑی سگریٹ والوں یا انہیں جیسی ذہنیت کے مہاراجاؤں کے مکانوں کی سجاوٹ میں صرف ہوتا ہے۔ اس قماش کے مصوروں کی انتہا ہم کو وہاں کے دو مسلمان حضرات میں نظر آتی ہے یعنی مسٹر علی بخش اور مسٹر شریف میں جنکو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ہندو بھائیوں کے جذبات کا نہایت وطن پرستی کے ساتھ احساس ہے لوبازار کے بھاؤ اور بکری کا نہایت صحیح اندازہ ہے۔ مذہب نہیں لیکن طائیت کا خطرناک جمود وہ شے ہے جو ہندوستان کے فن کو اسی طرح پامال کر رہا ہے جس طرح ہندوستان کی سیاسیات کو اور جس طرح سیاسیات میں اسی طرح فنیات میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ہمہ وقت عوام کے رکیک احساسات پر اپنے رکیک اغراض کی پرورش کرتے رہیں گے خواہ وہ زمانہ موجودہ کے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا کر ممکن ہو یا زمانہ پارینہ کے۔

اوپر ضمناً حلوائیوں اور دربان بیڑی۔ سگریٹ والوں کی خوش مذاقی کا ذکر آیا ہے ان

سے شکایت بجا۔ ان کا طبقہ دنیا میں ہر جگہ رہا ہے اور رہے گا۔ ہاں رونا ہے تو اس کا کہ ہمارے یہاں ان اونچے طبقوں میں انہیں کا سا مذاق رائج ہے جو ہر ملک میں اور ہر زمانہ میں صحت مذاق کے حامل رہے ہیں اور جن کے وجود کا سچ پوچھئے تو صرف یہی ایک کفارہ رہا ہے کہ انہوں نے فنی قدروں کی رکھوالی کی ہے۔ صحیح مذاق ہمیشہ ملک رہی ہے ایک مخصوص گروہ کی جس میں ایک طرف تو فن کے برتنے والے اہل فن ہوتے تھے اور دوسری طرف اس کے سمجھنے پرکھنے اور فن سے دلچسپی رکھنے والے۔ اور یہ گروہ سرچشمہ ہوتا تھا فنی قدروں کے انعکاس کا جس سے عامی الحس بھی ایک حد تک ترجمان ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آج ہمارے یہاں جبکہ فن کی پرانی روشنیں پامال ہو چکی ہیں اور نئے سانچوں میں ڈھل رہی ہیں ہم اپنے یہاں رؤسا کے اُس طبقہ کو سراسر ناپید پاتے ہیں۔ عام طور پر اس طبقہ کا معیار حسن محض قیمت رہ گیا ہے۔ یہ حضرات رُوس رائیس سے لے کر فورڈ کے چوپہیے تک حسب المقدور مشینوں کے علاوہ قیمتی سے قیمتی اور ارزاں سے ارزاں یورپ کی مشینوں کا بنا ہوا کوڑہ خریدیں گے۔ لیکن خود ہندوستان کے فن اور دستکاری کے بہترین نمونہ ان کے پس پشت رہیں گے اور عام درباری اس قیمتی خرافات کو دیکھیں گے اور عش عش کرینگے۔ "جی ہاؤ سر کار"۔ اکثر شاید معترض ہوں کہ نہیں ہمارے یہاں ایک نئی زمین اور نیا آسمان بن رہا ہے اور ہمارے متمول طبقہ میں فنی قدر کا حس آچلا ہے۔ لیکن بمبئی کی نمائش دیکھئے تو اور دہلی کی نمائش دیکھئے تو فرق وقت سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر کسی کو کوئی اچھی چیز نظر آئی تو پوچھنے سے معلوم ہوا کہ کسی سیاح نے لی ہے۔ ایک ہونہار مثال ہیں حیدرآباد کے ایک نہایت درجہ فن پرور نواب جن کے یہاں مغل اور فارسی تصاویر کا نہایت بے بہا ذخیرہ موجود ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ دیکھئے تو یورپ کی بیش بہا مبتذلیات بھی نظر آئیں گی جن کو محل کی سجاوٹ میں ممتاز ترین درجہ نصیب ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے جدید اہل فن اپنی سی کر رہے ہیں اور خوب کر رہے ہیں لیکن عام بدمذاقی کا اثر یا تو یہ ہوتا ہے کہ مصور اپنی اُمنگ کا خون کر کے جس چیز کی مانگ ہے یعنی "تورے نینا تمگر جادو بھرے" بنانے لگتا ہے یا

خودکشانہ اور نخوت آگیں بے نیازی میں اپنی پناہ لیتا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ ہندوستان کے نئے اہل فن اسکول کے لڑکوں کی طرح سونے چاندی کے تمغوں کو اپنا منتہائے نظر نہ بنائیں گے اور اپنے موقلم کی ٹھوکروں سے موتوں کو ایک دن جگائے بغیر دم نہ لیں گے۔

تصویروں کے علاوہ بمبئی میں صورت تراشی کا بھی خاصہ چرچا ہے لیکن کیا صورتوں کے ہال میں داخل ہو جیئے تو ہر مورت موت سے مشابہ زندگی کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی انگلستان میں مادام توسو کے موم خانہ میں اچانک داخل ہو گیا ہے یا کسی عجائب خانہ کے بھس بھرے آدمیوں کی شبیہوں کے کمرہ میں۔ ان مورتوں کو غور سے دیکھکر اپنی موجودہ پستی کی انتہا معلوم ہوتی ہے اور دل کو ایک سخت ٹیس لگتی ہے۔ یہ امر کہ آیا خدائے انسان اور دو عالم کو بنایا ہمیشہ کے لئے فلسفیوں کی فلسفہ بینی کا مرکز رہے گا لیکن ہندوستان کے پرانے بت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس امر کے شاہد ہیں کہ انسان اگر چاہے تو ایسے خدا تراش سکتا ہے جو اپنے کو منوائے بغیر نہ رہیں اور جن کے سامنے سرنیاز کو خم سجدہ کے سوا یارا نہ ہو! اور یہ ہندوستانی جو یہ سب کچھ کر سکتے تھے اور جو پہاڑ کے پہاڑ تراشکر ان کے سینوں میں اجنٹا اور ایلورا جیسے عفریتوں کی جان ڈالنے پر قادر تھے آج اس سے زیادہ کے اہل نہیں کہ ایسے بے جان مردے بنائیں جن میں اگر زندگی کا کچھ شائبہ معلوم ہو تو اس سے زیادہ نہیں جتنا کہ بھس بھرے جانوروں کے ہیولے میں نظر آتا ہے اور انسان کو جس درجہ اپنے وطن کے قدیم صورت تراشوں کی عظمت کا احساس ہوگا اسی درجہ ان ہیولوں کو دیکھکر اپنی حقارت اور کم مائگی پر افسوس و ندامت دامنگیر ہوگی۔ بمبئی کی موجودہ فن صورت تراشی کے سورما تالم گورگاؤکر اور واک نظر آتے ہیں۔ سب کے سب ایک سے بے لطف، بے رنگ، بے کار۔ اس لحاظ سے غزنوی کو اب ہونا چاہیئے تھا نہ کہ جسد نندوانہ نامی ایک غیر پیشہ ور

صورت تراش کے "ہندوستانی بھیا" سے البتہ اُمید کی ایک ذرا سی جھلک نظر آتی ہے۔ شکل کا انوکھا پن، اظہار کا پرتو، دستکاری کی قدرت یہ سب کچھ مگر ڈرتے ڈرتے۔ کس سے؟ تالم، گورگاؤکر اور واگ جیسے بے بضاعت پیشہ وروں سے جن کی ملک اور "گورنمنٹ بہادر" میں ساکھ قائم ہے۔ فن صورت تراشی کو بھی ہندوستان میں ٹیگور جیسے راہبر کی ضرورت ہے۔ اس وقت چاروں طرف دیکھئے مگر کوئی نظر نہیں آتا۔ شاید آگے چل کر کوئی اللہ کا بندہ نکلے اور ان بے رس پیشہ وروں سے نجات دلائے۔

ایک اور چیز بمبئی آرٹ اسکول کے پیروؤں میں خاص طور پر نمایاں ہے یعنی پرانی مذہبی روایات کے علاوہ جو اسلاف کے تخیل خانہ سے ہر شخص کے لئے خیرات بٹتی ہیں، ان کے یہاں فطری منظروں اور شبیہوں کی بھرمار۔ نفسی عنصر ان کے عملوں میں تقریباً ناپید ہے اور جہاں کہیں اس کی کوشش کی گئی ہے نتائج نہایت ناکامیاب رہے ہیں۔ چینی مصوری کے برخلاف ہندوستانی مصوری میں فطری مناظر عام طور پر دوسرے درجہ کی چیز رہے ہیں۔ ان کی حیثیت ہمیشہ پس منظر کی رہی ہے اور اصل تصویر کا جولانگاہ نفس انسان رہا ہے یعنی اُس کے ولولے، اُس کے جذبات، اسکی اُمنگیں۔ چینیوں نے جس چیز کو دامن فطرت کے ہمہ گیر انعکاس میں ظاہر کرنا چاہا اُس کو ہندوستانیوں نے نٹ راجا کے اضطرار رقص یا بدھا کے سکون کل کی شدت میں یکجا کرنے کی کوشش کی۔ اس سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ ان میں سے ایک کی کوشش یا حاصل پر دوسرے کی کوشش یا حاصل کو فوقیت دی جائے بلکہ صرف دو مختلف انسانی صنفوں کے فنی رجحان کے اختلاف کا بیان مقصود ہے۔ لیکن آجکل کے ہندوستانی نہ منظروں کو چینی نقطۂ نظر سے بناتے ہیں نہ خود اپنے اسلاف کے صحیح معنوں میں پیرو ہو کر نفس انسان کی پرکاریوں کی صورت گری کرتے ہیں۔ اُن کے منظر زمین اور آسمان کے

ادھکھڑے ادھکھڑے ٹکڑے ہوتے ہیں جن کو وہ انیسویں صدی عیسوی کی فنی روش کی چاکرانہ تقلید میں کاغذ یا کینوس کی سطح پر نشتم پیش کرتے ہیں۔ ان کے منظر سراسر محدود ہوتے ہیں، اُن میں وہ ہمہ گیریت نہیں جو چینیوں کے منظروں میں پائی جاتی ہے۔ اور ان میں وہ سطحی لطف تک نہیں پایا جاتا جو انیسویں صدی والوں کے عمل میں تھا کیونکہ یہ انکی فطرت پرستی سے بالکل بے واسطہ ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں محض ایک غلام قوم کا غلامانہ رنگ لئے ہوئے۔ اُس میں شخصی مشاہدہ اور دلی مجبوری کا عنصر نہیں ملتا جس کے بغیر تو بس "کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا" یعنی جسد بے جان اور مصور کی بیداد ناداری کا فریادی۔ ہندوستان کے نورنگ اہل فن خواہ وہ ٹیگور اسکول کے دلدادہ ہوں خواہ راجپوت یا مغل اسکول کے پیرو آج سب کے سب اس نکتہ سے آشنا ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر اس قومی وجہ امتیاز میں کوشاں ہیں جس کا بیان اوپر کی سطور میں ہوا ہے۔

جہاں تک شبیہہ کشی کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم کے مصوروں کو اس موضوع سے خاص دلچسپی رہی ہے اور جائز رہی ہے لیکن ہندوستانیوں کی موجودہ شبیہہ سازی میں صرف بُھس بھری کھال والی شباہت نظر آتی ہے۔ یورپ نے بہت کچھ انیسویں صدی میں بے رس شبیہہ سازی سے اپنے کو آزاد کر لیا ہے لیکن عاری التخیل انگریز اور اُنکی ساکھ کے ماننے والے ہندوستانی ابھی تک اسی دھوکے میں مبتلا ہیں۔

رباعیاتِ عزیز

(۱)

دل ہی نہیں وہ بات کہاں سے لاؤں　　عشرت کے خیالات کہاں سے لاؤں
وہ دانت ہیں موتی سے نہ وہ موئے سیاہ　　اب تاروں بھری رات کہاں سے لاؤں

(۲)

سب محوِ تحیر ہیں کوئی کیا بولے　　غنچہ کہ ہے لب بستہ زباں کیا کھولے
پرواز پہ مائل ہے چمن کا عالم　　جو پھول شگفتہ ہے وہ ہے پر تولے

(۳)

پیمانہ جاں کا حسن سے مملو ہے　　شاخوں میں نزاکت ہے گلوں میں بو ہے
آنکھوں میں کچھے نہ کیوں جمالِ ہستی　　رنگینیٔ نقشِ آفرینش تو ہے

(۴)

ہر پھول میں تیرے گلِ عارض کی مہک　　ہر نور میں تیرے رُخِ روشن کی چمک
میرے دلِ تاریک کو بھی چمکا دے　　روشنگرِ جاں انجمن افروزِ فلک

سیاسیات پر چند عربی تصانیف

ہر چند سیاسیات صدیوں سے ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر چکی ہے، ہندوستان میں کم لوگ اس علم سے واقف ہیں، یہ ایک حد تک تو نتیجہ خود اپنی بے پروائی کا ہے، لیکن اس کی زیادہ تر ذمہ داری ہماری علم پرور سرکار پر عائد ہوتی ہے جس نے شاید کسی اندیشہ سے سیاسیات کو اپنے نصاب تعلیم میں ابتک سرے سے جگہ ہی نہیں دی تھی۔ تاہم خطاکار ہندوستانیوں نے اس شجر ممنوعہ کا پھل کھا کر بالآخر اس کو اپنے آپ پر حلال کرا ہی لیا۔ ادھر ملکی و بین الاقوامی سیاسیات سے تعلقات قریب تر ہو جانے کے باعث سیاسیات سے ہماری وہ بے توجہی بھی نہیں رہی۔ چنانچہ اب کم و بیش ہندوستان کے تمام مراکز علمی میں یہ علم دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے اور ایک محدود دائرہ کے اندر فلسفہ سیاست کے مسائل و نظریات پر مباحثے بھی شروع ہو گئے ہیں۔

مسلمان اس دعوے کی بنا پر، کہ اسلام ایک مکمل مذہب ہونے کی حیثیت سے اپنا مخصوص سیاسی نظام بھی رکھتا ہے، اپنے سیاسی عقائد کو مذہبی لباس میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اختلاف خیال ہر معاملہ میں اسی قدر ہے جتنا کہ ممکن ہے۔ مثلاً ہندوستانی خلافتیوں کے نزدیک ساری دنیا کے مسلمانوں کا ایک سیاسی نظام کے ماتحت آنا انکی بقاء حیات کے لئے ضروری ہے اور اسکے فرائض دینی میں داخل۔ ترک اسے نہ تو علاً ممکن سمجھتے ہیں نہ مصلحۃً و مذہبًا ضروری۔ کوئی کہتا ہے اسلام "ملوکیت" کو مٹانے آیا ہے۔ کوئی "دول فطرت" "جمہور" سے "متاع معنی بیگانہ" کی تلاش عبث سمجھکر مشورہ دیتا ہے کہ ؎

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

کوئی اجتماعیت کا حامی ہو کوئی انفرادیت کا موید وقس علیٰ ہذا۔ ان اختلافات کو دیکھکر طبیعت قدرۃً اصلی ماخذوں سے براہ راست حقیقت معلوم کرنے کیلئے فکرمند ہوتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ابھی تک کوئی ایسی کتاب تصنیف نہیں ہوئی ہے جو اسلامی سیاسی نظریات کو ہمارے سامنے مرتب صورت میں پیش کرے۔ یہ ایک ایسی کمی ہے جس کا احساس سیاسی بحثوں کی اہمیت کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتا جارہا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ جلد ہی اگر محض اپنے ذوق علمی سے نہیں، تو ضرورت سے مجبور ہوکر ہمیں یہ کمی پوری کرنی پڑے گی۔

اس موضوع سے متعلق پرانی تصانیف کا جن میں بہت بڑی تعداد قلمی کتب کی ہوگی، علم اور انکی فراہمی، مولف کی سب سے پہلی اور غالباً سب سے بڑی مشکل ہوگی۔ کیونکہ یہ سب یکجا نہیں مل سکتیں انکے لئے یورپ، مصر، عرب اور ہندوستان کے کتب خانوں کی تلاشی لینی پڑے گی۔

ظاہر ہے کہ اسلام کا نظریہ سیاسی معلوم کرنے کے لئے تو قرآن اور حدیث ہی سب سے معتبر ماخذ ہیں لیکن دنیاوی سیاست کی ضرورتوں نے اصلی تعلیم کی تعبیر مختلف اوقات میں مختلف کی ہے اس لئے جو شخص اسلامی نظریات سیاسی کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس بارہ میں فقہ کے مختلف مذاہب کی تعلیم کے علاوہ ان تصانیف کو بھی پیش نظر رکھے جو مختلف زمانوں میں سیاست یا اخلاق پر لکھی گیں۔ ذیل میں ہم چند عربی کتب کی فہرست درج کرتے ہیں جن کا تعلق سیاسیات سے ہے۔

یہاں یہ ذکر کردینا ضروری ہے کہ قدیم مسلمان مصنفوں نے اکثر سیاسیات کو اخلاقیات و فقہ وغیرہ کے ضمن میں جگہ دی ہے۔ اس لئے ان مضامین پر جو کتابیں ہیں وہ کلام مجید، احادیث شریفہ اور کتب تواریخ کے علاوہ بہت کچھ معلومات کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ فہرست میں جابجا آپ کو دوسرے مضامین کی کتابیں ملیں گی جن کو اس لئے درج کردیا گیا ہے کہ بالواسطہ وہ سیاسیات سے بھی تعلق رکھتی ہیں۔

ہر کتاب کے ساتھ فہرست میں حتی الامکان اس کتب خانہ کا پتہ بھی لکھدینے کی کوشش

کی گئی ہے جہاں وہ موجود ہے لیکن کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جن کا نام مصنف کے حال کے ساتھ تو معلوم ہے مگر یہ نہیں معلوم کہ وہ کہیں موجود ہیں یا ضائع ہوگئیں۔ تاہم احتیاطاً انکا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ شاید کسی کے بندے کو انکا سراغ لگانیکی توفیق ہو۔ اسی مصلحت سے ان مصنفین کے نام اور حالات بھی درج کر دئے گئے ہیں جن کی بابت معلوم ہے کہ انہوں نے سیاسیات پر کوئی کتاب تصنیف کی تھی لیکن نہ تو کہیں تصنیف کا نام ملتا ہے نہ پتہ۔ (عبدالقادر)

۱۔ کتاب الخراج۔ مصنف ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم بن حبیب الکوفی الانصاری کوفہ میں پیدا ہوا۔ سال پیدائش ۱۱۳ھ/۷۳۱ء ہے اور سال وفات ۱۸۲ھ/۷۹۸ء۔ مصنف کے شاگرد محمد بن الحسن الشیبانی نے مذکورہ کتاب مرتب کی۔ ۱۳۰۲ھ میں بلاق میں چھپ گئی ہے۔

۲۔ کتاب الخراج مصنف یحیی بن آدم بن سلیمان۔ کسی فقہی مذہب سے تعلق نہ رکھتا تھا ۲۰۳ھ میں انتقال

۳۔ ترجمہ خطوط ارسطو بنام سکندر۔ مترجم ابو العلی سالم کاتب ہشام بن عبدالملک تھا۔ اسکا زمانہ حیات ۱۲۵ھ کے حدود میں سمجھا جاتا ہے۔ کتاب کوئی سو ورق کی تھی۔

۴۔ کتاب سلوک الممالک فی تدبیر الممالک۔ مصنف شہاب الدین احمد بن محمد بن ابی الربیع۔ خلیفہ معتصم (۲۱۸ھ/۸۳۳ء - ۲۲۷ھ/۸۴۲ء) کے لئے لکھی گئی۔ یہ شاید سب سے پرانی اسلامی کتاب ہے جو خلیفہ سیاست کے موضوع پر آج کل موجود ہے۔ پیرس کے قومی کتب خانہ میں ہے ۱۳۱۸ھ میں قاہرہ میں چھپ بھی گئی ہے۔

۵۔ کتاب الخراج مصنف قدامہ بن جعفر۔ یہ ۲۹۰ھ کے حدود میں زندہ تھا۔ پہلے عیسائی تھا پھر مکتفی باللہ کے سامنے اسلام قبول کیا۔

۶۔ کتاب السیاست۔ مصنف قدامہ بن جعفر

۷۔ کتاب السیاست کبیر۔ مصنف ابو زید بلخی فلسفی معتزلی متوفی ۳۲۲ھ۔

۸۔ کتاب السیاست صغیر۔ مصنف ابو زید بلخی۔

۹۔ کتاب ادب السلطان والرعیۃ۔ مصنف ابو زید بلخی

۱۰۔ اقتدار مع الاخلاق ۔ مصنفہ ابن عبدالبر الخزاعلی متوفی ۳۲۹ھ

۱۱۔ کتاب الالفاظ الافلاطونیہ وتقویم السیاسۃ الملوکیہ والاخلاق ۔ از ابونصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی متوفی ۳۳۹ھ ۔ یہ کتاب کتبخانہ ایاصوفیہ استنبول میں موجود ہے ۔

۱۲۔ تلخیص نوامیس افلاطون ۔ از ابونصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی لائڈن میں موجود ہے ۔

۱۳۔ التنبیہ علی سبیل السعادۃ (یا "رسالۃ السعادۃ") از ابونصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی ۔ یہ کتاب برلن میں بھی ہے اور برٹش میوزیم میں بھی ۔

۱۴۔ کتاب سیاسۃ المدنیہ ۔ مصنفہ ابونصر محمد بن محمد طرخان الفارابی ۔ یہ کتاب برٹش میوزیم اور لائڈن کے کتب خانہ میں موجود ہے ۔

۱۵۔ کتاب فی مبادی ارا ء اہل المدنیۃ الفاضلہ ۔ مصنفہ ابونصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی ۔

۱۶۔ کتاب الملۃ الفاضلہ مصنفہ ابونصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی ۔ لائڈن میں موجود ہے ۔ بلا نام سرورق ہے ۔ فہرست میں اندراج کی غلطی ہوئی ہے ۔

۱۷۔ فصول ۔ مصنفہ ابونصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی ۔ کتب خانہ بوڈلین آکسفورڈ میں موجود ہے ۔

۱۸۔ جوامع السیر المرضیۃ فی اقتناع الفضائل الانسیۃ ۔ مصنفہ ابونصر محمد الفارابی ۔ لائڈن میں موجود ہے ۔

۱۹۔ کتاب ۔ از امام فخرالدین بن الخطیب الرازی

۲۰۔ تصانیف قاسم ابن اصبغ بن یوسف متوفی ۳۴۰ھ ۔ اس کی تصانیف کا پتہ نہیں ۔ لیکن یہ اپنے دور کا فلسفہ اخلاق و سیاست کا سب سے بڑا مصنف ہے ۔ ولید بن عبدالملک کا مولیٰ تھا اور شہزادوں کا معلم ۔ محدث بھی تھا ۔ ابن الفرضی کہتا ہے کہ عبدالرحمن بن محمد بادشاہ اندلس نے خلافت سے پہلے اس سے پڑھا ہے ۔ پھر اس کے ولیعہد حاکم اور اس کے بھائیوں نے اس سے پڑھا ۔ حکومت کے کام میں اس سے مشورے لیتے تھے ۔

۲۱۔ فن حکومت کی ایک کتاب جو عبیداللہ المعیطی نے لکھکر حاکم ثانی کے نام پر معنون کی ۔ مصنف

۳۶۶ھ کے حدود میں زندہ تھا اور قرطبہ میں حاکم ثانی کے زمانہ ہی میں تھا جس نے اس کو اپنی مجلس شوریٰ میں داخل کر لیا تھا۔ کتاب کا پتہ نہیں۔

۲۲۔ ابو محمد عبداللہ الغنی بن سعد بن علی بن بشر بن مروان بن عبدالعزیز متوفی ۴۰۹ھ/۱۰۱۸ء نے بھی کچھ سیاسیات کے موضوع پر لکھا ہے لیکن اسکی کسی تصنیف کا نام یا پتہ نہیں معلوم۔

۲۳۔ سیاست ملکی اور اصول حکومت پر دو کتابیں احمد ابن عبدالملک ابن ہشام متوفی ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء نے لکھکر حاکم ثانی کی خدمت میں پیش کیں ایک کتاب کا نام شاید "کتاب الاستیعاب" تھا جس کی تیاری میں مصنف کو عبیداللہ المغیطی نے بھی مدد دی تھی۔ اس کو دیکھکر حاکم ثانی نے دونوں کو اپنی مجلس شوریٰ میں داخل کر لیا تھا۔ احمد ابن عبدالملک کی کسی کتاب کا پتہ نہیں۔ Casiri کا قول ہے کہ احمد ابن عبدالملک نے ۴۰۰ھ میں انتقال کیا۔ یہ اشبیلیہ کا رہنے والا تھا۔

۲۴۔ کتاب البر والاثم مصنفہ ابی علی بن سینا۔ مصنف کا سال پیدائش ۳۷۰ھ/۹۸۰ء ہے اور وفات ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء ہے

۲۵۔ نصیحۃ الملوک مصنفہ الغزالی۔ یہ ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں پیدا ہوئے اور ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء میں فوت ہوئے

۲۶۔ کتاب الاحکام السلطانیہ (والولایات الدینیہ) مصنفہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی یہ شافعی المذہب تھا۔ بصرہ اور بغداد میں تعلیم پائی۔ استوی میں (نیشاپور کے قریب) عرصہ تک قاضی رہا۔ پھر مستقل طور سے بغداد میں سکونت اختیار کر لی۔ اپنی زندگی میں اس نے اپنی کتابیں شائع نہیں کیں۔ ۸۶ سال کی عمر پاکر ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں انتقال کیا۔

۲۷۔ کتاب نصیحۃ الملوک۔ مصنفہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی۔ پیرس میں موجود ہے۔

۲۸۔ کتاب قوانین الوزارۃ۔ مصنفہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی۔ کتب خانہ شاہی شہر ویانہ اسٹریا میں موجود ہے۔

۲۹۔ کتاب تعجیل النذرۃ وتعجیل الظفر۔ مصنفہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی۔ غالباً ۱۸۷۳ء میں چھپ چکی ہے۔ گوتھا میں موجود ہے۔

۳۰۔ کتاب آداب الدنیا والدین۔ مصنفہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی قسطنطنیہ میں ۱۲۹۹ھ میں چھپی اور قاہرہ میں ۱۳۰۱ھ و ۱۳۱۰ھ میں چھپی۔

۳۱۔ سراج الملوک۔ مصنفہ ابوبکر محمد بن الولید بن محمد بن خلف الطرطوشی اندلسی ۴۵۱ھ/۱۰۵۹ء میں پیدا ہوا۔ اور ۵۲۰ھ/۱۱۲۶ء میں انتقال کیا۔ کتاب ۱۲۸۹ھ میں قاہرہ یا بقول صاحب الکتفاء القنوع اسکندریہ میں چھپ چکی ہے۔

۳۲۔ سلوان المطاع فی عدوان الطباع۔ مصنفہ محمد بن محمد بن ظفر الصقلی متوفی ۵۶۵ھ/۱۱۶۹ء تونس میں ۱۲۷۹ھ میں چھپی۔ فلورنزا میں ۱۸۵۱ء میں۔ اماری نے اسکا اطالوی میں ترجمہ کیا ہے۔

۳۳۔ النہج المسلوک فی سیاسۃ الملوک۔ یہ کتاب عبدالرحمن بن نصر بن عبداللہ نے سلطان صلاح الدین کے لئے لکھی۔ بلاق سے ۱۸۴۱ء میں چھپکر شائع ہو چکی ہے۔

۳۴۔ الشہب اللامعہ فی السیاسۃ النافعہ۔ مصنفہ ابوالقاسم بن رضوان ۶۰۰ھ کے بعد لکھی گئی۔ لائڈن اور بوڈلین (اکسفورڈ) کے کتبخانوں میں ہے۔

۳۵۔ کتاب قوانین الدواوین اس کتاب کا مصنف ابوالمکارم اسعد بن الخطیر بن المانی ہے۔ جو سلطان صلاح الدین کے زمانہ میں عیسائی سے مسلمان ہوا اور وزیر جنگ مقرر کیا گیا۔ بعدہٗ وزیر ابن شکر کے ڈر سے حلب بھاگ گیا اور وہاں ۶۰۶ھ/۱۲۰۹ء میں انتقال کیا۔ کتاب ۱۲۹۹ھ میں قاہرہ سے چھپکر شائع ہو چکی ہے۔

۳۶۔ کتاب ادب الوزراء۔ احمد بن جعفر بن شاذان نے ناصر لدین اللہ المتوفی ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء کے زمانہ میں لکھی۔ کتبخانہ لائڈن میں موجود ہے۔

۳۷۔ العقد الفرید للملک السعید۔ مصنفہ کمال الدین ابوسالم محمد بن طلحہ بن محمد بن الحسن القرشی العدوی یہ سلطان الملک السعید نجم الدین غازی کا وزیر تھا ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء میں پیدا ہوا اور ۶۵۲ھ/۱۲۵۴ء میں انتقال کیا۔ کتاب قاہرہ سے ۱۲۸۳ھ میں چھپکر شائع ہو چکی ہے۔

۳۸۔ بذل النصائح الشرعیہ فی ما علی السلطان وولاۃ الامور وسائر الرعیۃ۔ مصنفہ نجم الدین احمد

بن محمد بن علی بن الرفعہ المصری الشافعی۔ یہ قاہرہ میں محتسب اور قائم مقام قاضی تھا۔ کتاب گوتھا میں موجود ہے۔

۳۹۔ الفراسۃ لاجل السیاسۃ مصنفہ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی طالب الانصاری الصوفی الدمشقی شامی متوفی ۷۲۷ھ پیرس کے کتبخانہ میں موجود ہے۔ قاہرہ میں بھی ہے۔ لیکن یہاں اسکا نام "السیاسۃ فی علم الفراسۃ" درج ہے۔

۴۰۔ سیاسۃ الامراء ولاۃ الجنود والمتضمن ثلاثۃ عہود۔ یہ کتاب ابراہیم بن عبدالواحد بن ابی التورنے متوکل علی اللہ حفصی (۹۱۸ھ تا ۹۴۷ھ) کے لئے لکھی۔ اسکوریال میں موجود ہے۔

۴۱۔ الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ مصنفہ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب بن قیم الجوزیہ الزرعی الدمشقی الحنبلی۔ یہ ۶۹۱ھ میں دمشق میں پیدا ہوا۔ ابن تیمیہ کا خاص شاگرد تھا۔ اور اسکے ساتھ قاہرہ میں قید ہوا۔ ۷۲۸ھ میں انتقال کیا۔ کتاب قاہرہ اور کتب خانہ رفاعیہ میں موجود ہے۔

۴۲۔ منہاج الوزراء فی النصیحۃ۔ مصنف احمد بن محمود الجیلی الاصفہانی بادی ۷۲۹ھ میں لکھی گئی۔ کتب خانہ ایاصوفیہ میں ہے۔

۴۳۔ تبصرۃ الحکام فی اصول الاقضیہ ومناہج الاحکام مصنفہ ابراہیم بن علی بن محمد بن فرحون المالکی الیعمری الاندلسی۔ یہ مدینہ میں پیدا ہوا اور عہدہ قضاۃ پر مامور ہوا ۷۹۹ھ میں انتقال کیا۔ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ کتب خانہ لائڈن و پرنس میوزیم میں اس کے نسخے موجود ہیں۔ قاہرہ میں چھپ بھی چکی ہے۔

۴۴۔ تاج السعادۃ فی النصیحۃ الملکیہ مصنفہ محمد بن الکاشغری۔ ۷۶۲ھ میں لکھی گئی۔ کتب خانہ ایاصوفیہ میں ہے۔

۴۵۔ واسطۃ السلوک فی سیاسۃ الملوک۔ یہ کتاب دولت زیانیہ کے سلطان ابوحمو موسیٰ ثانی بن یوسف بن زیان العبادی نے لکھی جو تلمسان المغرب کا (۷۶۰ھ تا ۷۹۱ھ) حکمران

رہا۔ خاندان زیانیہ کی حکومت ۷۵۳ھ سے لیکر ۹۶۳ھ تک رہی۔ سلطان موسیٰ ثانی کا کاتب (سکرٹری) علامہ ابن خلدون کا بھائی تھا۔ کتاب تونس میں ۱۲۷۹ھ میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

۴۶۔ الدرہ الغزار فی نصائح الملوک والوزراء۔ مصنفہ محمود بن اسمٰعیل البیزری۔ سال تصنیف ۸۴۱ھ/۱۴۳۷ء ہے۔ کتبخانہ رفاعیہ میں موجود ہے۔

۴۷۔ بذل النصائح الشرعیہ فی اعلی السلطان وولاۃ الامور وسائر الرعیہ۔ مصنفہ محمد المقدسی محب الدین ابوالحامد۔ یہ کتاب نجم الدین احمد کی کتاب کے اتباع میں لکھی گئی جو اسی نام کی ہے اور اسی فہرست میں درج کیجا چکی ہے۔ ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء میں تصنیف ہوئی۔ برلن میں موجود ہے۔

۴۸۔ کوکب الملک دموکب الترک، اس کتاب میں اخلاق سلطانی سے بحث کی گئی ہے جہاں شاہ بن قرہ یوسف کے عہد حکومت (۸۱۳ھ/۱۴۱۰ء تا ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء) میں لکھی گئی۔ مصنف کا نام نہیں معلوم گوتھا میں موجود ہے۔

۴۹۔ البرہان فی فضل السلطان۔ مصنفہ احمد توغان المہدی الاشرفی الحنفی۔ شہاب الدین۔ یہ ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء کے حدود میں زندہ تھا۔ کتاب برلن میں موجود ہے

۵۰۔ منہاج السلوک فی سیرۃ الملوک مصنفہ احمد توغان۔ کتب خانہ ایاصوفیہ میں ہے۔

۵۱۔ المقدمۃ السلطانیہ فی السیاستہ الشرعیہ مصنفہ احمد توغان۔ کتاب قاہرہ میں موجود ہے اور اس کا تتمہ برلن میں ہے۔

۵۲۔ الابریز المسبوک فی کیفیت آداب الملوک۔ یہ کتاب محمد بن علی بن محمد بن قاسم بن الارزق الاصبحی نے ۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء میں وادی آش ( ) میں لکھی

۵۳۔ ہدیۃ العبد الفقیر الی ملک الناصر۔ مصنفہ عبدالصمد بن یحییٰ بن احمد بن یحیی الصالحی۔ یہ کتاب تقریباً ۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء میں لکھی گئی۔

۵۴ - لطائف الافکار و کاشف الاسرار - مصنفہ قاضی حسین بن حسن السمرقندی - یہ کتاب جس کا پہلا حصہ "فی احکام السیاسۃ" ہے وزیر ابراہیم پاشا کے لئے لکھی گئی - اس کے چار اور حصے ہیں - کتب خانہ وین - اسٹریا میں موجود ہے -

۵۵ - فتح الملک العالم المنان علی الملک المظفر سلیمان - مصنفہ محمد بن محمد بن سلطان الدمشقی - اس کتاب میں حکمران کے حقوق و فرائض سے بحث کی گئی ہے - ۹۶۰ھ/۱۵۵۳ء کے قریب لکھی گئی برلن میں ہے -

۵۶ - کتاب الفوز - مصنفہ ابی علی مسکویہ -

۵۷ - کتاب اخلاق الناصریہ - مصنفہ خواجہ نصیر الدین الطوسی -

۵۸ - کتاب الاخلاق الجلالیۃ - مصنفہ جلال الدین محمد الدوانی -

۵۹ - رسالہ - مصنفہ مولنا عضد الدین - اس کتاب پر ایک شرح مصنف کے شاگرد شمس الدین الکرمانی کی لکھی ہوئی ہے اور ایک شرح طاش کوبری زادہ کی -

۶۰ - رسالہ السیاسۃ الشرعیہ مصنفہ ابراہیم بن بخشی زادہ خلیفہ متوفی ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء کتاب برلن کے کتب خانہ میں ہے -

۶۱ - اربعون حدیثان فی فضل السلاطین و الحکام مقسطین - مصنفہ ابو الاخلاص حسن بن عمار الوفائی الشرنبلالی فی الحنفی استاذ فی الازہر - متوفی ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء کتاب برلن میں ہے

۶۲ - حسن السلوک فی معرفت آداب الملک و الملوک - مصنفہ احمد بن احمد الغیومی الغرقادی المالکی - یہ ۱۰۸۴ھ/۱۶۷۳ء کے حدود میں زندہ تھا - کتاب برلن میں موجود ہے -

۶۳ - کشف الاسرار العلمیہ بدار الضرب المصریہ - مصنفہ منصور بن بعرہ الذہبی الکاملی - یہ کتاب ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء میں لکھی گئی - قاہرہ میں موجود ہے -

۶۴ - رسالہ البیان فی التمدن و اسباب العمران - مصنفہ رفیق بک ابن محمود بک العظم المتوفی بدمشق ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء یہ کتاب ۱۳۰۸ھ میں قاہرہ سے چھپکر شائع ہو چکی ہے -

۶۵۔ قانون العدل والانصاف للقضاء علی مشکلات الاوقاف۔ مصنفہ محمد قدری پاشا المتوفی ۱۳۰۳ھ
یہ کتاب مصر سے ۱۳۰۲ھ میں چھپکر شائع ہو چکی ہے۔

۶۶۔ الکلم الثمان۔ مصنفہ حسین المرصفی المتوفی بالقاہرہ ۱۳۰۹ھ۔ یہ کتاب امتہ، وطن، حکومت وغیرہ وغیرہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ قاہرہ سے ۱۲۹۰ھ میں چھپکر شائع ہو چکی ہے۔

۶۷۔ آداب القضاۃ للمنلی۔ یہ کتاب حنفی قوانین قضاۃ پر ہے۔ قسطنطنیہ سے ۱۸۵۱ء میں چھپکر شائع ہو چکی ہے۔

۶۸۔ الشروط والعقود السیاسیہ بین جمہوریات ایطالیہ وسلاطین مصر فی القرون الوسطیٰ۔ یہ ان معاہدوں کا مجموعہ ہے جو اٹلی کی جمہوریتوں اور مصر کے سلاطین میں ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ فلورنز میں موجود ہے اور علامہ اماری کی ادارت میں ۱۸۶۳ء میں شائع بھی ہوا۔

۶۹۔ مجموعہ خطوط خلفا۔ مرتب کردہ ابو اسحٰق ابراہیم بن العباس کاتب، خطیب و شاعر۔

۷۰۔ الدولۃ۔ مصنفہ ابن البطاح۔

۷۱۔ الدولۃ۔ مصنفہ الراوندی۔ یہ راوندی فرقہ کے لوگوں کے ساتھ بہت رہتا تھا۔ اور انہیں حکومت و سیاست کی تعلیم دیتا تھا۔ کتاب میں کوئی دو سو ورق ہونگے۔

سنجیدگی کا دوسرا رُخ

ہر شخص اور ہر معاملہ اور ہر خیال اور ہر واقعہ اپنی سنجیدگی و متانت کے اندر ایک دوسرا رُخ بھی رکھتا ہے جس کی سطح کے نیچے اہل نظر کو تفنن و مزاح کا کبھی ہلکا اور کبھی گہرا رنگ نظر آسکتا ہے تفنن و مزاح کا صحیح مذاق رکھنے والے کسی چیز کی سنجیدگی سے اس درجہ مرعوب نہیں ہوتے کہ اُس کے دوسرے رُخ سے بے پروا ہو جائیں۔

لیجسلیٹو اسمبلی، یا جمعیت مقننہ، ملک کی سب سے بڑی قانون ساز جماعت کہی جاتی ہے یہ جماعت برطانوی دارالعلوم کی سگی تو نہیں مگر سوتیلی بیٹی ضرور ہے۔ فرق یہ ہے کہ "والدۂ محترمہ" گھر کے جزو کل کی مالک ہیں اور بیٹی ہنوز گڑیوں سے کھیل رہی ہے! کیا عجب ہے کہ عالم بلوغ میں اس بیٹی کا دور دورہ بھی ماں سے کم نہ ہو۔ بہرحال بیٹی تو اُسی ماں کی ہے اور رنگ ڈھنگ بھی وہی ہے مگر ابھی اس بیٹی نے ماں کے سب "لچھن" نہیں سیکھے ہیں۔ وہاں تو اب مزاح و تفنن اتنا گندہ ہو جاتا ہے کہ گالی گلوچ اور گھونسے لات تک نوبت آجاتی ہے۔ مثلاً دارالعلوم کا تازہ واقعہ سننے کے قابل ہے۔ فوجی بجٹ پر بحث ہو رہی تھی اور ارل ونٹرٹن شب کے ۲ بجے تقریر فرما رہے تھے وہ اپنی تقریر میں سوشلسٹ ممبران کے متعلق کچھ اسقدر جلی کٹی فرما رہے تھے کہ ان ممبران کو جنکی زبان عام طور پر بہت بے تکلف ہے، اشتعال پیدا ہوا، دوران تقریر میں کسی شخص نے ایک گوشہ سے کوئی آواز کسا، اس پر ارل ونٹرٹن نے فرمایا کہ یہ حضرت جنہوں نے ابھی ٹوکا ہی کچھ قابل توجہ نہیں، بس پھر کیا تھا، قوم کے نمائندوں کے بادل گرجنے لگے۔ ملاحظہ ہو:-

"ارل ونٹرٹن نے کہا کہ میں اُن قلیل التعداد اشخاص کو قابل توجہ نہیں سمجھتا جو خواص وجہ سے اپنے اہل ملک کی نظروں میں حقیر ہیں کہ انہوں نے جنگ یورپ میں اپنے ہی ملک کو قابل الزام ٹھہرایا۔"

یہ کہنا تھا کہ ایک طوفان برپا ہوگیا۔

"او بدتمیز بندر!" مسٹر ہیکاک نے چیخ کر کہا،

سوشلسٹ کی صفوں سے "کاذب" اور "نامعقول" کی آوازیں ارل ونٹرٹن کا خیر مقدم کرنے لگیں اور تھوڑی دیر تک دارالعلوم میں کان پڑی آواز نہ آتی تھی۔ یہ لندن کے اخبار ایوننگ نیوز کا ذرا سا اقتباس ہے!

قیاس کن زگلستان من بہار مرا!

یہ تو بڑی میم صاحب کا حال ہے۔ ہندوستانی اسمبلی کی "مس بابا" کا تفنن ابھی چھوٹے چھوٹے چٹکلوں تک محدود ہے۔ اسمبلی کے گذشتہ اجلاسوں کے چند لطائف وظرائف ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں:-

"۔۔ مارچ ۱۹۳۰ء۔ بجٹ

مسٹر کیلکر وزیر ہند کی کونسل کے ممبران کے مشاغل کا یوں ذکر فرماتے ہیں:-

"چار بجے تک کیسے گذرے!"

گیارہ سے جب بارہ تک پہنچ گئے تو بلائے آئے" (دفتر میں)

بارہ سے تا ایک ــــ آئے بھی اور ناحق پچھتائے"

ایک سے دو تک ــــ کرنا دھرنا کچھ نہیں پھر کیا کیا جائے"

بیٹھے بیٹھے دو سے تین تک کیونکر جی بہلائے"

چار بجے تک کیسے گذرے!"

(مترجم عروض سے ناواقف ہے۔ معاف فرمایا جائے)

"وزیر ہند کی کونسل میں کام کرنے کا طریقہ یہ ہے اور لوگ ہیں جو ہمارے کے بہترین نظم ونسق کے ذمہ دار ہیں"

۲۴ر فروری سنہ۳۰ء۔ ریلوے بجٹ

مسٹر ایشور سرن کھڑے ہوتے ہیں۔

پریسیڈنٹ: کیا آنریبل ممبر تقریر کرنا چاہتے ہیں؟

منشی ایشور سرن: معلوم تو کچھ ایسا ہی ہوتا ہے جناب!

پریسیڈنٹ: مجھے امید ہے کہ اس مباحثہ میں اب گرمی پیدا نہ کیجئے گا۔ منشی ایشور سرن صاحب۔

منشی ایشور سرن: جناب! مجھے تعجب ہے کہ مجھ جیسے صلح پسند، غیر مضرت رساں، سرد مزاج اور ٹھنڈا دماغ رکھنے والے شخص کو کسی طرح انتہائی غیر سنجیدگی کی حالت میں بھی گرمی پیدا کرنے کا گناہگار سمجھا جائے

۲۲ر فروری سنہ۳۰ء۔ ریلوے بجٹ

مسٹر آنے: جناب والا! عام طور پر میں اس بحث میں کوئی حصہ نہ لیتا لیکن چونکہ میرے آنریبل دوست مسٹر داس نے بار بار کمیٹی کے سرکاری وغیر سرکاری ممبروں کا ذکر کیا تھا اور اب وہ تمام وقت سوتے رہے ہیں، اس لئے مجھے اس بحث میں حصہ لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کم از کم مسٹر داس کی تقریر کے دوران میں اس مجلس کو معلوم ہے کہ میں ذرا نہیں سویا!

مسٹر جناح:۔ اب اس وقت تو آپ ضرور جاگ رہے ہیں!

مسٹر آنے: میں تو برابر جاگتا رہا، یہی تو مجھے کہنا ہے۔

۱۹ر فروری سنہ۳۰ء۔ ریلوے بجٹ

پریسیڈنٹ: آنریبل ممبر کے لئے صرف ۵ منٹ اور باقی ہیں۔ اس کے بعد تقریر کرنے کا کوئی

موقعہ نہ ملے گا۔

مسٹر غزنوی: جناب! آج نہیں، بلکہ جب میں تخفیف کی تجویز پیش کروں گا۔ اب میں اپنی تقریر پانچ منٹ کے اندر ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔ مگر پہلے اس سے کہ میں آگے کچھ کہوں مجھے اس امر کا اعتراف کرنا ہے کہ میری مشکل بہت بڑی ہے اور وہ مشکل میرے آنریبل دوست ممبر تجارت کے مشکلات سے ملتی جلتی ہے جو ایک ہی وقت میں دو سگی بہنوں سے ازدواجی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں!

سر پرشوتم داس ٹھاکرداس: کیا دو سگی بہنوں سے شادی کرنے کا ارادہ ہے؟

مسٹر غزنوی: یہ دو سگی بہنیں "سرکاری ریلوے" اور "کمپنی کی ریلوے" ہیں۔ مگر سر جارج کو بتا دینا چاہئے کہ اُس کی بہنوں سے بہ یک وقت شادی کرنا روا نہیں ہے۔

مسٹر بی داس: مگر ابھی شادی ہوئی تو نہیں۔

ایک آنریبل ممبر:۔ شادی کب ہوئی، ابھی تو شادی کے لئے تعلقات پیدا کئے جا رہے ہیں۔

مولوی محمد یعقوب: ایک اور سارداایکٹ کیوں نہ پاس کر لیجئے!

مسٹر غزنوی: مگر آنریبل ممبر تجارت دونوں مجبوریوں سے یکساں محبت نہیں کر سکتے یہی تو دشواری ہے۔

مسٹر دیاساگر: میرا خیال تھا کہ ممبر تجارت بجٹ میں بہت قابل غور اعداد و بیانات پیش کرینگے اور مجھے امید تھی کہ ہم کو کچھ تخفیف اور آسانی کرایہ وغیرہ میں دیجائے گی۔ لیکن پہاڑ کو دردِ زہ ہوا اور اس میں سے صرف ایک چوہا تولد ہوا۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ وہ اب ایک ایسی اسکیم پیش کرنے کی بہت کوشش کر رہے ہیں جس سے ریلوے کے ادنیٰ ملازمین کی حالت بہتر ہو سکے۔ مجھے امید ہے کہ اس معاملہ میں ان کی کوشش اتنی مایوس کن نہ ہوگی جتنی کہ بجٹ میں ہے۔

مولوی محمد یعقوب : اب کی دفعہ بجائے چوہے کے ایک ہاتھی تولد ہوگا!

---

۱۸ فروری ۔ بجٹ

پریسیڈنٹ : (منشی ایشور سرن سے مخاطب ہوکر) اب اس سوال کے اٹھانے سے کیا فائدہ ہے، یہ تو گویا مردہ گھوڑے کے چابک مارنا ہے۔

مسٹر گیا پرشاد سنگھ : جناب نے صحیح فرمایا۔ معاملہ ختم ہوچکا ہے اور اب یہ گویا مردہ گھوڑے کے چابک مارنا ہے۔ مگر اس مجلس کو احتجاج ضرور کرنا چاہیے اور اس مردہ گھوڑے کے کفن دفن کے لئے ایک پیسہ نہ دینا چاہیے۔

---

۱۱ مارچ ۔ بجٹ

نواب سر عبدالقیوم : کیا صوبہ سرحد کی ہر حالت ہمیشہ قائم رہے گی۔ اگر یہی صورت ہے کہ ہم وہیں رکھے جائیں گے جہاں ہیں تو پھر میرے لئے . . . . . .

مسٹر جناح : سوائے نافرمانی قانون اور کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔

سر عبدالقیوم : کوئی چارہ کار نہ ہوگا سوائے اس کے کہ میں اپنی قسمت پر لعنت بھیجوں اور جو کچھ فیصلہ ہو اس پر صبر کروں۔

سید محمد مرتضیٰ : ہم جانتے ہیں کہ صوبہ سرحدی کے لوگ گورنمنٹ سے کتنی ہمدردی کی توقع کرسکتے ہیں۔ فارسی میں ایک مثل ہے کہ

چچہ زدی چچہ زدی حلوا کو ؟

گورنمنٹ کب تب ہم کو ٹالے گی۔

۱۲ر مارچ ۱۹۳۰ء - بجٹ - آمدنی پر ٹیکس

سر پرشوتم داس ٹھاکر داس : میں محسوس کرتا ہوں کہ اس تحریک پر روز دنیا ہمارے لئے بہت غیر ذمہ دارانہ ہوگا

مسٹر اچاریہ : ہرگز نہیں!

سر پرشوتم داس : نہ معلوم کس نے "نہیں" کہا ؟

مسٹر اچاریا : میں نے کہا -

سر پرشوتم داس : مجھے کچھ بھی افسوس نہیں ہے جناب کہ مسٹر اچاریا نے "نہیں" کہا - اس لئے کہ جنکو وہ "سرمایہ دار" کے نام سے یاد کرتے ہیں ، وہی ممکن ہے انکم ٹیکس سے بچ جائیں - مجھے اُنکے نہیں کہنے کی زیادہ پروا نہیں مسٹر اچاریا نے سوال کیا ہے کہ کیا آسمان پھٹ پڑے گا اگر ۱۲ فیصدی کی بجٹ میں کردی گئی - مسٹر اچاریا کے خیال میں آسمان تو اس وقت پھٹنے والا تھا جب سارداایل پاس ہوا تھا ! میں مسٹر اچاریا کو اُن کی منطق کے اندر چھوڑتا ہوں -

مسٹر اچاریا - آپ کی منطق بہت غلط ہے -

سر پرشوتم داس : آپ کی منطق سے کچھ بہتر ہے !

مسٹر اچاریا : میں آپ سے کچھ بہتر منطق کا متوقع تھا -

سر پرشوتم داس : اگر آپ میری تقریر میں اس طرح دخل دیں گے تو آپ مجھ سے اسی قسم کی بات کی توقع کرسکتے جس قسم کے آپ مستحق ہیں !

۱۲ر فروری ۱۹۳۰ء - مسودہ قانون ازدواج بین الاقوامی

ڈاکٹر سہروردی : جب تک سرہری سنگھ گور اپنی کوشش کو اس حد تک محدود رکھینگے کہ اُن کا قریبہ آئندہ نسلوں کے لئے منو کی برابر ہوجائے اُس وقت تک ہمیں کوئی اعتراض نہیں -

مگر انکا حوصلہ اب اس سے بھی بہت زیادہ ہے۔ یورپ سے تازہ وہم آکر اور نئے نئے خیالات لاکر جن کا ذکر منشی ایشور سرن نے کیا ہے، اور یورپ میں میرے اور منشی ایشور سرن کے ساتھ اور کبھی کبھی تنہا آوارہ گردی کرنے کے بعد وہ شاید اب جدید خیالات کے زیر اثر ہیں اور شاید وہ اُس دن کو دیکھ رہے ہیں جب ازدواج اور تعداد ازدواج اور اس قسم کے تمام مسائل آزادانہ محبت اور آزادانہ خیالات کے نئے اصولوں سے حل ہوجائیں گے۔

مولوی محمد یعقوب: سوال یہ ہے کہ آپ لندن اور پیرس کی سڑکوں پر کن اوقات میں آوارہ گردی کرتے تھے۔

ڈاکٹر سہروردی: میرے دوست ڈپٹی پریسیڈنٹ کو ابھی انگلینڈ یا فرانس جانے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ وہاں وقت کا کوئی امتیاز نہیں۔ عیش و عشرت اور روز روشن کی اُس دنیا میں ہر وقت شام کا وقت ہے۔

۲۳ر جنوری سنہ ۳۰ء۔ قانون جواز شادی آریہ سماج

مسٹر غزنوی: آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ آریہ سماجی اس قسم کے قانون کی خواہش رکھتے ہیں؟

منشی ایشور سرن: یہ ایک معقول سوال ہے۔ خیر غنیمت ہے کہ مسٹر غزنوی نے ایک معقول سوال تو کیا!

پنڈت مدن موہن مالویہ: یہ ایک بہت وسیع قانون ہے اور اس پر بہت زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

سر عبدالقیوم: تو آپ کچھ دنوں کے لئے کسی آشرم میں چلے جائیے

۲۲ر جنوری ۱۹۳۰ء - دودھ دینے والے جانوروں کے متعلق ریزولیوشن

پنڈت مالوی : سب سے پہلے میں اس اسمبلی کے ہر ممبر سے خواہ اُس کا عقیدہ کچھ ہو اور وہ کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو - یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس کی رائے میں تمام انسان گائے کے کس قدر رہین منت ہیں، میرے خیال میں اکثر ممبران، اگر سب نہیں، گائے کا دودھ صبح شام چائے کے ساتھ استعمال کرتے ہیں .....

ڈاکٹر سہروردی : مہاتما گاندھی تو بکری کا دودھ پیتے ہیں!

مسٹر کلکر : بعض اصحاب کہتے ہیں کہ تمام فوج میں ہندوستانیوں کے عمل دخل کے لئے سو دو برس کی ضرورت ہے

ایک ممبر : یہ اندازہ کس قدر معتدل ہے!

مسٹر کلکر : واقعی بہت معتدل ہے! یہ کہنا کہ ہندوستان کی فوج ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دو سو تین سو برس بعد آئے گی - لیکن اگر دو سو برس بعد ایسا ہوگا تو میں اس وقت برطانوی حکومت سے کہوں گا .....

ایک ممبر : برطانوی حکومت اتنے عرصہ بعد ہو گی کہاں!

۱۸ر مارچ ۱۹۳۰ء - فوج میں ہندوستانیوں کا داخلہ

مسٹر کلکر :- ایک دن لائبریری میں مجھے ایک لال کتاب ملی جس میں سیکڑوں صفحات پر اُن ہندوستانی سپاہیوں کے نام تھے جنہوں نے جنگ عظیم میں وی - سی - کا اعزاز حاصل کیا تھا - کسی کسی وقت پر میرا یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کتاب کو ہر اُس شخص کے سر پر پھینک کر ماروں جو یہ کہے کہ ہندوستانی افسری کے لئے نایاب ہیں - لیکن میں اس موضوع کو اپنے آنریبل دوست ڈاکٹر مونجے کے لئے چھوڑتا ہوں جو زیادہ قابلیت سے اس موضوع

پر بحث کر سکیں گے ۔۔۔۔

ایک آنریبل ممبر: لال کتاب بھی اُن ہی کو دیدیجئے!

مسٹر کلکر: میں آپ کو وہ کتاب بھی دیدوں گا وہ غالباً مجھ سے زیادہ قوت سے اس کو پھینک کر مار سکیں گے۔

یہ لطائف وظرائف گو وزن میں زیادہ نہیں مگر مقدار میں کافی ہیں اگر کسی کو اُنکے جمع کرنیکا شوق ہو۔ خالی وقت کی تفریح بری نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ اُن احمقانہ باتوں کے بھی کچھ نمونے جمع کر لئے جائیں جو اسمبلی کے اجلاسوں میں ملک کے نمائندوں کی زبان سے ادا ہوتی ہیں تو اسمبلی کے نفسیات کا یہ ایک اچھا "مطالعہ" ہوگا۔

(باقی)

جدید علم کلام

دہلی کے موقر رسالہ کامیابی بابتہ ماہ نومبر ۲۹ء میں سب سے پہلے "حق پسند" صاحب کا لکھا ہوا مضمون شائع ہوا جس کا لب لباب یہ ہے کہ ماضی میں مذہب کی ضرورت تھی یا نہ تھی مگر زمانہ موجودہ میں ترقی علوم کے ساتھ عقل سلیم کی ہدایت انسان کی ترقی مدارج کے لئے کافی ہے۔ اور یا تو ہم میں مذہب کی ہدایات سے منتفع ہونیکی صلاحیت نہیں رہی ہے۔ اور یا مذہب ہمارے لئے کافی نہیں ہے۔ چند صاحبوں نے اس مضمون کے مدلل جواب بھی لکھے ہیں مگر میں نہ ان مضامین میں کچھ اضافہ کرنا چاہتا ہوں اور نہ اس بحث کو بلاوجہ طول دینا چاہتا ہوں۔ بلکہ گذشتہ چالیس برس کا جو ہم انگریزی خوانوں کے خیالات کا مجھکو ذاتی تجربہ ہے اور جس قسم کے اعتراضات میں نے اپنے انگلستان، جاپان برہما اور ہندوستان کے تبلیغی سفروں میں تعلیم یافتہ مسلمانوں سے سنے ہیں ان سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں سے اکثر کے دل میں دیانتداری کے ساتھ اسلام کی تعلیم کے متعلق اہم شکوک ہیں۔ جب سرسید مرحوم اور انکی نیک نیت پارٹی نے یورپ کی فلسفیانہ رو کا مقابلہ کرکے اسلام کو حشو و زوائد سے پاک کرنے۔ خوش عقیدتی کے خلاف عقل سے معتقدات کی تاویل کرنے اور گویا ایک "جدید علم کلام" تیار کرنیکی کوشش بلیغ شروع کی تو علماء اور پرانے خیال کے تعلیم یافتہ لوگوں کی طرف سے اعتراضات کی بھرمار شروع ہوگئی۔ اسی قسم کا کام مصر میں مولوی عبدہٗ اور انکے رفقا نے بھی کیا۔ مگر جہانتک مجھے معلوم ہے کوئی مستقل کتاب ہندوستان یا مصر یا اور کسی اسلامی ملک میں ایسی جامع اور مانع نہیں لکھی گئی جس سے قدیم علم کلام میں معتدبہ اضافہ ہو۔ اور اگر کوئی شخص اس کتاب کو غور سے پڑھ لے تو معاد اور معاش کے متعلق جو ہدایتیں یا معتقدات بادی النظر میں خلاف عقل معلوم ہوتی ہیں انکا قلع قمع ہو جائے۔ سید صاحب مرحوم اور ان کی پارٹی نے زیادہ تر حضرت

امام غزالی رح اور حضرت شاہ ولی اللہ شاہ رح کی قابل قدر تصانیف سے جا بجا تمسک اختیار کیا اور عقل اور نقل میں تطابق پیدا کرنیکی کوشش کی۔ یہ سعی مشکور ہوئی۔ اور ہم "نیچریوں" میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اصل اصول اسلام سے واقف اور اسکا دل سے احترام کرنے والے ہیں۔ مگر آخری تدوین فقہ کے ہرجزو کل کو نہیں مانتے۔ اگر یورپ وہیں رہ جاتا جہاں وہ سید صاحب کے زمانے میں تھا تو اُن کی پارٹی کا پیدا کردہ لٹریچر دائماً ابداً ہمارے لئے دلیل ہدایت رہتا۔ مگر یورپ میں مادی علوم یعنی سائنس کی ترقی مسلہ ارتقا اور جدید نفسیات کی تحقیق و تدقیق نے بے شمار مسائل ایسے پیدا کر دئے ہیں جن کے ساتھ اسلام کی تعلیم کا تطابق یا انکی تردید ضروری ہو گئی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا میں نے اپنے رسالہ اتمام قلیل اسلام میں عرض کیا تھا کہ قدیم و جدید علم کلام سے قدم آگے بڑھا کر ایک جدید ترین علم کلام مرتب کیا جائے جس میں حسب ذیل امور کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔

(الف) عام مذہبی نقطہ نظر میں ترقی اور تبدیلی یعنی ایڈیلزم کے بجائے ریشنیلزم کا دخل وسعت نظر وغیرہ (ب) فلسفہ اور سائنس میں معتد بہ جدید ترقیاں۔ مسلہ ارتقا تنازع للبقا سعی للحیات۔ (ج) جدید علم النفس اور اس کے اصول تحت ادراک۔ ادراک، فوق الادراک وغیرہ اور قدیم فلسفہ کے بعض مسلمہ کلیوں مثل قوت ارادی تابع روح ہے۔ فوق الادراکیات کا تعلق فلسفہ، الہیات اور عامہ روحانیات سے ہے۔ وغیرہ وغیرہ کو توڑ کر ان سب کو انسان کی نارمل دماغی حیوانگاہ کے حدود میں تسلیم کرنا (د) جمالیات۔ آرٹس (میوزک۔ رقص۔ نقاشی۔ بت تراشی۔ ادبیات وغیرہ کو ترقی یافتہ زندگی کا جزو لاینفک تسلیم کرنا۔

(ہ) مطالعہ مذاہب دیگر (Comparative study of Religions) کی ضرورت کو تسلیم کرکے جملہ مذاہب عالم میں سے وہ باتیں انتخاب کرنا جو بطور قدر مشترک انسانوں کے لئے مفید ہیں (ز) فلسفہ نظریات پر مشاہدات کو بین ترجیح دینا۔ (ح) تصوف کو قابل توجہ تسلیم کرنا۔

(۴) جدید علم کلام کیونکر مرتب ہو۔

(الف) قدما (تا امام رازی۔ ابن تیمیہ۔ امام غزالی۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح کے

اصولوں پر متذکرہ بالا جدید تحقیقات کی روشنی میں محققانہ اور مجددانہ تنقید کرنا۔
(ب) سرسید، مولوی عبدہٗ، مولوی شبلی۔ نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی وغیرہ کی تحقیقات پر بشرح ایضاً تنقید کرنا (ج) تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف پر بشرح ایضاً تنقید کرنا (د) انتہائی دیانتداری کے ساتھ ان جملہ تحقیقات کا عطر کھینچ کر ایک آزاد جدید ترین علم کلام مرتب کرنا اور اسپر حقیقی اسلام کو (رواجی اسلام کو نہیں) کہنا

جس قسم کے شکوک حق پسند صاحب کے مضمون میں درج ہیں۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ اس قسم کے شکوک تعلیم یافتہ طبقہ کی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اور قطعاً ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جائیگی اور موجودہ شکوک سے بڑھکر اور نئے اہم شکوک بھی پیدا ہوں گے۔ اسکا علاج میری رائے میں صرف جستہ جستہ مضامین رسالوں میں شائع کرنے سے نہ ہوگا۔ بلکہ جلد یا بدیر ہم کو ایک جدید ترین علم کلام تیار کرنا پڑے گا۔ جیسا میں نے اپنے رسالہ قال قلیل اسلام میں وضاحت کے ساتھ عرض کیا ہے۔ پہلے اس امر کی تنقیح کر لیجائے کہ تعلیم اسلام کا وہ حصہ جس سے کم کرنے میں مواخذہ اُخروی لازم آتا ہے کیا ہے اور صرف اُسے فرض و واجب قرار دیا جائے۔ اس کے بعد جتنا گڑ ڈالو اتنا میٹھا ہوگا روے باقی سب تعلیم کو بالکل علٰحدہ کر کے دکھایا جائے اور اس دوسرے حصہ کو مسنون مستحب اور اختیاری قرار دیا جائے۔ نیز اس اختیاری تعلیم کو پبلک میں اظہار اور بحث و مباحثہ کا کفیل نہ بنایا جائے۔ ہمارا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ سنت کو جو تعلیم اسلام کا نہایت ممتاز عنصر ہے پس پشت ڈالا جائے۔ یا موجودہ نظام کو جس میں فرض واجب سنت مستحب سب شامل ہیں درہم برہم کر دیا جائے۔ بلکہ ہمارا منشا صرف یہ ہے کہ فرض و واجب۔ اور مسنون و مستحب میں حد فاصل قرار دیجائے۔ اور امت محمدیہ کے موجودہ انتشار کو مدنظر رکھکر مسنون و مستحب کو قابل بحث مباحثہ نہ قرار دیا جائے۔ اسلام کی تعلیم میں بخوالے ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وّ فی الآخرۃ حسنۃ۔ وقنا عذاب النار۔ نجات کی دو قسمیں قرار پاتی ہیں ایک نجات دنیوی اور دوسری نجات اخروی۔ ان دونوں کو ہم نے اپنے رسالہ قال قلیل

میں حسب ذیل الفاظ میں عرض کیا ہے۔

نجات دنیوی۔ کا قریب قریب مفہوم یہ ہے کہ جس زمانہ میں اقوام متمدنہ کا باعتبار کثرت جو معیار تہذیب، تمدن، تعلیم، تربیت، صحت وغیرہ کا ہو اس معیار پر کم و بیش پورا اترنا۔ ہر مذہب نے اپنے وقت میں ان باتوں کا معیار مقرر کیا ہے۔ مگر کسی مذہب کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ یہ حکم دے کہ میرا مقرر کردہ معیار ان شقوں میں ابدالآباد تک بلا تغیر تبدل کے جوں کا توں قائم رہے۔ جن لوگوں نے خواہ وہ کسی مذہب کے پیرو کیوں نہ ہوں اپنی نیک نیتی سے مذہب کے ذمہ بار ڈالا ہے۔ ان کو دو باتوں کی غلط فہمی ہوئی ہے اوّلاً یہ کہ خداوند تعالیٰ نے دنیا اور انسان کو ترقی کن اور ترقی پذیر نہیں بنایا اور گویا جانوروں کی طرح ایک حالت پر قائم رہنے والا بنایا ہے۔ یہ بات بداہۃً غلط ہے۔ اس لئے کوئی مذہب اس بات کا دعویٰ استحقاقاً نہیں کر سکتا کہ نجات دنیوی کے بارہ میں میرے بنائے ہوئے اور بتائے ہوئے قواعد تا قیام قیامت بلا کم و کاست جاری رہیں گے۔ ثانیاً یہ کہ انسان کم و بیش ایک غیر ذمہ دار مخلوق ہے۔ انسان کا اشرف المخلوقات ہونا اس کو اعلیٰ درجہ کی ذمہ داریاں بھی تفویض کرتا ہے۔ اور کوئی تعلیم ربانی اور روحانی کہلائے جانے کی مستحق نہیں جو انسان کی واجب ذمہ داریوں کے بوجھ کو ہلکا کر دے۔ ایسا کرنا انسان کے ساتھ بھلائی کرنا نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے ان قویٰ کو شل اور رفتہ رفتہ بیکار کرنا ہوگا۔ جن کے صحیح طور پر استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ نے ان ذمہ داریوں کو باحسن وجوہ پورا کرنا فطرتاً وضع کیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے کسی شخص کو شروع ہی سے بلا اشد طبی ضرورت کے ہضم شدہ (ڈائی جسٹڈ) خوراکیں دیجائیں اگر ایسا کیا جائے تو اسکے معدہ کی قابلیت ہضم زائل ہو جائیگی قرآن کی فطری تعلیم لیس للانسان الا ما سعیٰ نے جدوجہد کی دوڑ انسان پر فرض کر دی اور یہ دوڑ انسان اسی وقت جیت سکیگا جس وقت وہ اپنے دل و دماغ۔ وقت صحت اور مال سے صحیح طور پر کام لیکر اپنے زمانے کی اقوام متمدنہ کے اوسط معیار نجات دنیوی کو پورا کرے، یہ مراد نہیں ہے کہ ہر زمانہ میں بالکل جداگانہ قواعد بنائے جائیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ دنیا کی روز افزوں ترقی سے غافل

نہ ہونا چاہیے بلکہ بفحوائے سارعوا الی الخیرات اس میں پورا حصہ لینا چاہیے۔
نجات اخروی، کے دو حصے ہیں، ایک اُن حقایق کا یقین کرنا (بلکہ ممکن ہو تو علم الیقین کو عین الیقین کے درجہ تک پہنچانا) جس سے مرنے کے بعد دوچار ہونا ہے۔ اصطلاح مذہب میں انکو عقائد کہتے ہیں۔ دوسرے اعمال کے ذریعہ سے وہ عام صلاحیت پیدا کرنا جس سے مادی اور روحانی دنیا میں ربط پیدا ہو سکے، انہیں عبادات کہتے ہیں، ان دونوں کو پورا کرنیکے بعد دنیا کو انسانوں کے لئے جائے راحت بنانے کے لئے ایک تیسری انجمن کی ضرورت ہے جسے عرف عام میں اخلاق کہتے ہیں، انہیں تینوں چیزوں کے مجموعہ کا نام اسلام ہے (ملاحظہ ہو صفحہ (۱) دیباچہ الکلام حصہ دوم مرتبہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم)

ظاہر ہے کہ نجات دنیوی کی تعلیم کا بیشتر حصہ عقل سے متعلق ہے اور زمانہ کا رنگ دیکھکر علمائے دین کو اپنے میں اس قدر وسعت نظری پیدا کرنی چاہیئے کہ اس حصہ کو عقل والوں پر چھوڑ دیں یعنی اگر عقل والے اس میں تصرف کریں تو اس سے نہ چونکیں۔ لباس وضع قطع اور بہت سی ایسی ہی باتیں غالباً اسی شق کے تحت میں آئیں گی۔ اسپر صبر کر لیا جائے۔ نجات اخروی کی مد میں بعد عقائد کے عبادات کا درجہ ہے۔ عبادات کی بھی ممیز تقسیم کر دیجائے۔ ایک لازمی عبادات۔ دوسرے متعدی عبادات۔ لازمی عبادات جیسے نماز روزہ اور متعدی عبادات جیسے مدارس اور یتیم خانے وغیرہ قائم کرنے۔ نکاح بیوگان کا انتظام کرنا وغیرہ وغیرہ۔ انکے متعلق یہ اصول دل و جان سے تسلیم کر لینا چاہیئے کہ لازمی عبادات متعدی عبادات سے مستغنی نہیں کر سکتیں اور دونو لازم و ملزوم ہیں۔ متعدی عبادات میں اہل عقل کے مشوروں کو تسلیم کرنا نہایت ضروری ہے۔ رہیں لازمی عبادات ان میں جو طویل نظام قائم ہے اس پر علماء کو اجتہادی نظر ڈالنی ہوگی۔ دنیا کے اور مذہبوں میں بھی عبادتیں ہیں اور مذاہب عالم یا کم از کم دنیا کے بڑے بڑے اور مشہور مذاہب کی عبادات کو سامنے رکھکر طے کیا جائے کہ اسلام کی تعلیم کا اقل اور اہل حصہ کیا ہے۔ اور اسی پر زور دینا چاہیئے۔ یہ اہم کام بڑے جید اجتہاد کا محتاج ہے۔ اس کی تفصیل ہم اسلئے

نہیں کرتے کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ پبلک میں تفصیلات پر بحث و مباحثہ شروع ہو جائے اور امت محمدیہ کے انتشار میں اضافہ ہو۔ ایسے مسائل پر بھی غور کرنا ہے۔ جو اتفاق و اتحاد کی اہم مفید غایت کو مدنظر رکھکر اسلام میں داخل عبادت قرار دئے گئے ہیں۔ مثلاً نماز باجماعت۔ محلہ کی مسجدوں میں نماز باجماعت میں زیادہ تر غریب اور بے پڑھے لکھے مسلمان شریک ہوتے ہیں اور امیر اور تعلیم یافتہ لوگ نہیں ہوتے۔ الا ماشاء اللہ۔ اس کی وجہ یہ نہیں معلوم ہوتی کہ آخرالذکر فرقہ نماز باجماعت کا منکر ہے۔ بلکہ زیادہ تر اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے سے کم درجہ کے لوگوں کے ساتھ برابر کا میل جول رکھنا دل میں پسند نہیں کرتے خواہ زبان سے اقرار نہ کریں۔ یا یہ کہ انکے مشاغل اس کے مانع آتے ہیں۔ اس پر اور مثل اس کے بہت سی اور باتوں پر ٹھنڈے دل سے اجتہاداً غور کرنا ہے۔

۴۔ استادی مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

"علم الکلام حقیقت میں جس چیز کا نام ہے وہ عقائد کا اثبات ہے اور علم الکلام کی تاریخ میں یہی چیز جان سخن ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کے متعلق قدما کی تصنیفات ناپید ہیں اور متاخرین کا اگرچہ دفتر بے پایاں موجود ہے لیکن وہ بالکل اس مصرع کے مصداق ہے۔ ع۔ شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا" (علم الکلام حصہ اول صفحہ ۱۴)

قدما کی تصنیفات ناپید ہو جانے کا اور متاخرین کے مشکل اور پیچیدہ دفتر بے پایاں کے موجود ہونیکا تو ہر اہل دل کو افسوس ہوگا۔ مگر ان دونوں باتوں سے ایک یہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے کہ علم کلام کی جدید تدوین بالکل از سر نو اور جدید اصول کے موافق شروع کیجا سکتی ہے۔ عقائد میں سب سے اہم اور گویا سنگ بنیاد توحید باری تعالیٰ ہے۔ اب قدیم علم کلام اور جدید علم کلام میں بھی بحثیں ہو سکتی ہیں کہ خدا کی وحدانیت احادی ہے یا نہیں۔ صفات باری تعالیٰ ذات کا عین ہیں یا غیر۔ روح فانی ہے یا باقی۔ عالم قدیم ہے یا حادث۔ دنیا ختم ہوگی

یا اسی طرح چلی جائیگی۔ انسان کو مرنے کے بعد کیا پیش آئے گا۔ حشر و نشر سمجھ میں آنے کے قابل ہو یا نہیں۔ یہ اور مثل انکے بے شمار مسائل کے مجموعے کا نام ہمارا علم کلام ہے۔ فلسفہ تو ہمیشہ سے تھا سولہویں اور سترہویں صدی میں رومن کیتھولک مذہب کے زوال اور پروٹسٹنٹ مذہب کے عروج نے یورپ میں یونانیوں کے علوم کا احیا کیا۔ اور سائنس کی ترقی شروع ہوئی۔ ہوتے ہوتے یہانتک ہوا کہ دو نظرے جید اور مستقل دنیا کے سامنے آگئے۔ ایک نظریہ ارتقا کا اور دوسرا قدامت عالم جو اسی کا ایک جزو ہے۔ لیپلاپلی جتنی جی چاہے کر لیجئے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں مسائل یا ان دونوں کو ملا لیجئے تو اس بڑے مسئلے ارتقا نے مذاہب عالم کے اکثر معتقدات پر کاری ضرب لگائی۔ مذہب کو بیدار کرنے کے لئے صرف یہی کافی تھا۔ مگر جدید نفسیات نے اس پر مرے پر سو درّے کا کام کیا۔ ان دونوں پر علٰحدہ علٰحدہ بحث کرنی اس مضمون کی وسعت سے باہر ہے۔ مسئلہ ارتقا نے خود فطرت میں ترقی کے اجزا شامل ہونے کا دعوے کیا۔ اور مسئلہ جدید نفسیات نے دماغ انسانی کو وہ درجہ دیا جس نے روحانی دست نگری کو جھوجرا کر دیا۔ تقدیر و توکل جیسے اہم مسائل اسلامیہ میں ان دونوں مسائل نے بہت کچھ دخل اندازی کی۔ اور جس جدید علم کلام کے تیار کرنیکی ہم رائے دے رہے ہیں اس میں سب سے پہلے انہی اہم مسائل پر بحث ہونی چاہئے۔ تقدیر اور توکل پر حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی لطیف بحثوں کے موجود ہوتے ہوئے اور کیا لکھا جا سکتا ہے۔ مگر ان کی بحثوں کا جو اصل اصول ہے اسی پر ارتقا اور نفسیات حملہ کرتی ہیں۔ اس کے بعد عبادات کا نمبر آتا ہے۔ مادی اور دماغی ترقی تو ارتقا۔ اور نفسیات والوں کو تسلیم ہے۔ مگر عبادات کا طویل نظام ان کی تعلیم کی روشنی میں اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر بڑی دقت یہ ہے کہ بعض عبادات فرض ہیں۔ اور ان کی جزا اور سزا عالم آخرت سے متعلق ہے۔ یہ حکمائے یورپ کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ارکان اسلام کے محاسن پر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات مثل "حجۃ اللہ البالغہ" سے بڑھ کر اور کیا کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ مگر انکی استدلالات کا اصل اصول بھی خالص روحانی بنیاد رکھتا ہے۔ مثلاً ملائے اعلیٰ وغیرہ

ارتقاء اور نفسیات سرے ہی سے ان باتوں کا انکار کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں جدید علم کلام میں تو کچھ ایسا ہونا چاہئے کہ ارتقاء اور نفسیات دونوں میں وحدانیت، رسالت، بقائے روح اصح، حالات حشر و نشر وغیرہ کو حلول کر دیا جائے۔ مثلاً اقرار وجود باری تعالیٰ کے ساتھ اس عقیدے کو ملا لیا جائے کہ عادت اللہ یہ ہے کہ انسانی عقل کے غیر مکمل اور ناکافی ہونے کی وجہ سے وہ اپنی مرضی اپنے برگزیدہ بندوں یعنی انبیاء علیہ السلام پر ظاہر کرتا ہے۔ اور انکو دنیا کا ہادی اور پیشوا قرار دیتا ہے۔ مادہ اس معنی کر کے قدیم ہو سکتا ہے کہ ازل سے ابد تک یعنی جب سے اس کے حکم سے پیدا کیا گیا اور جب تک اسی کے حکم سے فنا ہوگا۔ اپنے میں خدا ہی کی عطا کی ہوئی ارتقائی فطرت رکھتا ہے۔ انسانوں کا فرض ہے کہ ارتقائی منازل کی چھان بین رکھیں۔ اور ان سے تمتع حاصل کریں۔ "روح" مادے کی طرح سے عالم خلق کی شے تو ہے نہیں اسی لئے اسکا صحیح علم عقل انسانی سے ماورا ہے۔ مگر دماغ انسانی نفسیات کے اصول مثل تحت الادراک ادراک۔ فوق الادراک کے ذریعہ سے روح کے متصرف ہونے اور اس کی قوتوں کا پتہ دیتا ہے یہ بحث یا بحثیں بڑی فاضلانہ اور عالمانہ تحقیق و تدقیق کی محتاج ہیں۔ اور کتنی ہی مشکل سہی ان کو آج نہیں تو کل، کل نہیں پرسوں ضرور طے کرنا ہوگا۔ یہ اعتراض قائم ہو سکتا ہے کہ یورپ کے معدودے چند حکماء کی رائے سے یا اپنے ہاں کے اُن تعلیم یافتہ لوگوں سے جو انکے پیرو ہیں مرعوب ہو کر کیوں نظام اسلام درہم برہم کیا جائے۔ مگر ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام خدا کا آخری مذہب ہے۔ ساری دنیا کے لئے ہے۔ اور نجات دنیاوی اور اخروی کا واحد مکمل ذریعہ ہے تو اس میں خوش عقیدہ اور بدعقیدہ دونوں طبقوں کے لئے مکمل ہدایتیں ہونی چاہئیں۔ خوش عقیدہ لوگوں کے لئے تو نقل جیسا قرون اولیٰ میں تھا اب بھی ہے۔ اور ہمیشہ رہیگا۔ کافی ہے مگر جس طرح فلسفہ یونان کے بغداد میں ترجمے ہونیکے بعد عقلی شکوک لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوئے اور یہی خواہان اسلام کو علم کلام ایجاد کرنا پڑا۔ اسی طرح آج بھی تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ایک ترمیم شدہ علم کلام کی ضرورت ہے تعلیم یافتہ لوگ بجا طور پر قرآن پاک سے

زیادہ اور حدیث۔ اجماع امت اور قیاس مجتہد سے کم تمسک اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ان چاروں شقوں کے لئے علیحدہ علیحدہ چار جماعتیں موجود نہیں ہیں مگر تین جماعتیں ضرور موجود ہیں۔ ایک جماعت اہل قرآن کی ہے۔ دوسری اہل حدیث کی۔ تیسری اہل فقہ کی۔ اگر یہ جماعتیں اپنی اپنی جگہ پر اپنی مابہ الامتیاز شقوں میں اجتہاد کریں تو کچھ نہ کچھ دال دلیا ہو ہی جائے مگر نظر بر حالات موجودہ اس کی بہت کم توقع ہے۔ اس لئے مجبور ہو کر ان نظامات سے امید باندھنے کو جی چاہتا ہے جن میں دنیوی اور دینی دونوں تعلیموں کے مرکز موجود ہیں مثلاً جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد دکن۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی۔ دار المصنفین اعظم گڈھ وغیرہ۔ چونکہ یہ اہم اور متبرک کام نہ کسی ایک فرد کا ہے نہ کسی ایک جماعت کا بلکہ سب کے ملکر کرنیکا ہے۔ اس لئے خاکسار کی تجویز ہے کہ ان تینوں انسٹی ٹیوشنوں میں سے کسی ایک کو مرکز قرار دے کر اور باقی انسٹی ٹیوشنس انکے ساتھ اشتراک عمل کر کے اس کی بنیاد ڈالیں علاوہ قابل آدمیوں کی تنخواہوں کے عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ کی بے شمار قیمتی کتابیں بھی خریدنی پڑیں گی جس کے لئے ایک معقول رقم درکار ہوگی۔ یہ رقم بجائے والیان ملک رؤسائے عظام اور متمول تاجروں سے بطور چندہ کے طلب کرنے کے بہترین تدبیر یہ معلوم ہوتی ہے کہ زکوۃ میں سے یہ کل اخراجات اٹھائے جائیں۔

کو مکمل جانا ہے اس باب میں مابعد کی تمام تالیفیں تقلیدی ہیں نہ تحقیقی۔ ان مقلدین میں وہ مصنفین مستثنیٰ سمجھے جائیں جنہوں نے ۱۹۲۰ء کے بعد داد تحقیق دی ہو۔

راقم الحروف فی الحقیقت بہت محدود اور معمولی حرف شناسی کی قابلیت رکھتا ہے لیکن باوجود نااہلی، شوق تلاش سے مجبور ہے اہل نظر کے سامنے اپنی ناچیز و نامکمل خدمت پیش کرتے وقت اس کد و کاوش میں رہتا ہے کہ حتی الوسع حد تحقیق تک پہنچنا چاہیے۔ اس بحث تحقیق میں ابتداءً اپنی پسائی سے میں بھی طاق انعل بالنعل بنا رہا مگر دل میں یہ خلش برابر جاری رہی کہ جب صوبہ دکن میں اب سے پانسو برس پہلے کا سرمایہ نظم دست یاب ہوتا ہے تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بکثرت نہ سہی بہ قلت ہی نثر اردو کا کوئی نمونہ نہ ہو؟

بالآخر "جوئندہ یابندہ" یہ خلش دور ہوئی اور سلاطین بہمنیہ اور اُنکے بعد عادل شاہیوں کے عہدوں کی اتنی تالیفیں نظر افروز ہوئیں جن کے سامنے یہ قیاس وہم سے زیادہ وقیع نہیں رہا کہ نثر اردو کی پہلی تصنیف محمد شاہ کے عہد میں ہوئی ہے۔

اس سے پہلے بھی لکھ چکا ہوں، اور پھر لکھتا ہوں کہ اُن پرانی کتابوں کی زبانیں اس زمانے کے لئے یک قلم اجنبی ہیں لیکن جب کہ گیارہویں بارہویں صدی ہجری کا یہ شعر

بامن کی بیٹی ایک موری آنکھ موں پری گالی دیا و غصہ کیا اور دگر لری

نظم اردو کے ضمن میں لکھا جاتا ہے تو آٹھویں، نویں صدی ہجری کی یہ عبارت نثر:۔

"حضرت اپنی مبارک زبان سوں حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ تے کہے ہیں، کل اصحابان ہوں خاص اصحاب مجلس میں حاضر تھے" کس زبان سے موسوم کیجائے گی۔ البتہ ان کتابوں کی طرز نگارش کے متعلق اتنا کہدینا ضروری ہے کہ ابتدائی اردو نے اپنے زمانے کی مروجہ روش کو سامنے رکھا ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ طرز ظہوری اور طاہر وحید و بدر چاچ کے زمانوں میں فارسی استعارات و تلازمات کا مجموعہ رہی ہے۔ یک سطری مضمون کو نئی نئی تشبیہات اور رعایت لفظی کی پیچ در پیچ الجھنوں کے ساتھ ہزار سطروں میں ختم کیا جاتا تھا چونکہ عجمی تکلف و صناعت کو فارسی کی عذوبت

تاریخ نثر اُردو

کم و بیش پانچ سو چھ سو برس سے اردو زبان کا وجود پایا جا رہا ہے مگر اس طویل مدت میں پانچ چھ کتابیں بھی ایسی نہیں ملتیں جن کے مطالعہ سے صحیح علم ہو سکے کہ کس زمانے سے اس زبان کی تصنیفات کو بین الدفتین ہونے کا موقع ملا ہے۔ زمانہ حال میں دو چار کتابیں اس خصوص میں شائع ہوئی ہیں اور اُن میں تاریخی واقعات لکھے گئے ہیں جن سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ اُردو نے عہد بعہد کتنی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں لیکن ہر عہد کے ایسے مکمل و مفصل نمونے نہیں ملتے جن کو پڑھ کر ہر عہد کے اسالیب بیان کا پورا اندازہ ہو سکے۔ مثنوی بالاعنوان ایک ایسی تالیف کا نام ہے جس میں عام تصنیف و تالیف سے لے کر شہادہ تک کے ۱۴-۱۵ اصلی نمونے بشرح و بسط درج کئے گئے ہیں۔ اور وہ عنقریب شائع ہونیوالی ہے۔ ذیل کا انتخاب اسی مبسوط تالیف سے کیا گیا ہے۔

نثر اردو کی تصنیف کا آغاز

مسلمانوں کے اکثر تاریخی کارنامے انقلابات زمانہ کی دست برد سے دریا بُرد ہو گئے ہیں۔ یہ سنتے آتے ہیں کہ شاہجہاں کے عہد میں لشکری زبان کی مناسبت سے اردو بازار قائم ہوا تھا مگر اُسکا کوئی اثر کسی طرح کا کارنامہ زبانی روایت کو تاریخی روایت بنا تا نظر نہیں آتا۔ کاش عرب کے ایام جاہلیت کی یادداشت انساب حیوانی کی طرح اُس زمانے کے افغانی و ایرانی انسان بھی ایسی روایات زبانی کو علم سینہ بہ سینہ بنا کر محفوظ کرتے آتے تو شاید آج تلاش حالات میں اتنی دقت نہ ہوتی اس عدم اعتنا اور بے پروائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ فی زمانا ہم میں سے جس کسی ایک کی محدود تحقیقات، اولیت بنکے شمار میں آجاتی ہے وہی مختتم تحقیقات سمجھی جاتی ہے۔ وسائل تحقیقات کی قلت سمجھے یا اپنی غفلت، کہ اُردو نثر کا پہلا مرقع کتابی شمس العلما محمد حسین آزاد نے فضلی کے ترجمہ مجلس کو سمجھا ہے اور اب تک جس کسی نے اردو کی تاریخ لکھی ہے اسی تحقیق

اور فارسی دانوں کی الف دعاوت پنے مانوس بنا رکھا تھا اس لئے اس کی عام دل پسندی مسلمہ ہوگئی تھی اسکے مقابل میں لاوارث اُردو کی مال بیچارے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی اور پھر یہ کہ اسکا سودا سات پانچ کی زبانوں سے مل کر بارہ بات ہو رہا تھا۔ کس منہ سے فارسی کی ہمنوائی کرسکتی تھی۔ غرض کہ عہد قدیم کی اردو میں جا بجا تلازمات و رعایات، اور استعارات کی شان تو قریب قریب وہی ہے جو اُس وقت کی فارسی میں تھی لیکن نئی اور محدود وسعت و حالت کی وجہ سے کوئی دل کشی و دل آویزی نہیں پائی جاتی۔ اور یہ بات کچھ اُسی زمانے کے لئے مخصوص نہ تھی بلکہ وہ تالیف بھی جس کو تقلید آبحیات اردو نثر کی پہلی تالیف کہا جاتا ہے اس دلچسپی سے معرا ہے حتی کہ اُس کے بعد بھی فسانہ عجائب اور آرائش محفل کی طرح تمام سجع و مقفی تصنیفیں اس وقت نامطبوع سمجھی جاتی ہیں۔ بہرحال تاریخی حیثیت سے یہاں یہ دکھانا مقصود ہے کہ جس نثر اُردو کو اب تک محمد شاہی عہد کا کارنامہ سمجھا جاتا تھا وہ فی الحقیقۃ اس سے تین سو برس پہلے سلطان فیروز شاہ (دکنی) معاصر امیر تیمور (۷۹۲ھ) کے زمانے کی یادگار ہے۔

نظم اُردو کا وجود تصانیف نثر سے قبل دکن میں پایا جاتا ہے اس لئے یہ احتمال ممکن الوقوع ہوسکتا ہے کہ اُس زمانے میں نظم کے ساتھ نثر کی کتابیں بھی لکھی گئی ہوں اور انقلابات کے طوفاں نے انکو کہیں کا کہیں بہا دیا ہو۔ جس طرح مصنف کی زندگی کے ساتھ تصنیف کی ترمیم و اصلاح قائم رہتی ہے اسی طرح اگر ذوق تالیف کے ساتھ شوق تحقیق بھی جاری رہا تو ممکن ہے کہ آج ہم کو آب حیات کی تلاش کے بعد فضلی سے حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز اور شمس العشاق وغیرہم مقدم نظر آئے ہیں ہمارے بعد دوسروں کے سامنے اور نئی صورتیں رونما ہو جائیں۔

بایں ہمہ اس خصوص میں یہ اعتراف و اعلان ناموزوں نہیں کہ اس وقت تک ہندوستان کے صوبجات شمال و مغرب میں محمد شاہ یا عالمگیر سے پہلے کوئی نمونہ اردو نثر کا نہیں ملتا فضلی جن کو آزاد نے نثر اردو کا موقف اول کہا ہے وہ بھی دکنی تھے مگر چوں کہ ان کی کتاب ہندوستان کے اکثر صوبوں میں پہنچ گئی ہے اور اُس کی ترتیب نثر قریب قریب وہی شان رکھتی ہے جس کو

فضلی کے بعد دوسرے اہل قلم نے بھی برقرار رکھا ہے، لہٰذا اس کو ہندوستان کی شمالی و مغربی نصاب میں شامل کر لینا بے محل نہیں۔

فضلی سے بیس پچیس برس پہلے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد آخر میں نارنول ضلع کرنال کے سید جعفر ایک ہمسوڑا اور پھکڑ شاعر گزرے ہیں، جن کے تعارف کو جب تک زٹلی سے ممنون نہ کیا جائے پہچانے نہیں جاتے۔ انہوں نے بھی چند خاکے اردو نثر کے دکھائے ہیں جو دو چار سطروں سے زیادہ نہیں لیکن وہ سب کے سب حد تہذیب سے باہر ہیں اس لئے انکا نمونہ اس کتاب میں لکھا جا سکتا ہے، نہ وہ مستقل تصنیف میں شامل ہونے کے قابل۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ عبارتیں خالص اردو میں بھی نہیں ہیں۔

شمال ہند میں اردو زبان کیوں دیر میں مروج ہوئی

جس ملک میں متعدد صدیوں تک ملک گیری اور انقلاب سلطنت کی آندھیاں رات دن چلتی رہی ہوں وہاں امن چین کے ساتھ علمی مذاق کا چرچا اور اہل مذاق کے ہاتھوں کسی نئی زبان کے سدھرنے کا سامان کیا ہو سکتا تھا۔ یہاں دہلی یا نواح دہلی کے ان انقلابات کا تذکرہ فضول ہے جو شہاب الدین کے عہد (۱۱۹۱ء) سے پہلے راجہ جد مشٹر، راجہ جرجودھن، اور راجہ بکرماجیت یا راجہ بھگونت کی باہمی آویزشوں سے ظہور پذیر ہوئے، کیوں یہ کتاب ملکی یا سیاسی تاریخ نہیں بلکہ صرف تاریخ زبان ہے۔ تاہم اس ضمنی اشارے سے یہ نتیجہ ہمارے لئے مفید مطلب ہے کہ ہندوستان ہمیشہ سے میدان کارزار بنا رہا ہے اور مسلمانوں کی آمد سے قبل اور اس کے بعد بھی عرصہ دراز تک یہی عالم خلفشار نظر آتا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ شہاب الدین غوری کے زمانے سے نئی زبان کے بنیادی آثار نظر آنے لگے تھے اگر اثرات کو مخالف ہوائیں منتشر نہ کرتی رہتیں، اور حضرت امیر خسرو کی پہیلیوں کے بوجھنے والے انکے اتے پتے بھول نہ جاتے اور کم از کم ایسی طبع آزمائیوں کا سلسلہ نہ ٹوٹتا رہتا تو آج شمالی ہند میں بھی اردو پانچ چھ سو برس کی سن رسیدہ زبان ہوتی۔ میرے خیال میں شمالی ہند کے اہل ادب کو اس زبان کی خدمت نہ کرنے کے موانع میں بڑا حائل سلطان محمد تغلق کا وہ سفاکانہ حکم تھا کہ جب اس نے

۱۳۳۴ء میں یہ خیال قائم کیا کہ دہلی چھوڑ کر دیوگڑھ کو دارالسلطنت بنایا جائے اور اُس کا نام دولت آباد رکھا جائے۔ چنانچہ قضائے مبرم کی طرح یہ حکم جاری ہوا اور دہلی خالی ہونا شروع ہوئی جس کی ویرانی کا یہ عالم ہوا کہ تمام درندگان صحرائی شہر کو ویران پاکر بس گئے۔ اگرچہ بظاہر اسباب اس انقلابی اثر کا پانچ برس کے بعد ردِ عمل شروع ہو گیا لیکن حقیقت میں جو پشتہا پشت کے باشندوں نے جبراً قہراً ترک سکونت کی تھی اور جو اس بعید مسافت کو طے کر چکے تھے اُن میں بالاکثر معاودت کے قابل نہیں رہے۔

خلاصہ یہ کہ اس انتقال مکانی نے احوالِ زبانی کو مدتوں کے لیے یکسر منتشر کر دیا۔ اِدھر شمالی ہند کی حکومت کی یہ کیفیت، اُدھر بیجاپور میں حسن گنگو نے بنیادِ سلطنت قائم کرتے ہی غیر ملکی (فارسی) زبان کو دفتر سے خارج البلد کر دیا۔ یہ اتفاقی اور قدرتی اسباب تیار ہے ہیں کہ دہلی و نواح دہلی میں اُس وقت اس لئے اُردو کا بول بالا نہ ہو سکا اور جنوب ہند میں اس وجہ سے اُس کا رواج شروع ہو گیا۔

امیر خسرو کے بعد سکندر لودی کے عہد (۱۵۰۹ء) میں سب سے پہلے کایستوں نے فارسی زبان سیکھ کر شاہی دفتر میں نام لکھوایا۔ اسی کا اثر تھا کہ اسی زمانے کے گورو رامانند کے چیلے کبیر داس (معاصر ۱۴۱۱ء) نے اپنے دوہوں اور بھجنوں میں سیکڑوں، فارسی، عربی الفاظ ملانے شروع کر دیئے، لیکن اسکا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ حکومت کے دباؤ سے ایسا کیا گیا۔ بلکہ عام استعمال و رواج اور آپس کے میل ملاپ کی وجہ سے ایسا ہونا لازمی تھا۔ ذیل کی مثالوں سے اس دعوے کا ثبوت ملتا ہے۔ کبیر کہتے ہیں:-

حد حد تو سبھی گئے بے حد گیا نہ کوئے
بے حد کے میدان میں رہا کبیر اسوئے

چلتی چاکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
ان پاٹن بیچ آئے کے ثابت رہا نہ کوئے

اونچے اونچے محل بنا دے گہری نیو دی مرا
چلنے کا منصوبہ نا ہیں رہنے کو من کرتا

آڑے ترچھے تاک لگا دے گہری مالا پیتا
ہر دے بھیتر کپٹ کترنی صاحب کیسے ملتا

بابا گرونانک بھی اسی زمانے کے ایک بزرگ ہیں اُنکے کلام میں عربی فارسی کے جتنے الفاظ ملتے ہیں اس بہتات سے اُس عہد میں کہیں نہیں ملتے۔ پھر انداز بیان ایسا آسان وعام فہم کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

سانس ماس سب جیو تہارا تو ہے کھرا پیارا — نانک شاعر یو کہت ہے سچے پرور دگارا
نانک ننھا اور ہو جیسے ننھی دوب — بڑی گھاس جل جائیگی دوب خوب کی خوب

یہ بھین اور دوہے کہنے کو بھاشا میں کہے گئے ہیں مگر انکی طرز ادا ایسی صاف ہے کہ آج کل کے معمولی اُردو خواں بھی بآسانی انکا مطلب سمجھ سکتے ہیں یہ نمونے اگرچہ نظم کے ہیں مگر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ صرف مثالیں دستیاب نہ ہونے پر یہ قیاس کرلیا جائے کہ اُس عہد میں نثر اُردو مروج نہ ہوگی۔ نظم، نثر کے مقابل میں اختصار اور دل کشی کا سامان زیادہ رکھتی ہے۔ نیز یہ کہ نومولود زبان بجز معمولی بات چیت کے اور کسی مصرف کی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اور سب پڑھ یہ کہ اسلاف ان باتوں کو قلم بند کرنے کے عادی نہ تھے۔ ان وجوہ نے نظموں کی ہم عہد نثروں کا ملنا تعجبات سے نہیں اگر اُس زمانے میں جنوب ہند کی طرح شمال ہند میں بھی معمولی سے معمولی حمایت و دستگیری کسی حکومت کی طرف سے ہو جاتی تو یقیناً حضرت امیر خسرو، کبیر داس، بابا گرونانک، سورداس (معاہد ۱۵۸۴ء) اور تلسی داس (معاہد ۱۶۲۳ء) کی فارسی آمیز بھاشا کے پہلو بہ پہلو اس نئی زبان کا دامن بھی وسعت پزیر نظر آتا۔ حکومت کی حمایت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ دکن میں وہ حضرات جو دہلی سے جاکر آباد ہوئے تھے انھوں نے ۱۳۲۱ء سے ۱۴۲۱ء تک ایسی متعدد نثر کی تصنیفیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جو متذکرہ بالا قیاسات کو یقینیات کا جامہ پہناتی ہیں۔

ابتدائی اردو کی کتابوں کے نام

زبان کی ابتدائی سادگی کا ایک نمونہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے مصنف و مؤلف اپنی کتابوں کے نام خالص اردو میں رکھا کرتے تھے۔ مثلاً "سب رس" (مولفہ ۱۶۳۵ء) اس نام میں دو لفظ ہیں اور دونوں بھاشا کی ابتدا سے اُردو کے عہد حاضر تک روزمرہ بول چال میں بکثرت شامل ہیں، مگر میرا خیال ہے کہ ان سطروں

کے پڑھنے تک بعض ناظرین کا ذہن منتقل نہ ہوا ہوگا۔ یہ کیا ہے؟ ہمارے پر تکلف مذاق کی سادگی اجنبیت؟ بہرحال اس کا مفہوم آج کل کے ادب لطیف میں "سراپا شیریں" سے ادا ہوسکتا ہے۔ اسی طرح "پھول بن"، ترجمہ بیتالیس، مترجمہ ابن نشاطی (۱۰۶۵ھ) اور من لگن مؤلفہ قاضی محمود (۱۱۱۲ھ) یہ رنگ سادگی فضلی کے زمانہ تک پایا جاتا ہے، انہوں نے بھی اپنے ترجمہ دو مجلس کا نام کربل کتھا (کربلائی کہانی) رکھا ہے۔

موجودہ اردو کی ابتداء

نویں اور گیارہویں صدی ہجری سے قطع نظر کرکے ترجمہ فضلی کے بعد پون صدی تک کوئی نثر کتاب شمالی ہند میں نہیں ملتی، محمد شاہی زمانے میں اور اس سے آگے پیچھے، ولی۔ حاتم۔ آرزو وغیرہ بکثرت صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں، لیکن کسی ایک نے بھی اردو نثر کی طرف عنان توجہ نہیں پھیری، خان آرزو سے خواجہ میر حسن بلکہ انشا تک جس نے اردو زبان یا شعر کے متعلق کوئی تذکرہ یا کوئی کتاب لکھی تو اس کی زبان فارسی ہی رکھی۔

مغلیہ خاندان کا لب بام آفتاب (شاہ عالم) اور ٹمٹماتا ہوا چراغ سحری (سراج الدین ابوظفر) کا زمانہ ایسا گزرا ہے جس میں خال خال نثر اردو کی کتابیں تالیف ہونے لگی تھیں، اگرچہ وہ کتابیں نہ شاہی دربار سے منسوب تھیں، نہ انکے حکم و منشا سے لکھی گئی تھیں (جس کا سبب اُن کی برائے نام بادشاہت کی بے اثری تھی) باایں ہمہ چونکہ قلعہ معلائے دہلی میں اُن کی محدود حکومت باقی تھی اور عموماً ہندوستان میں انکا نام و ذکر بادشاہوں کیطرح بخلوص نیت زبانوں پر جاری تھا۔ اس لئے ایسی کتابوں کو جو حکومت برطانیہ کے باضابطہ احکام و نظام کے علاوہ شائع ہوئی ہیں، انہیں یادگار سلاطین مغلیہ سے منسوب کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ ایسی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں، مگر جس قدر بھی ہے قابل افسوس ہے کہ اکثر حصہ غیر مطبوع و نامعلوم ہے۔ اور پرانے خاندانوں میں کہیں کہیں تلاش سے یہ سرمایہ مل جاتا ہے جیسے کہ فضلی کی کربل کتھا یا مرزا رفیع سودا کا ترجمہ شعلۂ عشق وغیرہ۔ لیکن یہ سرمایہ بھی گنج بادآورد کی طرح افسانہ ہی افسانہ ہے۔ یہی زمانہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہند مضبوط اور مستقل ہوئی اور دوسرے ملکی انتظامات کے ساتھ یہاں کی زبان

کے لئے بھی ابتدائی اور عارضی توجہ شروع کی گئی۔ انہیں توجہات کا نتیجہ ہے کہ ۱۲۱۶ھ میں پریم ساگر للو جی نے اور چار درویش کا اردو ترجمہ عطا حسین تحسین نے، اور حکام وقت کے ایما سے میر امن دہلوی، رجب علی سرور اور شیر علی افسوس وغیرہم نے باغ و بہار، آرائش محفل اور اخلاق محسنی (اردو) وغیرہ کتابیں ترجمہ و تالیف کیں، اسی سلسلے میں دوسرے اہل قلم نے بھی بطور خود اردو کا سرمایۂ تصنیف فراہم کیا۔ یہ سرمایہ نہ صرف قصوں اور کہانیوں تک محدود رہا بلکہ قواعد لغت اور تراجم مذہبی تک وسعت دی گئی۔ مثلاً شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزندان رشید شاہ عبد القادر اور مولانا رفیع نے قرآن پاک کے ترجمے کئے۔ ان مذہبی و اخلاقی مولفین و مترجمین کے علاوہ مسٹر جان گلگرسٹ اور وارن ہیسٹنگز، اور مارکوئس ولزلی وغیرہ مستشرقین و حکام بالادست نے خصوصیت سے ترقی اردو کو ملحوظ رکھا۔ اردو کی گرامر مرتبہ مسٹر جان گلگرسٹ بھی اسی زمانے (۱۸۰۹ء) کی یادگار ہے۔ خلاصہ یہ کہ اردو نثر کی نمایاں خدمتیں انگریزی عملداری کے قیام کے ساتھ بڑھتی رہیں ان خدمتوں اور کارروائیوں کا یہ عام اثر تھا کہ ۱۲۵۲ھ میں دہلی سے مولوی محمد باقر والد ماجد شمس العلماء آزاد نے ہفتہ وار اردو اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار ۱۲۷۳ھ سے پہلے تک جاری رہا۔

روس میں افسانوں کا ارتقاء

فرانس کے بعد غالباً دنیا میں سب سے زیادہ مکمل، دلچسپ، اور فنی اعتبار سے بلند پایہ افسانے روس کے ہیں۔ ناول نویسی میں روس نے کسی ملک سے پیچھے رہنا گوارا نہیں کیا۔ اگر فرانس کو لے مزربل (Les Miserables) اور میدل وماپن (Mdlle de Maupin) جیسے شاہکار پیش کرنے پر ناز ہے تو روس بھی گناہ و سزا (Crime and Punishment) اور انا کرنینا (Anna Kernina) جیسے نقید النظیر اور عدیم المثال شاہکاروں پر بجا طور فخر کرتا ہے۔

روس میں افسانوں کی ابتدا کس طرح ہوئی یہ تو بتانا مشکل ہے لیکن منظم اور باقاعدہ مختصر افسانے انیسویں صدی میں لکھے گئے۔ یعنی یہاں بھی مختصر افسانہ نگاری اسی زمانے میں شروع ہوئی جس میں یورپ کے دوسرے ممالک یعنی آسٹریا، ہنگری، بلجیم، ہالینڈ وغیرہ میں۔ لیکن ان ممالک میں فن افسانہ کا ہنوز روز اولین ہے۔ اور روس میں یہ فن اپنے نصف النہار پر ہے۔

جب زار پطرس اعظم نے سینٹ پیٹرس برگ کو اپنا دار الخلافہ مقرر کیا تو گویا روس میں مغربیت کے لئے ایک دروازہ کھل گیا۔ اور وہ سرزمین جو تاتاریوں کے دور ان حکومت میں شرقیت کی آماجگہ بنی ہوئی تھی، رفتہ رفتہ مغربی تہذیب، مغربی علوم وفنون، مغربی طرز معاشرت، مغربی تمدن، یہاں تک کہ مغربی ادب سے آشنا ہونے لگی۔

مغربی ادب کی نشر واشاعت کے ساتھ ساتھ مغربی ادب کا متبع بھی شروع ہوا۔ قدیم فرانسیسی اور جرمن شعرا کی پیروی میں لومونوسوف اور دورز ہافین نے (جو روسی شاعری کے ولی یا جاسر کہے جا سکتے ہیں) نظمیں لکھیں جن کا طرز ادا اسقدر قدامت لئے ہوئے ہے کہ جدید ناظرین کے لئے بہت کم دلچسپی کا باعث ہے۔ روسی امرا، اور عمائدین اکثر اپنے لڑکوں کو تعلیم کے لئے فرانس

اور جرمنی بھیج دیتے، اور عوام الناس بے بضاعتی کے سبب مجبور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم روسی ادب کا بہت بڑا حصہ امرا کے قلم کا نتیجہ ہے۔

جب نپولین اعظم کی تیغ خارشگاف وسط یورپ میں چمکی اور ساری دنیا کو خیرہ کر دیا تو روس کو بھی اپنے تحفظ کے لئے پیش قدمی کی ضرورت ہوئی۔ اور روسی جنگجو سرحد فرانس تک جا پہنچے یہ ایک ایسا نادر موقع تھا کہ روسی افسر، جن میں بہت سے ادیب بھی تھے، مغربی تہذیب و تمدن مغربی اثرات اور مغربی علم و عمل سے واقف ہونے کا ایک اور موقع پا گئے۔ اور تقریباً اسی زمانے میں روس کے دو نامور شاعر اور افسانہ نگار پشکن اور لرمنطوف پیدا ہوئے، جنہوں نے اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ اسی دور میں ایک اور قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ نپولین کی فتوحات اور بڑھتی ہوئی قوت کی وجہ سے یورپ کے دوسرے ممالک میں خوف اور دہشت نفرت کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ روس بھی اس اثر سے محفوظ نہ رہ سکا۔ یہاں تک کہ روس میں فرانس اور اہل فرانس سے اسقدر نفرت بڑھ گئی کہ فرانسیسی علم و ادب چھوڑ کر روسی ادیبوں نے جرمن اور انگریزی علم و ادب کو اپنا خضر راہ بنایا۔ چنانچہ پشکن اور لرمنطوف کو ہم بائرن اور اسکاٹ کے نقوش سے مخمور پاتے ہیں۔

ٹھیک اسی زمانے میں مختصر افسانہ نگاری نے روس میں جنم لیا۔ پشکن پہلا شخص ہے جس کے مختصر افسانے صحیح معنوں میں مختصر افسانے کہلانے کے مستحق ہیں لیکن قبل اس کے کہ ہم روس میں مختصر افسانے کی ارتقا پر ایک اجمالی نظر ڈالیں، یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ روس میں مختصر افسانے کی کیا صورت ہوتی تھی۔

روسی افسانے عموماً تین قسم کے ہوتے تھے:-

(۱) رومان (Roman) یعنی طویل ناول جن کی ضخامت دو سو صفحات سے لیکر بسا اوقات ہزار صفحات تک ہوتی تھی۔

(۲) پوویست (Povyest) یعنی مختصر ناول جنکو انگریزی میں (Novellette)

کہتے ہیں۔ ان میں وہ افسانے شامل ہیں جن کی ضخامت تقریباً ۳۰ صفحات سے لیکر ۴۰ صفحات تک ہوتی ہے۔ یہ صنف روس میں سب سے زیادہ مقبول ہے کیونکہ نہ یہ مختصر افسانوں کی طرح اس قدر مختصر ہے کہ اس میں کرداروں کے ارتقا کی گنجائش نہ ہو اور نہ طویل ناولوں کی طرح اس قدر طویل ہے کہ پڑھنے والا تھک جائے۔

(۳) رسکاز (Razskaz) یعنی مختصر کہانیاں جنکی ضخامت ۳۰ صفحات سے کم ہو۔ اور یہی وہ صنف ہے جس میں روسی ادب کے جواہر پارے سب سے زیادہ نظر آتے ہیں۔

ان تینوں اصناف افسانہ میں سے اگرچہ ہر ایک نے اپنی جگہ پر خوب ترقی کی ہے۔ مگر مختصر کہانیوں نے سب سے زیادہ اہمیت حاصل کی۔ روسی ادب کے مشہور نقاد مسٹر کامٹ کا قول ہے کہ "مختصر افسانہ ہمیشہ روسی ادب میں ایک خاص اہمیت کا حامل رہا۔ اور تقریباً تمام باکمال روسی ناول نویسوں نے اس کی طرف خاص توجہ کی ہے"

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے ممالک کے خلاف روس میں مختصر افسانوں نے طویل افسانوں کے ساتھ جنم لیا۔ یہ خصوصیت صرف روس ہی کو حاصل ہے کہ یہاں طویل افسانے (ناول) اور مختصر افسانے ایک ساتھ پیدا ہوئے۔ اور ایک ساتھ نشو و نما پائی۔

الگزنڈر سرگیوچ پشکن (Alexander Surgeevich Pushkin) روس کا پہلا افسانہ نگار ہے۔ اگرچہ اپنے ملک میں اس کی شہرت کا اصل باعث اس کی شاعری ہے۔ اور یہ روسی زبان کا بہترین شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ تاہم بہ حیثیت ایک افسانہ نگار کے، اس کا رتبہ کچھ کم نہیں۔ اسکا منظوم ناول "اوجینی اونی جن" (Evgeni Onegin) اسکا بہترین شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں اس نے شاعری اور افسانے کو ترکیب دیکر ایک ایسا لطیف پیکر تیار کیا ہے، جس کی جتنی تعریف کیجائے کم ہے۔ اس ناول کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

لیکن اس مضمون میں ہمیں اس کی شاعری سے کوئی واسطہ نہیں صرف اس کے افسانوی کارناموں پر ایک نظر ڈالنا ہے۔ مذکورہ بالا منظوم ناول کے علاوہ اس نے متعدد قصے نثر

میں لکھے ہیں جو اپنی دلچسپی اور دلکشی کی وجہ سے بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں ان افسانوں کا ترجمہ مسٹر ٹی۔ کین نے کیا ہے اور بوہن لائبریری سے یہ افسانے شائع ہوئے ہیں۔

پشکن کے افسانوں میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو اس کے ہمعصر فرانسیسی اور جرمن مصنفین میں موجود ہیں۔ سب سے زیادہ اس پر اپنے ہمعصر ہاف مین (Hoffmann) کا اثر پڑا ہے۔ اس کے قصوں میں وہی دہشت ناک اجنبیت پائی جاتی ہے جو ہاف مین کا طرۂ امتیاز ہے۔ اپنے طویل افسانے "کپتان کی لڑکی" میں اس نے ایک بڑی حد تک انگریز ناول نگار اسکاٹ (Scott) کا تتبع کیا ہے۔ افسانہ دیکھکر صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ قصہ نگار نے یہ افسانہ Rob Roy یا Ivanhoe سے متاثر ہوکر لکھا ہے۔ اپنے ایک اور افسانے "کفن دوز" میں وہ ہاف مین کے اس قدر قریب پہنچ گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ قصہ پشکن کا نہیں بلکہ ہاف مان کا لکھا ہوا ہے۔ اس زمانے کے مذاق کے مطابق پشکن نے ایک حد تک مافوق الفطری عناصر سے بھی اجتناب نہیں کیا۔ لیکن یہ صرف ایک حد تک ہے اور باوجودیکہ فرانس میں اس وقت فن افسانہ ارتقا کے بہت سے منازل طے کر چکا ہے تاہم پھر بھی زولا (Zola) جیسے باکمالوں نے بھی اس کو روا رکھا ہے۔

لیکن بعض لوگ حقیقی معنوں میں افسانہ نگاری کا بانی پشکن کو نہیں بلکہ گوگل (Gogol) کو کہتے ہیں۔ یہ پشکن کا ہمعصر تھا۔ اس نے اکثر افسانے ہاف مین کے تتبع میں لکھے ہیں۔ اس کے قلم میں ظرافت کی جھلک جا بجا نمودار ہے۔ افسانے اکثر مذہبی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر ان میں ظرافت نہ ہوتی تو شاید ایک خاص طبقے کے سوا مقبول نہ ہوتے۔ بایں ہمہ اس کا شمار روس کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہے۔ مشہور روسی ناولسٹ دوستوفسکی کا قول ہے "ہم کو یہ عبا[1] گوگل کے ورثے میں ملی ہے۔"

[1] یعنی افسانہ نگاری

پشکن کا دوسرا ہم عصر میکائیل رمنطوف۔ شاعری اور افسانہ نگاری دونوں میں ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ وہ فوج میں افسر تھا اور اُس کی زندگی کا بہت بڑا حصہ کوہ قاف کے گرد و نواح میں گزرا۔ اور یہیں اُسکی شاعری نے نشو و نما پائی۔ اس پر لارڈ بائرن کے کلام کا بڑا گہرا اثر پڑا اور اتفاق یہ تھا کہ اُس کی اپنی سوانح حیات ایک بڑی حد تک بائرن سے ملتی جلتی تھی۔ اُس کی شاعری کا زندہ جاوید کارنامہ ایک طویل نظم ہے "آسیب" جس میں نواح قاف کی ایک خوبرو لڑکی کا ایک پراسرار عفریت سے عشق، اور اس پرستیدہ خیال کے عشق کی شاعرانہ وارداتیں اس خوبی سے دکھائی گئی ہیں کہ صرف یہی ایک نظم رمنطوف کو روس کے بہترین شعراء میں گنوانے کے لئے کافی ہے۔

مگر یہاں ہمیں اُس کے افسانوی کارناموں پر نظر ڈالنا ہے جو اس قدر شاندار نہیں جس قدر کہ اس کی شاعری۔ تاہم ایک خصوصیت قابل ذکر ہے کہ اُس کا ناول "ہمارے زمانے کا ہیرو" روسی زبان میں پہلا ناول ہے جس میں کردار نگاری کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور یہ ناول قدیم ناولوں اور جدید نفسیاتی ناولوں کی درمیانی کڑی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سے مختصر افسانے لکھے ہیں جو ایک بہت بڑی حد تک شاعرانہ کہے جانے کے مستحق ہیں۔ اس کے افسانوں میں لطافت اور محبت کی دلکش چاشنی کی رنگ آمیزیاں غضب ڈھا جاتی ہیں۔ اُس کو فرانس کے شاعرانہ افسانہ نگار گاتیر (Gautier) کا مقابل ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

پشکن اور رمنطوف دونوں فن افسانہ نگاری میں ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ دونوں ہاف مین کے روحانی شاگرد ہیں۔ اور عجیب تر بات یہ ہے کہ دونوں کا انجام بھی ایک ہی ہوا یعنی پشکن اور رمنطوف دونوں ڈوئل میں مارے گئے۔

اس کے بعد روسی افسانہ نگاری کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اور وہ زمانہ آتا ہے کہ روسی افسانے بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے لگے۔ اس دور کی سب سے پہلی نمایاں شخصیت

آئیفن طرجنیف کی ہے۔ یہ پہلا روسی مصنف ہے جسے مغرب نے قدر کی نظروں سے دیکھا۔ ایک کھاتے پیتے زمیندار کا بیٹا تھا جس نے اس کی تعلیم میں خاص توجہ کی اور اُسے مزید تعلیم کے لئے جرمنی بھجوایا جہاں اس ہونہار نوجوان کی ادبی زندگی کی داغ بیل پڑی۔ اپنی زندگی کا بہت بڑا زمانہ اس نے پیرس میں بسر کیا۔ اور یہاں فرانس کے نامی گرامی ادبا، فلابیر (Flaubert) الفانسو دادے (Alphonse Daudet) اور ایلی زولا (Emile Zola) کی صحبت میں اُس نے اپنی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ اپنی زندگی ہی میں اُسے بہت کافی شہرت حاصل ہوگئی سیاسی نقطہ نظر سے وہ اشتراکیت اور جمہوریت کا حامی تھا۔ اس لئے ملک سے جلاوطن کر دیا گیا۔ اُس نے کئی ناول اپنے ملک کی سیاست میں اشتراکی روح پھونکنے کے لئے لکھے۔ جن میں "بنجر زمین" (Virgin Soil) اور "باپ اور بیٹے" (Fathers and Sons) بہت مشہور ہے۔ اس زمانے میں روس میں وہ مواد پک رہا تھا جو بعد میں اشتراکی تحریک بن کر زار کی سلطنت کو زیر و زبر کر گیا۔

طرجنیف نے ہر قسم اور ہر طبقے کے افراد کی مصوری کی ہے اور خوب کی ہے۔ پہلا روسی افسانہ نگار ہے جس نے روسی ادب کا پایہ اسقدر بلند کر دیا کہ وہ دنیا کے بہترین شاہکاروں کے مقابلے میں اپنی پیداوار پیش کرنے کے قابل ہو سکا۔ اُس کے ناولوں میں "دھواں"۔ "روڈن" اور "باپ اور بیٹے" بہت مشہور ہیں۔ لیکن اُس کے ناولوں سے زیادہ اُسکی مختصر کہانیاں پسند کیجاتی ہیں۔ اُس کے افسانوں میں لطافت اور بانکپن پایا جاتا ہے۔ دل کے لطیف جذبات کی ترجمانی، اور محبت کی نازک کیفیات کی نقاشی اُس سے بہتر غالباً کسی روسی مصنف نے نہیں کی۔ اُس کے مختصر افسانے دل کی لطیف کیفیتوں، روح کی گہرائی میں مچلنے والی موجوں کو صفحہ قرطاس پر پیش کرتے ہیں۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ اس کی سیاسی آویزشوں کا اثر اُس کے مختصر افسانوں پر بہت کم پڑا۔ اُس کے افسانوں میں "دورِ بہار" "آسیا" "اجنبی" "ایک کہلاڑی کے تجربے" وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ اس کے جملہ ناولوں اور مختصر افسانوں

کے انگریزی ترجمے کا مجموعہ ہین مین کمپنی نے شائع کیا ہے۔

طرجنیف کا ہمعصر فیدور دوسطوفسکی (Fedor Doestovsky) دنیا کے مشہور ترین ناول نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ سیاسی سرگرمیوں کے باعث اُسے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ سائبریا میں ایک قیدی کی حیثیت سے گزارنا پڑا۔ وہاں سے واپس آکر اس نے ۱۸۶۱ء سے وہ غیر فانی ناول لکھنا شروع کئے جنہوں نے اُسے دنیا کے عظیم ترین ناول نویسوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ اس کے ناولوں میں "گناہ و سزا" "ذلت و اذیت" "احمق" وغیرہ دنیا کے بہترین ناولوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ افسانہ نگاری اور دوسطوفسکی گویا لازم و ملزوم ہیں۔ اُس نے بہت سے مختصر افسانے بھی لکھے ہیں۔ اُسکا اسلوب بیان طویل لیکن دلچسپ ہوتا ہے۔ فطرت انسانی کا جتنے عمق سے مطالعہ اس نے کیا ہے، شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ اس نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ انتہائی بدنصیبی میں بسر کیا ہے۔ برسوں قید میں رہا۔ گناہگاروں چوروں، بیکسوں، بدمعاشوں، غریبوں، امیروں، غرضکہ ہر قسم کے آدمیوں کی فطرت کا مشاہدہ کرنے کا اُسے موقعہ ملا۔ اور چونکہ وہ خود زخم خوردہ تھا، اس لئے ان باتوں نے اس کے دل پر ایک گہرا اور نمایاں نقش کیا۔ اُس کے افسانے گویا اُس کے دل کی بھڑاس ہیں۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ انسانی فطرت کا پوشیدہ سے پوشیدہ راز بھی وہ اس خوبی سے عریاں کر جاتا ہے کہ دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ جس طرح ڈراما میں شکسپیر کے کمال کے آگے دنیا کے تمام ڈراما نگار ہیچ نظر آتے ہیں، اسی طرح افسانوں میں دوسطوفسکی کے مقابلے میں بہت کم افسانہ نگار نگاہوں میں جچتے ہیں۔ اُس کے ہمعصر اور روس کے زندہ جاوید ادیب طالسطائی نے اس کے مرنے پر یہ الفاظ کہے "میں نے کبھی اسے نہیں دیکھا، اور نہ کبھی مجھ سے اور اس سے تعلقات رہے لیکن اس کی خبر مرگ سنکر میں نے محسوس کیا کہ میرا قریب ترین، اور عزیز ترین شخص مرگیا جو کام وہ کرتا میرے خیال میں نوع انسانی کی بھلائی کے لئے کرتا۔ وہ مرگیا تو میں نے محسوس کیا کہ میں نے ایک جوہر کھو دیا"

پھر بھی دوسطوفسکی کے افسانوی کارناموں کا اگر کوئی ہمقابل ٹھہر سکتا ہے تو وہ اس کا ہمعصر اور روس کا مشہور ترین شخص کونٹ لیو طالسطائی (Count Leo Tolstoy) طالسطائی اخلاقیات مذہب، سیاست، اور فلسفے کا امام تسلیم کیا جاتا ہے لیکن افسانہ نگاری میں بھی اُسکا مرتبہ کچھ کم نہ تھا۔ بلکہ رومانیا کا قول تھا کہ اس عظیم ہستی کے تمام کارناموں سے زیادہ مجھے اُسکی مختصر کہانیاں پسند ہیں"

طالسطائی اپنی صدی کا سب سے بڑا آدمی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی ہر تحریر اُس کی عظمت کی دلیل ہے۔ اُس کے افسانوں میں بھی یہی خصوصیت بیّن طور پر نظر آتی ہے۔ اُس کے ناولوں میں سے اینا کرنینا (Anna Kernina) اور "ری زرکشن" (Resurrection) دنیا کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جنگ اور صلح (War and Peace) کا مشہور تاریخی ناول ہے جس میں نپولین کے زمانے کی لڑائیوں کی داستان ہے۔

مختصر افسانوں میں اس کا ایک ناولٹ (Novellette) کروٹزر سوناٹا Kreutzer (Sonata) غیر فانی شہرت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے مذہبی، تمدنی، اخلاقی، اور دیہاتی افسانے ایک کثیر تعداد میں لکھے

ہر مذاق کے لوگوں کو اپنے مذاق کے افسانے طالسطائی کے یہاں مل سکتے ہیں۔ اس کے مختصر افسانوں کا ایک مجموعہ مسٹر اور مسز ایمر ماڈ نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور ورلڈس کلاسک میں شائع ہوا ہے۔

طالسطائی اور دوسطوفسکی کے بعد روس میں افسانہ نویسی کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ دوسرے دور میں طویل ناولوں کی طرف خصوصیت سے توجہ کی گئی۔ اور روسی طویل ناول، فرانسیسی ناولوں کے ہمقابل سمجھے جانے لگے لیکن اس تیسرے دور میں مختصر کہانیوں کو اہمیت دی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بلجیم میں مارس ملرلنگ (Maurice Maeterlink) فرانس میں موپاسان (Maupassant) اور آسٹریا میں آرتھر سینٹ زلر (Arthur Schnit z ler) جیسے مختصر افسانہ نگار پیدا ہو رہے تھے اور مختصر افسانے مقبولیت اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جا رہے تھے

روس میں بھی یہی کیفیت تھی۔

تیسرے دور کا سالار کارواں انطون چیخوف (Anton Chekhov) ہے جس کی مختصر کہانیاں اُسے دنیا کے مختصر افسانہ نگاروں کی صف اولین میں جگہ دلواتی ہیں۔ اسکی شاہراہ جملہ متقدمین سے علٰحدہ تھی۔ اسکا کام صرف فطرتِ انسانی کی عکاسی کرنا ہے۔ اس نے کبھی شیرینی اسلوب کی پروا نہیں کی بلکہ ایک نقاد کے الفاظ میں "اُسکے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں فطرت انسانی کا صحیح عکس دیکھ لیتا اور پھر یہی عکس دنیا کو دکھاتا"

چیخوف کے مشہور پرستار اور نقاد مسٹر ولیم گرہارڈی جنہوں نے چیخوف کے کمال کے اعتراف میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "جب ہم چیخوف کو پڑھتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں۔ اوہ۔ یہ تو بالکل ہماری تصویر ہے۔ یہ تو بالکل ہم ہیں" یہی چیخوف کا کمال ہے۔ یہی وہ کمال ہے جو طویل افسانوں میں دوسطوفسکی کا طرۂ امتیاز رہا۔ دوسطوفسکی میں اور چیخوف میں فرق یہ ہے کہ چیخوف میں دوسطوفسکی کا سا طول نہیں۔ دوسطوفسکی فطرتِ انسانی کے تمام نشیب و فراز، انسانی دل کی تمام کیفیتیں ایک ہی پلاٹ میں بیان کر جاتا ہے۔ اور چیخوف ایک پلاٹ میں زندگی کی صرف ایک قاش پیش کرتا ہے۔ ہر دلی کیفیت کو دوسرے پلاٹ میں بیان کرتا ہے۔ بادی النظر میں یہ بہت بڑا نقص ہے۔ لیکن یہ چیخوف کی خطا نہیں۔ مختصر افسانوں میں کردار کے نشو و نما پانے کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے ناول کو مختصر افسانے پر فضیلت دیجا سکتی ہے۔ چیخوف نے صرف مختصر افسانے ہی لکھے۔ اور مختصر افسانے کو من حیث الفن ترقی دی۔

شروع شروع چیخوف نے چند مزاحیہ افسانے لکھے۔ مگر جوں جوں سن بڑھتا گیا، دنیا کا تجربہ بڑھتا گیا ہنسی کھیل کی جگہ غور و خوض نے لے لی اور پھر اس نے نہایت متانت سے دنیا کا معائنہ کیا چیخوف کے افسانوں کے ایک مترجم مسٹر کامٹ نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے۔ "اس کے مضامین وہی ہیں جو وہ اپنے اردگرد دیکھتا تھا۔ اس کے کردار، بہادرانہ کارناموں کے مظہر نہیں ہوتے بلکہ اُن آدمیوں کا نمونہ ہوتے ہیں جن کو وہ روزانہ دیکھتا۔ کسان اور

متوسط طبقے کے لوگ۔ وہ بڑے بڑے کارناموں کے مالک نہیں، اُنکے پیش نظر بڑے بڑے نصب العین نہیں۔ بلکہ اکثر وہ اپنی بدنصیبیوں میں اضافہ کرتے رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن میں سے بعض کامیاب ہوتے ہیں اور بعض ناکامیاب "

قصہ مختصر یہ کہ چیخوف نے مختصر افسانے کو ترقی دے کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اُس کے ہمعصروں میں گارشن (Garshin) خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس نے طرجنیف کے تتبع میں اکثر افسانے لکھے اور ایک بڑی حد تک وہ لطافت اور وہ دلکش اسلوب بیان پیدا کر بھی لیا۔ اس کا ایک افسانہ "سرخ پھول" بہت مشہور ہے۔ موپاساں کی طرح گارشین بھی دماغی بیماریوں میں مبتلا رہا۔ چنانچہ اس کے اکثر شاہکار موپاساں کی طرح نیم جنون کی حالت میں لکھے گئے ہیں۔ بالآخر خودکشی کر کے مرا۔

چیخوف کا دوسرا ہم عصر جسے مختصر افسانہ نگاری میں کافی بلند مرتبہ حاصل ہے۔ سالوگب (Salogub) ہے۔ اس کے افسانے ایک بڑی حد تک چیخوف سے ملتے جلتے ہیں بعض نفسیاتی افسانے اس نے بہت بہتر لکھے ہیں۔

چیخوف کا تیسرا ہم عصر لیونڈ انڈریف (Leonid Andreyv) ہے جس نے میکسم گورکی اور چیخوف کے برابر شہرت پائی ایک بہت بڑی حد تک وہ ماٹرلنک Maeterlinck اور ایڈگر ایلن پو (Edgar Allen Poe) کے اسلوب بیان کا تتبع کرتا ہے۔ اسکے افسانوں میں اسرار کے ساتھ غم اور فلسفیت کی بھی ہلکی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ وہ خود انقلاب کا بہت بڑا حامی تھا لیکن انقلاب کا نتیجہ دیکھنے سے قبل ۱۹۱۹ء میں مرگیا۔

روسی افسانہ نگاری کا چوتھا یعنی موجودہ دور میکسم گورکی سے شروع ہوتا ہے۔ میکسم گورکی کو اگرچہ کہ چیخوف کا ہمعصر بھی کہا جا سکتا ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُسکا کمال اُس وقت ظاہر ہوا جبکہ چیخوف کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اُس نے چیخوف سے کم شہرت نہیں حاصل کی۔ اُس کا طرز بیان انوکھا، دلچسپ اور شیریں ہے۔ اس کے بچپن کا زمانہ نہایت تنگدستی

میں بسر ہوا۔ برسوں وہ قلی اور جہاز میں کوئلہ ڈالنے والا رہا، چنانچہ جب اُس نے افسانہ نگاری شروع کی تو اپنی سوسائٹی کا حال لکھا۔ یہ ایک نئی دنیا تھی جس کا خاکہ پہلی بار دنیا کے سامنے پیش کیا گیا اور حد سے زیادہ پسند کیا گیا۔ میکسم گورکی نے اس رنگ کو بہت ترقی دی۔ انقلاب میں اس نے اشتراکیوں کا ساتھ دیا۔ اشتراکی دورِ حکومت کے افسانہ نگاروں کا سرخیل بھی وہی ہے۔ اب بھی بقیدِ حیات ہے۔

میکسم گورکی کے ہمعصروں میں الکزنڈر کرین سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ ابتدا میں اس نے فوجی زندگی کے متعلق چند افسانے لکھے۔ رفتہ رفتہ اس کے افسانوں میں فلسفیانہ شان پیدا ہوتی گئی۔ جس کو اس کے دلکش طرزِ ادا نے اور زیادہ پُرلطف بنا دیا۔

موجودہ دور یعنی اشتراکی دورِ افسانہ نگاری میں افسانہ برابر ترقی کر رہا ہے۔ اسی سال انگریزی میں اشتراکی دورِ حکومت کے افسانوں کا ایک انتخاب (Short Stories of the Soviet Russia) کے نام سے شائع ہوا جو روس میں فنِ افسانہ کی دن دونی رات چوگنی ترقی کی تازہ ترین مثال ہے۔

جب دنیا کی تاریخِ افسانہ پر نظر ڈالی جائے تو روسی ادیبوں کے شاہکار نہایت واضح اور نمایاں جگہ پر نظر آتے ہیں۔ پشکن کی قدیم رومانی کہانیاں پھر طرجنیف کے لطیف اور شیریں قصے پھر دوسطوسکی اور طالسطائی کے نفسیاتی قصے۔ پھر چیخوف کے حقیقت آمیز افسانے۔ پھر میکسم گورکی اور الکزنڈر کرین کے افسانے جن میں فلسفیت کی شان پائی جاتی ہے، روسی افسانہ نگاری کی ارتقا کا نہایت پُرشکوہ منظر پیش کرتے ہیں۔

ایک بدنصیب انسان

ابن راوندی اور اسکی محبوبہ

عالم شرقی میں، اہل قلم، ادیب، مصنف اور شاعروں کی زندگیاں اکثر ناکامی، تنگدستی اور زمانے کی ناسازگاری میں گذری ہیں۔ یہ مصیبت آج کی نہیں، بلکہ عرصے سے چلی آرہی ہے، اور شاید اسی میں کوئی قدرت کی حکمت بالغہ پنہاں ہے کہ ہنرمند فلاکت کے ہاتھوں برباد رہے اور بے ہنروں نے ہر نعمت دنیا کو حاصل کیا، مزے اڑائے اور اپنی حیات مستعار رنگ رلیوں، عیش پرستیوں، کامرانیوں شادمانیوں میں گذار گئے۔ یہی نہیں کہ صرف مفلسی کی تکلیف ان کی شریک حیات رہی بلکہ اور بھی بہت سی آفتیں مختلف بلائیں ان پر ٹوٹیں۔

یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اس پر بہت کم انشا پردازوں اور ارباب قلم نے قلم اٹھایا ہے، لیکن مصر حاضرہ کے ایک مشہور ادیب محمود کامل ادیب نے اس موضوع خاص پر ایک ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب لکھ ڈالی ہے جس میں ان بدنصیب انسانوں کے حالات درج کئے ہیں جو صاحب قلم، صاحب علم تھے، صاحب فن تھے، مگر اس بہار ستان کائنات میں ہمیشہ خزاں زدہ رہے اور انکے چمن حیات میں ثروت و کامرانی کی کبھی بہار نہ آئی یا آئی تو بہت جلد ہمیشہ کے لئے پامال خزاں ہوگئی۔ اس کتاب کا نام "البؤساء فی عصور الاسلام" ہے یعنی اسلامی دور حکومت کے بدنصیب لوگ۔ کتاب کے شروع میں انہوں نے بؤس و بدبختی پر عالمانہ بحث کی ہے۔ اس کی قسمیں بتائی ہیں اور یہ کہ حقیقی بدبختی کیا چیز ہے اور اسکی بنیاد اصل کیا ہے، اور کس قسم کے لوگ اس میں زیادہ

گزشتہ نظر آتے ہیں، قدرت کاملہ نے زیادہ کسے اس کا اہل سمجھا ہے، اسلام کے مختلف دوروں میں کون کون سے نامور لوگ ایسے گذرے ہیں جن کا دامن بدبختی نے نہیں چھوڑا یہ کتاب اگرچہ اسلام کے بدنصیب مشاہیر پر ہے لیکن تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اور قومیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ یہ بحث مصنف نے نہایت قابلیت سے کی ہے لیکن افسوس ہے کہ ان علماء دنیا اور فلاسفۂ اسلام کے حالات بہت مختصر لکھے ہیں زیادہ تفصیل سے کام لیا جاتا تو یقیناً یہ کتاب بہت طول کھینچتی۔ بہرحال اپنے موضوع پر مشرقی زبانوں میں یہ غالباً پہلی کتاب ہے۔ اسمیں ابن راوندی کا حال بھی لکھا ہے جو میرے لئے بہت دلچسپ ثابت ہوا اور بے اختیار جی چاہا کہ اپنی زبان میں اسے منتقل کرلوں چنانچہ بالاکم وکاست اسے "جامعہ" میں لے رہا ہوں اگر یہ پسند ہوا تو اسکی دو ایک قسطیں اور دوں گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ناظرین کی طلب صادق دیکھکر یوں ہی بتدریج پوری کتاب اردو میں آجائے۔ یہ موضوع عام لوگوں کے لئے شاید زیادہ دل پسند نہ ہو اور یہ بالکل سچ ہے کہ خوشگوار نہیں تاہم یہ ضرور ہے کہ ہمارے انشاپرداز و مصنف جو اس بلائے عام میں گرفتار ہیں انہیں پڑھکر تسکین ہوگی کہ وہ وہی ناقدردانی زمانہ کے شکار نہیں بلکہ یہ قدرت الٰہی کی سنت جاریہ ہے اور شکر ہے کہ کم از کم اس باب میں تو ہم اپنے اسلاف کے نقش قدم پر ہیں مجھے امید ہے کہ اردو کے فدایان ادب ضرور اسے شوق سے پڑھیں گے۔

ابن راوندی، عرب کا ایک زبردست مسلمان عالم گزرا ہے، وہ اجتہاد کا درجہ، اور علم وفضل میں بلند پایہ رکھتا تھا، اس امام اجل اور عالم باعمل کا پورا نام حسن بن محمد بن علی راوندی ہے۔ سنہ ۸۵۹ء میں اسلام کی مشہور رابعہ عدویہ بغداد میں پیدا ہوا۔ وہ اتنا ذہین تھا کہ سات سال کی عمر میں اس نے پورا قرآن شریف حفظ کیا، اور اپنی زندگی کی بارہویں منزل میں پہنچکر اس نے علم مجوید قرارت سیکھ کر ساتوں قراتوں میں کمال پیدا کرلیا وہ نہایت ہی خوش آواز اور اعلیٰ نغمہ

نواز تھا۔ اسکی جاں نواز آواز کسی معصوم فرشتے کی دلگداز آواز معلوم ہوتی تھی، وہ دلوں کو مدہوش کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی خدا نے اسے حسن صورت اور حسن سیرت بھی عطا کیا تھا، اسکا چہرہ صبیح تھا اور اعضا متناسب ساتھ ہی پرہیزگار اور متقی بھی۔ اس نے زہد و ورع میں نشو و نما پائی تھی، نہایت عبادت گذار تھا۔ رات رات بھر عبادت میں گذارتا اور بہت کم سوتا تھا، صرف جھپکی لے لیتا تھا۔ اس کا شہرہ تمام اسلامی ممالک میں پہنچ گیا تھا۔ اس نے عراق کے اکثر شہروں کی سیاحت کی تھی، اسے ہر جگہ لوگوں کی طرف سے، ہر دلعزیزی اور اعزاز و اکرام کا سابقہ پڑا۔ اس نے اور بھی اسے علم پر ہمہ تن جھکا دیا۔ امرا نے اس کی نہایت عزت کی اور بادشاہوں اور ملوک نے اس کو اپنے دربار میں جگہ دی اور اس کے گرویدہ ہو گئے۔ اور جب اپنی عمر کے بیسویں سال میں اس نے قدم رکھا ہی تو وہ خدا کے فضل و کرم سے علم میں کمال اور فتنہ انگیز حسن و جمال کے تمام اوصاف کا سرمایہ دار بنا دیا گیا تھا۔ حسن و جمال کا یہ عالم تھا کہ عورتیں اس پر فریفتہ ہوتی تھیں، زینت و آرائش سے بے نیاز حسن و الیان اور حسین نازنین اس پر مرمٹتی تھیں اور ہر دولت مند خانہ دار خواتین جن کا حسن خود مسلم اور فائق تھا ان کی یہ آرزو تھی کہ کاش وہ اس کی ماں ہوتی اور اس کی حسن آفریں طلعت اور نادرۂ روزگار صورت سے ہر وقت کامیاب رہ سکتی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ابن الراوندی سوا بادشاہوں کے نہ کسی کے ہم نشینی میں رہتا تھا اور نہ امرا کے سوا کہیں اور رات کی صحبتیں گرم ہوتیں۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ اسے امیر بہاالدین بن شاد نے مدعو کیا۔ اس زمانے میں بنو شاد اس جزیرے کے سادات میں تھا، انکے بہت سے زمین کے قطعات تھے، شاداب چمن زار اور باغیچے اور بلند و شاندار محلات تھے جن کی وجہ سے بجا طور پر وہ اور بادشاہوں اور دوسرے امرا کیساتھ منافرت کا اظہار کر سکتے تھے بیان کیا جاتا ہے کہ ابن شاد کا لشکر سلم کے زمانے میں بیس ہزار سے کم نہ تھا اور بربہ کے زمانے میں اس کی تعداد خدا ہی جانے خدا نے راوندی کو جو حسن سیرت و حسن صورت عطا کیا تھا اس کا دور دور تک چرچا تھا۔ اسکا آواز

بہاؤالدین کے کانوں تک بھی پہنچا، امیر نے اسے دیکھنے اور اس کی خوش آوازی سننے کا ارادہ کیا کہ ایک شاندار دعوت کرے جس میں تمام امرا اور پاس پڑوس کے شہروں کے امرا و شرفا کو بھی بلائے اور کامل ایک مہینے تک اپنے ایک خوبصورت شہر میں رنگ رلیاں منائے اس نے اپنے کوتوال شہر کو خط دیکر ابن راوندی کے پاس بھیجا جس میں اسے والیہ تشریف لانے کی دعوت دی۔ اس کے لئے خاص عماری اور تمام ان ضروری اسباب راحت کا سامان مہیا کیا۔ جس وقت امیر کا پیامی پہنچا تو راوندی فوراً روانگی کو تیار ہو گیا اور دل ہی دل میں وہ نہایت شاد و مسرور تھا۔ جب وہ والیہ پہنچا تو لوگوں نے نہایت جوش مسرت اور دھوم دھام سے خیر مقدم کیا۔ ڈھول تاشے بجائے گئے اور خود امیر ابن حشاد اس کے استقبال کو نکلا۔ اور ابن حشاد ابن الراوندی کو دیکھتے ہی بلگیر ہوا۔ بخیریت پہنچنے کی مبارکباد دی اور اپنی استدعا قبول کرنے پر اسکا شکریہ ادا کیا اور جب وہ سفر کی صعوبت دور کرنے کے لئے تین روز آرام کر چکا تو امیر نے لوگوں کو جمع ہونے کے لئے بلایا۔ راوندی کے بیٹھنے کو ایک خاص اونچی جگہ تجویز کی تاکہ سارا مجمع اسے دیکھ سکے۔

راوندی اپنی ٹکڑی کے بیچ وسط میں بیٹھا۔ یہ اسی جیسے چار نوجوان تھے جو اپنے کمال میں ضرب المثل تھے۔ اور یہ چاروں اس کی آواز کو اٹھاتے اور دہراتے تھے، موسیقی کے انہیں جدید اصول کے موافق جو اس استاد کامل (راوندی) نے بتائے تھے۔ ابھی یہ مجلس قرآن شریف کی چند آیات کی تلاوت سے شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس کے بعد راوندی نے ایک عشقیہ قصیدہ الاپنا شروع کیا۔ حاضرین کی یہ حالت تھی کہ بے تابانہ اٹھ اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ امیر ابن حشاد تو بہ سحر آفریں موسیقی سنکر حیرت زدہ تھا، اس سریلی، شیریں اور موہنی آواز کے الاپوں نے اسے بے حال کر دیا۔ اس کی ہر تان اور ہر اتار چڑھاؤ میں ایک خواب شیریں کی لذت نمایاں تھی۔ ہر سننے والے کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ تانوں کا سلسلہ قلب کی گہرائیوں تک برابر لگا ہوا ہے۔ امیر کی عجب حالت تھی، وہ اپنے ان احباب اور مصاحبوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا: اگر میں یہ قسم کھاؤں کہ آج میں نے فرشتوں کی آواز سنی ہے تو یقیناً میں اپنی قسم میں جھوٹا نہیں ہوں گا۔

ابن راوندی برابر گا رہا تھا۔ وہ الاپ اور تانیں اڑا اڑا کر بیخود و مدہوش بنا رہا تھا۔ یہانتک کہ ساری محفل اپنے ہوش و خرد کھو بیٹھی، آخر یہ جان نواز مجلس نشاط صبح کے وقت ختم ہوئی۔ تمام حاضرین نماز فجر کے لئے اٹھ اٹھ کر روانہ ہوئے اور پھر اپنے اپنے کاموں کو ادھر اُدھر چلدئے۔ تمام لوگوں پر ابن راوندی کی خوش گوئی کا جادو چل چکا تھا اور انہیں محو حیرت بنا چکا تھا۔ امیر ابن حشاد اس کے پاس آیا اور اسے اپنی آغوش میں لے کر گلے لگایا اور اس سے نہایت درجہ محبت کا اظہار کیا، جوش مسرت سے آپے سے باہر ہو رہا تھا، دیر تک یہی حالت رہی یہانتک کہ راوندی کو اس کمرے میں پہنچایا جو خاص اس کے سونے اور آرام کرنے کے لئے مخصوص طور پر آراستہ کیا گیا تھا۔ یہ نہایت گراں بہا فرش فروش اور ساز و سامان سے آراستہ تھا، اس میں ایک پلنگ تھا اور اس پر ایک ریشمی اعلیٰ درجہ کا امرا کے آرام کرنے کا بستر۔ اور اس کے لئے ایک خاص خادم مقرر کیا۔ پھر اس سے رخصت ہوا تاکہ وہ آرام کرے۔ ابن راوندی نے شب خوابی کا لباس پہنکر پلنگ پر دراز لیٹ ہی لگائی تھی کہ اپنے کمرہ استراحت کے دروازے پر ایک خفیف آہٹ اور کنڈی کے کھٹ کھٹانے کی آواز سنی۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک دوشیزہ کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ اس قدر خوبصورت نظر آتی تھی کہ اس سے زیادہ حسین، چشم زمانہ اور انسانی آنکھ نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ اس حسینہ نے اشارہ سے سلام کیا اور نہایت شیریں الفاظ میں کہا:۔

میں سمجھتی ہوں کہ آپ مجھے بالکل نہیں پہچانتے ہوں گے؟ اور میرے یہاں آنیکی وجہ سے بھی بے خبر ہوں گے۔ میں ایک پردہ نشین شریف خاتون ہوں۔ آپ سے پہلے کسی مرد سے میری جان پہچان نہیں اور نہ یوں کسی کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔

راوندی نے نہایت احترام اور شرم سے اُسپر ایک نگاہ ڈالی مگر آنکھیں جھکالیں اور ادب آمیز انداز سے کہا: "میرا خیال اگر درست ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ شاہی خاندان کی کوئی رکن ہیں جو شرافت اور سیادت میں مانا ہوا اور مسلمہ طور پر بلند و سرفراز ہے" نازنین دیر تک

اس کے چہرے کو ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی، اس نگاہ میں محبت اور رحم کی درخواست شامل تھی پھر اس نے شرما کر کہا: آپ کا خیال بالکل درست ہے، میں امیر ابن حشاد کی بہن ہوں اور آپ کے پاس اس لئے حاضر ہوئی ہوں کہ اپنے محبت کے جذبات کو کھول کر رکھ دوں اور آپ کو یہ بتاؤں کہ رات میں نے آپ کا نغمۂ ساحرانہ سنا جس نے مجھے بے تابانہ شدید محبت، بے انتہا رانہ جذبۂ الفت سے لبریز کر دیا ہے۔ میں نے آپ کے حسن آواز کو خوب . . . . جس نے میرے تمام جذبات کو آپ کی طرف رجوع کر دیا ہے۔ اور جب مجھے آپ کی شرافت نفس اور حسن اخلاق و نجابت خاندانی کا پورا ثبوت مل گیا تو کوئی مانع محبت نہ رہا اور آپ کی پاک و شریفانہ شکل نے دل میں بے انتہا گھر کر لیا .. میں آپ کو اپنے دل کا مالک بنا چکی ہوں۔

ابن راوندی کانپ اٹھا، اس کے جوڑ جوڑ میں یہ سن کر ایک رعشہ تھا وہ ہکا بکا، جہاں کا تہاں رہ گیا۔ ایک گہری فکر میں اس وقت ڈوب گیا تھا دیر تک اس پر ایک گہری خاموشی اور فکر کی حالت طاری رہی، پھر اس نے اپنا سر اٹھا کر نازنین خاتون سے کہا: یہ آلام محبت کی ایک کھٹک ہے اور عشق خانہ خراب کے لئے پناہ جذبات کی ایک لپک ہے . . . . میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے بہت زیادہ جلد بازی سے کام لیا اور یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ میرے اور آپ کے درمیان بہت سی ہوسناک اور پرخطر گہرائیاں حائل ہیں جنہیں طے کرنا میرے لئے امکان سے باہر ہے۔

آپ شریف پردہ نشین، عفت مآب اور شاہی خاندان کی خواتین سے ہیں ایک فرمانروا بادشاہ کی بہن ہیں، کسی صورت اور کسی حالت میں بھی یہ ممکن نہیں کہ میں آپ کے سلسلۂ جذم میں شامل ہو سکوں۔ لہذا کے لئے آپ مجھے اس سعادت سے محروم ہی رہنے دیجئے۔

نازنین رونے لگی اور بولی: ابن راوندی! تم ایک ایسے نوجوان ہو جسے اللہ نے نایاب و نادر محاسن سے آراستہ کیا ہے، اُن اوصاف سے جو عورتوں کی آنکھ میں کھبے بغیر نہیں رہتے اور میں ایک ایسی دوشیزہ ہوں جو اپنے نفس پر قادر نہیں ہے میں خود اپنی ناچیز محبت کا ہدیہ پیش کرنے آئی ہوں، اور آپ سے رحم و کرم کی خواستگار ہوں میں چاہتی ہوں کہ اس محبت میں

اس کے اقتضا کے موافق آپ بھی شرکت کریں اگر چہ اس کے لئے جان جائے اور زندگی کا سامنا ہے۔

ابن راوندی کو دل اور آنکھوں پر اختیار نہ رہا اور بہت پھوٹ پھوٹ کر رویا اور نازنین کی طرف دیکھ کر بولا: معزز خاتون! بیشک تم ایسی حسین نازنین و حسن آرا خاتون ہو جس کے حسن و جمال میں کچھ شک و شبہ کی مجال نہیں اور میں نے جب سے نہیں دیکھا ہے اپنے اندر محبت کی تاثیر پاتا ہوں اے رعنائی شباب کی مالکہ اور اے حسن بے مثال کی سرمایہ دار خاتون! یقیناً تم سے مجھ محبت ہو گئی ہے لیکن میں کل اپنی تابناک امیدوں پر آنسو بہاؤں گا اور اس مبارک زندگی کو عذاب میں مبتلا دیکھوں گا۔ ممکن نہیں۔ خانہ خراب محبت تباہ و برباد کئے بغیر رہ سکے۔

نازنین: پیارے راوندی یاد رکھو کہ ہم دونوں زبردست اور ہولناک امیدوں کو اپنے کاندھوں پر لے چکے ہیں۔ اور ہمارے دل سوز و گداز کے مالک ہیں۔

راوندی: بیشک! لیکن نہایت افسوس کہ یہ عزیز جانیں نقصان و ضرر سے دوچار ہوں گی۔

نازنین نے کہا جو کچھ ہو۔ اس کے بعد دونوں نے محبت اور وفاداری کا عہد کیا۔

تقریباً کامل ایک مہینے تک خفیہ طور پر راوندی اور حسینہ دونوں ملتے رہے۔ اس دوران میں دونوں میں کسی کے لئے بھی ممکن نہ تھا کہ ایک دوسرے سے جدا ہو سکیں۔ محبت برابر بڑھتی جاتی تھی۔ وہ شاہی محلوں میں محبت کے نغمے گاتا رہتا تھا اور یہ عالم تھا کہ جو بھی سنتا تھا بے اختیار مجروح قلب ہو کر چیخ اٹھتا تھا۔

یہ کہانی آخر ختم ہوئی اور امیر ابن حشاد نے ان جلسوں کے ختم کرنے کا اعلان کیا۔ آسمان اس محبت کی تنہا ملاقاتوں کو نہ دیکھ سکا۔ ابن راوندی اور اس کی محبوبہ حسنات کی بدقسمتی رنگ لائی یہ واقعہ پیش آیا کہ آخری رات سے ایک رات پہلے امیر ابن حشاد نے اپنی دعوت پر تمام حضرات کی تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ کل کی رات ان تمام جلسوں کی آخری رات ہوگی۔ آپ لوگوں کی مسلسل تکلیف فرمائی کا میں بہت بہت شکر گزار ہوں۔

رات ختم ہوئی اور جلسہ برخاست ہوا اور صبح کے وقت تقریباً ٹھیک اپنی عادت کے موافق

نازنین حسنات، راوندی کے خوابگاہ عشرت میں آگئی اور دونوں ساتھ بیٹھکر عشق و محبت کی باتیں کرنے میں محو ہو گئے۔ یہ دونوں اس پرکیف گفتگو میں مدہوش اور کائنات کی ہر چیز سے بے خبر تھے۔ آنکھیں جو اوپر اٹھیں تو کیا دیکھتے ہیں امیر انکے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ اس نے آنکھیں چار ہوتے ہی کہا: "سلام علی العشاق فی کل مکان" ہر جگہ اور ہر مکان میں عشاق کو سلام اور سلام ہو تم دونوں کو کہ بیشک تم دونوں ایسے عاشق و معشوق ہو کہ زمانے نے جن میں تفرقہ ڈالا اور جدائی کا حکم سنا دیا۔

دونوں محبت کے متوالے جھجک کر رہ گئے، ان پر شدید خوف چھا گیا، وہ دونوں کھڑے کانپ رہے تھے، ان پر حیا مستولی تھی اور اس حیا نے حسن و جمال کی تابش کو اور نمایاں کر دیا تھا۔

امیر تاڑ گیا کہ راوندی رعشہ براندام ہے اور اس کے عزم و استقلال کمزور ہو گئے ہیں وہ کھڑا رہا، چہرے کا رنگ فق تھا غصے کے جوش سے چہرہ تمتما رہا تھا اور خود وہ کانپ رہا تھا۔ اس کے بشرے پر حزن اور یاس کا جوش ہیجان غالب تھا۔

نازنین کو شدت ندامت و حیا نے کپکپا دیا۔ اس پر حیا چھا گئی تھی، اس کے دونوں پیر دل کے تلے سے زمین نکل گئی اور وہ زمین پر لڑکھڑا کے گر گئی۔

سردار اسے اٹھا کر ایک دوسرے کمرے میں لے گیا، اور اپنے غصے کو اس نے چھپایا اس کے بعد وہ راوندی کے پاس پلٹ کر آیا اور کہنے لگا: تم رنجیدہ نہ ہو اور نہ کچھ اندیشہ کرو۔ یقین کرو کہ میں نے حسنات کو تمہیں کو بخشا۔

اور اسی قسم کی دلدہی اور تشفی کی باتیں کرتا رہا، یہاں تک کہ راوندی کا دل خوش ہو اشک و شبہ دل سے نکل گیا۔ پھر یہ دونوں دوشیزہ حسنات کے کمرے میں گئے، اور جب تک اسے ہوش نہ آیا وہ وہیں رہا۔ پھر امیر نے اسے بھی یہ کہکر تسلی تشفی دی کہ تمہیں بابر راوندی کو دے چکا اور تم بالکل مطمئن رہو۔

یہ بانغرا فرد و شکر دہان روداد محبت نہایت ہی خوش ہوئے اور اس مسرت کو اور زیادہ کرنے کے لئے امیر ابن حشاد نے کہا: اور جب میں تم دونوں کو ملنے اور مفارقت نہ کرنے کا حکم دے چکا ہوں اب ہمیں چاہئے کہ سب یکجا بیٹھکر آنیوالی صبح بہبود کا خیر مقدم کریں آؤ سامان نشاط بہم پہنچا کر شراب خماری کا جام پئیں۔

اسی وقت شراب لائی گئی امیر حشاد نے راوندی کے لئے پیمانہ بھرا ابن نے بھائی کا اور جائی نے بہن کا ساغر لبریز کیا۔ اور ابن راوندی نے اپنا گلدستہ۔ ابن حشاد نے نہایت حیرت انگیز پھرتی سے ان دونوں کے پیالوں میں زہر قاتل ملا دیا۔

تینوں میں شراب صافی کا دور چلا، اور اس کے پیتے ہی نازنین حسنات نے نہایت سخت دوران سر محسوس کیا اور وہ فوراً اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ابن راوندی کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کی آنکھیں چاک چاک ہوئی جاتی ہیں، امیر نے اسے بھی ایک خاص کمرے میں پہنچا دیا اور تنہا چھوڑ کر چلا آیا اسوقت راوندی کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ بہت جلد دنیا سے چل بسے گا۔ ابن راوندی یہ بھی سمجھ گیا کہ امیر نے کیا سلوک کیا ہے۔ وہ اسی رات موقع پاکر بھاگا اور اپنی اس بیماری و نکان کی تکلیف میں تمام رات برابر پیدل چلتا رہا جس کی وجہ سے اسکے لئے جنگل بیابان کا ہولناک سفر طے کرنا سخت دشوار تھا۔ وہ بیچارہ تین مہینے تک ایک شخص کی مہمانی میں رہا۔ اس درمیان میں وہ صرف ہڈی چمڑا رہ گیا تھا، اس کی حالت نہایت دردناک اور افسوس کن تھی۔

اسکے بعد بیماریاں برابر اسکی جان کو لاگو رہیں اور آلام واندوہ پیش آتے رہے۔ یہانتک نوبت پہنچی کہ اسکی شکل وصورت بالکل بدل گئی۔ اور یہ حالت ہو گئی کہ اسے جو دیکھتا پہچانتا بھی نہ تھا کہ یہ راوندی ہے۔ اسکا ذلیل ڈھول بالکل بدل گیا، چہرہ مسخ ہو گیا اور تمام جسمانی حسن وجمال ضائع ہو گیا اور اسکی آواز کی تیزی و موسیقی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ اسکی شکل وصورت بدل کر خوفناک اور بھیانک سی ہو گئی اور یہ سب اس زہر ہلاہل کی تاثیر تھی جو اسے پلا دیا گیا تھا۔

اسکی آواز بیماری اور سخت ناگوار ہو گئی تھی جو اس کے زخرے سے بڑی مشکل سے نکلتی تھی

اسوقت اس کی عمر تقریباً تیس سال کی ہو چکی تھی۔ اب وہ نہایت کس مپرسی کی حالت میں بغداد واپس چلا آیا اور یقین کے ساتھ یہ جان چکا تھا کہ اسکی آواز کا کمال ہمیشہ کیلئے جا چکا ہے اور اب اسکی زندگی نہ ہونیکے برابر ہے۔ وہ پوری توجہ کے ساتھ حصول علم پر جھک پڑا اور اپنی رات دن کی محنت کی بدولت زبردست عالم ہو گیا۔ ملک کے نامور علماء میں اسکا شمار ہونے لگا لیکن وہ تنہا تھا۔ اسکا گھر بار نہ تھا اس لئے اس نے اپنی ہی ایک قوم کی اور اپنی ہی جیسی نہایت غریب و مفلس عورت سے نکاح کر لیا۔ خدا کی شان کہ اس نے باوجود ابن راوندی کی مفلسی اور سقیم حالت کے اسے کثرت سے اولاد دی۔ لیکن اسکی خوش نصیبی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ وہ تھوڑا سا آٹا بازار سے خرید کر لا رہا تھا۔ اس نے یہ آٹا اپنے دامن کے ایک کونے میں رکھ کر ایک تاگے سے باندھ کر اپنے کاندھے پر رکھ لیا تھا۔ وہ اپنے گھر چلا جا رہا تھا کہ اسے اپنی اس بری حالت کا خیال آیا جس میں وہ آجکل مبتلا تھا اور جس تنگدستی کے عذاب میں گرفتار تھا، اور مصائب و آفات کے اس ہجوم کا جنہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا، اس نے اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا: "خدایا میری مشکل آسان کر" محویت کے ساتھ بار بار یہ دعا کرتا چلا جا رہا تھا کہ ایک پتھر کی ٹھوکر لگی۔ اسکے پاؤں لڑکھڑا گئے اپنے جسم کو نہ سنبھال سکا اور لڑکھڑاہٹ کی شدت سے وہ تاگا ٹوٹ گیا جس سے آٹا پلو میں بندھا ہوا تھا، زمین پر سارا آٹا پھیل گیا اور مٹی میں مل مل گیا۔ یہ دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس اسکے منہ سے نکل گئی اور یہ الفاظ زبان پر آ گئے: "خدا کا شکر ہے کہ میری مشکل آسان ہو گئی" اور اب بال بچے بھی بھوکوں مریں گے، اس واقعہ کا اس کے دماغ پر اتنا بڑا اثر ہوا کہ اس کی عقل و حواس بجا نہ رہے، دماغ مختل ہو گیا۔ اور راوندی پاگل ہو گیا اور پھر چند ہی ہفتوں کے بعد اس نے ہمیشہ کے لئے دنیا کے ان بے درد مصائب سے نجات پائی۔ راوندی کی وفات ۹۰۰ء میں ۹۰ سال کی عمر میں ہوئی۔

دنیا میں اور نہ جانے کتنے ایسے بدنصیب انسانی افراد ہوں گے، آہ !!!

(ترجمہ از عربی)

مزدور و سرمایہ دار

از مولانا محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی۔ لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد (دکن)

دنیا کی راحت کچھ بھی نہیں، دنیا کی مسرت کچھ بھی نہیں
سرمایہ دارو! سنتے ہو، یہ دھن یہ دولت کچھ بھی نہیں
یہ دنیا فانی جانی ہے، ہر چیز یہاں کی فانی ہے
کیوں ظلم کسی پر کرتے ہو کیا جی میں آخر ٹھانی ہے
گر خون غریبوں کا چوسا، مزدوروں کا دل کچلا یا
ایمان سے کہنا کیا تم نے اس بے دردی کا پھل پایا
کچھ ہمدردی انسانوں کی، کچھ جوش حمیت تم میں نہیں
غیروں کی مروت کیا ہوگی، اپنوں کی محبت تم میں نہیں
اپنے ہی بھائی بندوں پر تم ظلم کا ہاتھ بڑھاتے ہو
مزدور کماتے ہیں جو کچھ، تم چھین کے سب کھا جاتے ہو
لے لیتے ہو حاصل اُس کا، مزدور جو محنت کرتا ہے
کچھ یہ بھی خبر ہے پیٹ اپنا وہ بیکس کیونکر بھرتا ہے
جسموں پر اُنکے کپڑے نہیں، سردی سے بچے اکڑتے ہیں
سڑکوں کے کنارے اندھیرے راتوں کو جا پڑتے ہیں
بستر ہے، نہ تن پر کپڑے ہیں، گھر ہے نہ کہیں گھر بار اُن کا
ہے سب یہ تمہاری ہی باعث یہ غربت یہ ادبار اُن کا
غرق اُنکے دل کا سفینا ہے، حق تم نے جو اُنکا چھینا ہے

بیکار پہ اُن کا جینا ہے جب خونِ جگر یوں پینا ہے
تم اپنی ثروت کی خاطر نجے میں ان کو جکڑتے ہو
وہ روتے ہیں تم ہنستے ہو، وہ کڑھتے ہیں تم اکڑتے ہو
لے بے درد و! تم کیا جانو جو اُنکے دل پہ گزرتی ہے
ہر فریادِ دل دوز اُن کی شق سینہ اپنا کرتی ہے
جب بچے انکے بلکتے ہیں، کس حیرت سے وہ تکتے ہیں
چہرے سے رنج ٹپکتا ہے، آنکھوں سے اشک ڈھلکتے ہیں
آتا نہیں تم کو رحم ذرا، دل ان کا غم سے روتا ہے
چہرے پہ چمک، ہونٹوں پہ تبسم کیا ہوتا ہے
اللہ کے تم بھی بندے ہو، اللہ کے وہ بھی بندے ہیں
لیکن یہ تمہارے دستِ ہوس گردن میں انکی پھندے ہیں
تم ان کو مفلس رکھتے ہو اور اپنا خزانہ بھرتے ہو
پھر اس پر سو احسان اپنے گردن پر انکی دھرتے ہو
ہیں ہاتھ بھی خالی جیبیں بھی اور دامن بھی اُن کے خالی
معمور تمہارے خزانے ہیں۔ اللہ ری تمہاری خوش حالی
ان بیچاروں کی پامالی ہاتھوں سے تمہارے ہوتی ہے
سرمایہ داری کی یہ ہوس کشتی کو انکے ڈبوتی ہے
پر یہ بھی سوچا ہے تم نے، کیوں حاصل اطمینان نہیں
اس ثروت اور اس دولت پر بھی یعنی بجا اوسان نہیں
فطرت نے ضمیر دیا ہے جو ہر دم وہ ملامت کرتا ہے
اکثر یہ تمہارا دل تم پر تنہائی میں لعنت کرتا ہے

اے کاش سنو گوش دل سے مزدور کے دل کی فریادیں
اور دیکھو چشم باطن سے پڑتی ہیں جو اس پر افتادیں
قسمت میں تمہارے چین نہیں تسکین اطمینان نہیں
تم زندہ یا جسم مردہ ہو، ایمان کی جس میں جان نہیں
ہو راحت تو کیونکر تمہیں، سکھ کیا پاؤ آرام ہو کیا
نخوت نے تمہاری جب تم کو، دکھ سکھ سے انکے سبق نہ دیا
یہ عیش تمہاری یہ ثروت، اک عبرت ہے دنیا کے لئے
یہ ایک طلسم دولت ہے، دھوکا ہے دل بینا کے لئے
ہے اپنے ہی آرام کی دشمن، اور اپنی دولت میں ہو مگن
غیروں کی کیا پروا ہو تمہیں، اپنوں کی نہیں جب دل میں لگن
راحت ہے تمہاری جو کچھ ہے، مزدور کی راحت کچھ بھی نہیں
عزت ہے تمہاری جو کچھ ہے مزدور کی عزت کچھ بھی نہیں

تنقید و تبصرہ

الجہاد فی الاسلام ۔ مصنفہ مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی رفیق اعزازی دارالمصنفین۔ حجم ۵۰۰ صفحے تقطیع ۲۰×۲۶ ۔ چھپائی اور کاغذ عمدہ ۔ قیمت صہ ملنے کا پتہ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

اس بحث پر اس سے پہلے بھی کتابیں ہم نے پڑھی ہیں مگر مولنا مودودی نے جس شرح و بسط اور تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھا ہے وہ کچھ اور ہے ۔ اس میں اسلامی جہاد کی حقیقت اور اصول جنگ اور جنگ کی غرض و غایت پر تفصیلی بحثیں ہیں ۔ اقوام سابقہ کے جنگ کی کیفیتیں دکھا کر انہوں نے بتلایا ہے کہ اسلام نے اس میں کس قدر اصلاحات کیں اور اس کے اغراض کو کس قدر مقدس اور مفید بنایا ۔

معترضین جو اسلام کے مسئلہ جہاد پر اپنی نادانی سے اعتراض کرتے ہیں انکے تحقیقی جوابات دئے ہیں ۔ اور جملہ غلوک کا ازالہ کیا ہے ۔ اور دوسرے ادیان کی تعلیمات کے ساتھ مقابلہ کرکے اسلامی جہاد کی برتری اور فضیلت ثابت کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے معتبر کتب کے حوالہ سے لکھا ہے خاصکر اسلامی جہاد کے متعلق قرآن اور حدیث اور فقہ کی تعلیمات کو تاریخی روشنی کے ساتھ واضح کیا ہے ۔

آخر میں جنگ اور تہذیب جدید کے عنوان سے موجودہ مغربی تہذیب کے اصول اور اغراض جنگ دکھائے ہیں اور نور و ظلمت کے فرق کو اچھی طرح نمایاں کیا ہے ۔

بیان سادہ اور سلیس ہے اور معلومات سے لبریز میرا خیال ہے کہ کتاب زیر تنقید مسئلہ جہاد کے متعلق ان تمام کتب میں جو اب تک اس عنوان پر نہ صرف اردو بلکہ عربی میں بھی لکھی گئی ہیں ۔ سب سے زیادہ پر مغز اور فیصلہ کن کتاب ہے ۔ اور دارالمصنفین اسکی اشاعت پر شکریہ کا مستحق ہے ۔

اسلامی کارنامے ۔ مؤلفہ مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب جنرل سکریٹری مسلم ایسوسی ایشن وسکریٹری انجمن تعلیم الاطفال پھلواری شریف۔ مجلد قیمت عہ رجم ۱۳۶ صفحہ۔ لکھائی چھپائی کاغذ متوسط۔

ملنے کا پتہ: محمد فصیح اللہ صاحب۔ مسلم بک ڈپو۔ پھلواری شریف۔ پٹنہ۔

اس کتاب میں مؤلف نے مسلمانوں کی ملکی۔ علمی اور صنعتی ترقیاں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ اسلام سے اسلامی فتوحات۔ علمی تصانیف۔ مدارس۔ کتب خانے اور شفاخانے پھر عمارات اور صنائع وغیرہ دکھلائی ہے۔ اس کو پڑھکر یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ کن وجوہ سے ہمارے اسلاف نے ترقی کی تھی اور کیوں ہم قعر مذلت میں گر گئے ہیں۔

کتاب میں چند مشہور اسلامی عمارات کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

اسلام کی پہلی کتاب ۔ مصنفہ مولوی حکیم سید عبد اللطیف صاحب چشتی قیمت درج نہیں غالباً ۲ر ہوگی۔ ملنے کا پتہ: اکبر بک ڈپو سعید منزل۔ دہلی۔

مولوی عبد اللطیف صاحب جو ایک اسکول میں عربی کے مدرس ہیں بچوں کے لئے دینیات کا سلسلہ لکھنا چاہتے ہیں یہ رسالہ اس کی پہلی کڑی ہے۔ اس میں ابتدائی عقائد کی باتیں بطور سوال وجواب کے لکھی گئی ہیں بعض اہم اخلاقی تعلیمات اور نماز کا بھی بیان ہے بیان کا طریقہ سادہ ہے جو بچوں کے لئے مناسب ہے۔

تاریخ الامت حصہ ہفتم ۔ تاریخ الامت کا آخری حصہ چھپکر شائع ہوگیا۔ اس میں سلاطین و خلفاء آل عثمان یعنی عثمانی ترکوں کی شروع سے آجتک کے تاریخی حالات حسب معمول نہایت تحقیق اختصار اور سلاست کے ساتھ عربی ماخذوں سے لیکر لکھے گئے ہیں۔ ترکوں کی تاریخ میں اردو زبان میں اسکو پہلی تصنیف سمجھنا چاہئے کیونکہ آجتک جو کچھ انکے متعلق اس زبان میں لکھا گیا ہے وہ ترجمے ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت فی نسخہ عہ رملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ اقرولباغ۔ دہلی۔

معلومات - اس سال سے یہ جدید ماہانہ رسالہ چھوٹی تقطیع پر حمید الدین صاحب احمد ہارہروی ایم اے کی ادارت میں الہ آباد سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ قیمت سالانہ عہ
ملنے کا پتہ - دفتر معلومات الہ آباد

اسمیں مختلف قسم کی معلومات صنعتی، جغرافی اور تجارتی وغیرہ جو زیادہ تر اسکول کے طلبہ کے لئے مفید ہو سکتے ہیں دئے جاتے ہیں۔ وجز کا نہایت معمولی رسالہ ہے۔ کاش اس کو دلچسپ اور زیادہ مفید بنانیکی کوشش کیجاتی۔

کعبہ - یہ ہفتہ وار اخبار آٹھ صفحے کا آل انڈیا جمعیۃ القریش کی سرپرستی میں حضرت کوکب دہلی سے شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اسمیں قوم قریش قصابان کی اصلاح اور بہبود کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ مضامین نظم و نثر اچھے اور مفید درج کئے جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہندوستان میں ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں بھی پیشہ اور نسل کے لحاظ سے ذات پات کی تفریق پھیل گئی۔ اور اسلام جس چیز کو مٹانے کے لئے آیا تھا اسی میں مسلمان پھر گرفتار ہو گئے۔ یہ رسالہ اگرچہ ایک خاص جماعت کا آرگن ہے لیکن یہ دیکھکر اطمینان ہوتا ہے کہ فرقہ پرستی کو مٹانے والا اور وحدت کا حامی ہے۔ قیمت سالانہ ۔

ساقی - اردو کا علمی اور ادبی ماہوار صحیفہ مسٹر شاہد احمد بی اے آنرز کی ادارت میں دہلی سے اسی سال سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ گھٹائی چھپائی اور کاغذ عمدہ حجم چار جز قیمت پے سالانہ
مسٹر شاہد احمد مشہور عالم شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے پوتے ہیں اور اردو کا ذوق انہیں ورثہ میں ملا ہے چنانچہ اسی ذوق نے انکو اس رسالہ کے نکالنے پر آمادہ کیا۔
اسکے اعوان و انصار کا حلقہ اچھے اچھے ادیبوں۔ کاتبوں اور شاعروں پر مشتمل ہے جسکی وجہ سے انکا یہ رسالہ نہایت دلکش اور ادیبانہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ وہ خود بھی ایک خوش نگار قلم رکھتے

ہیں کہ انکا یہ رسالہ ترقی کرے گا اور اردو ادب کی خدمت کر سکے گا۔
ملنے کا پتہ: دفتر رسالہ ساقی۔ کھاری باؤلی۔ دہلی۔

البلاغ ۔ یہ ایک مذہبی علمی اور ادبی ماہانہ رسالہ ہے جو نظیر آباد لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ حجم ہر جز تقطیع ۲۰×۲۶ قیمت سالانہ صہ ہے جو نسبتاً زیادہ ہے۔

البلاغ پہلے ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ میں ہفتہ وار اخبار کی صورت میں جاری ہوا تھا لیکن پھر بند ہو گیا۔ اب اسی کو ماہانہ رسالہ کی شکل میں نکالنا شروع کیا ہے۔ اس کے مدیر سید محمد افضل شاہ ثاقب ندوی بہرائچی ہیں۔ مضامین متوسط درجہ کے ہیں۔ فرید وجدی کے ایک مضمون کا ترجمہ اچھا ہے۔ اگر مدیر رسالہ قرآن کی تعلیمات کو پیش کرنیکا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھیں تو امید ہے کہ یہ رسالہ زیادہ مفید اور کارآمد ہو جائے گا۔

قیام الدین ۔ حضرت مولانا عبدالباری مرحوم آخری آفتاب فرنگی محل کے غروب ہو جانے پر اُن کی یادگار میں انکے نام سے فرنگی محل سے یہ ماہانہ رسالہ زیر ادارت حسن انصاری صاحب نکلنا شروع ہوا ہے رسالہ کا حجم ۲۰×۲۶ تقطیع پر تین جز ہے اور چھپائی لکھائی معمولی ہے۔ قیمت للعہ سالانہ ہے جو زیادہ ہے۔ مضامین مذہبی اور اصلاحی ہیں۔ طلبائے علوم عربیہ اور مذہبی خیال کے لوگوں کے لئے یہ رسالہ مفید ہے۔

معاون ۔ چوہدری غلام مصطفےٰ صاحب بیرسٹر کی زیر نگرانی یہ ماہوار رسالہ گوجرانوالہ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ علمی، ادبی، طبی، اقتصادی، اصلاحی، زرعی اور امداد باہمی غرض قوم کی جس قدر ضرورتیں ہیں ان سب پر مضامین شائع کرتا ہے۔ بڑی تقطیع پر ۵۰ صفحے کا حجم ہے لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ اور قیمت سالانہ ہے۔ تصویریں بھی دیتا ہے۔

مضامین کے لحاظ سے نہایت قابل تعریف ہے۔ ہم کو امید ہے کہ یہ رسالہ ترقی کرے گا۔

سروش ۔ یہ ماہوار باتصویر رسالہ محمد عنایت خاں صاحب حیرت کی ادارت میں ماہانہ لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ حجم چار جزو اور قیمت سالانہ قسم اول للعہ ر۔ قسم دوم ہے

مضامین اور ترتیب تیز گھمائی چھپائی اور کاغذ کے لحاظ سے یہ رسالہ ادب کے اچھے رسالوں میں سے ہے۔ مارچ نمبر ہمارے پاس بغرض ریویو موصول ہوا تھا جس میں اچھے اچھے اہل قلم کے مفید اور دلکش مضامین نظم و نثر ہیں۔ دو تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

ضیاء القریش ۔ یہ رسالہ حکیم محبوب الٰہی صاحب صدیقی زبدۃ الحکماء کی ادارت میں گوجرانوالہ پنجاب سے اس سال ماہوار نکلنا شروع ہوا ہے۔ قومی، اسلامی، تاریخی۔ تمدنی اور ساتھ ہی طبی دلچسپیوں کا مجموعہ ہے۔ تین جزو حجم ہوتا ہے اور قیمت بھی سہ رسالانہ ہے۔ منیجر صاحب ضیاء القریش گوجرانوالہ سے طلب فرمائیں۔

شذرات

جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا بھی ہے۔ اس دنیا کا یہی دستور ہے۔ مرنے والے کی موت پر سچے جھوٹے آنسو بھی بہائے جاتے ہیں، اتنا اصل تو نہیں پر یہ بھی دستور ہے، امیروں کی موت پر لوگ چلا چلا کر روتے ہیں اور غریب کی تربت پر کوئی غمزدہ چند خاموش آنسوؤں کے موتی چڑھا دیتا ہے۔ اچھا تو نہیں ہے شرافت انسانی کا یہ تقاضا ہونا چاہئے پر کیا کیجئے یہ بھی دستور ہے۔ مگر کچھ موتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر آدمی چلاتا بھی ہے اور چلانے سے زیادہ خاموشی سے آنسو بہاتا ہے۔ یہ اُن نفیس ہستیوں کی موت ہوتی ہے جو اگرچہ غنی اور امیر تھیں مگر جن کے دل غریب تھے اور دردمند۔ جو اپنی دولت کو اپنے نبی نوع کی امانت سمجھتی تھیں اور اس امانت کے فرض کو زندگی بھر دیانت سے ادا کرتی تھیں۔ اس مہینہ میں ہماری بدنصیب قوم سے ایک ایسی ہستی اُٹھ گئی۔ اور اس کے اُٹھنے سے اس تشنہ کام زمین میں سے فیض کا ایک چشمہ بند ہو گیا۔

ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ کی موت پر جتنا ماتم اشخاص نے کیا ہوگا اس سے زیادہ اداروں نے کیا ہے۔ اس لئے کہ شاید ہی ملک کا کوئی مفید ادارہ ہو جو اس فیاض خاتون کے دست کرم سے فیضیاب نہ ہوا ہو۔ اور مدد بھی بے سمجھی مدد نہیں کون ادارہ ہے جس کی ان خوبیوں کو جنہیں ظاہر بیں نگاہیں نہیں پہچانتیں اس نے نہ سمجھ لیا ہو اور اس پر کارکنوں کی حوصلہ افزائی نہ کی ہو اور کونسی وہ برائیاں ہیں جو ظاہری شان و شوکت کی وجہ سے کم نظر لوگوں سے پوشیدہ رہتی ہیں انہیں اس نے نہ دیکھ لیا ہو اور بے لاگ تنبیہ نہ کر دی ہو۔ ہمارے ملک میں اور بھی اہل کرم ہیں پر انہیں ہم نے سر فلک عمارتوں میں فقدان روح پر ماتم کرتے اور مفلس و نادار کارکنوں کی جھونپڑیوں میں اگلوں کے نمونوں سے ڈھارس بندھاتے نہیں سنا۔ یہ چیز

مرحومہ ہی کے ساتھ مخصوص تھی اور اب شاید اس اجتماع صفات کو آنکھیں ڈھونڈیں گی اور مشکل سے کہیں پائیں گی۔

گزشتہ سال جب جامعہ کا وفد بھوپال حاضر ہوا اور مرحومہ نے اسے شرف باریابی بخشا اور حکیم صاحب مرحوم کا ذکر آیا تو فرمانے لگیں کہ مجھے جب حکیم صاحب مرحوم جامعہ دکھا رہے تھے تو میں نے ان سے کہا تھا، کہ حکیم صاحب، اب میری دنیا میں بس ایک آرزو ہے۔ کہ جب یہاں سے جاؤں تو آپ اور میری قوم یہ کہدے کہ یہ خادمۃ المسلمین تھی۔ افسوس کہ حکیم صاحب نہ رہے انہوں نے تو مسلمانوں کی خدمت ہی میں جان دی "ہاں حکیم صاحب تو نہیں ہیں لیکن مسلمانان ہند آج زبان حال سے اس خادمۃ المسلمین کا جو اسی خدمت کی وجہ سے انکی مخدومہ تھی ماتم کر رہے ہیں اور جبتک انکا کوئی بھی تعمیری کام جاری ہے اس محسنہ ملت کی یاد باقی رہے گی خدا مرحومہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور حضور نواب صاحب بھوپال اور دیگر پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور قوم کو ان کاموں کو اچھی طرح چلانیکی توفیق دے جن میں سے اکثر کا وجود اور بہتوں کی ترقی مرحومہ کے دست کرم کی رہین منت ہے۔

دور حاضر میں شاید مسلمانان کے اندر تنظیم تعمیر ملت، اتحاد پر کبھی تقریر و تحریر کی اتنی قوت صرف نہ کی گئی ہوگی جتنی کہ پچھلے ۵-۶ سال میں۔ اور شاید اس ملک میں ہماری پوری تاریخ کا کوئی زمانہ ایسا نہ بتایا جاسکے جب انتشار، تخریب اور نفاق کی قوتیں اس سے زیادہ قوی ہوں جتنی کہ اس زمانہ میں رہی ہیں۔ تفصیلات کو چھوڑ کر، کہ انکے ذکر اور خیال سے کلیجہ منہ کو آتا ہے، یہ حقیقت کسی چشم بینا سے پوشیدہ نہ ہوگی کہ اس زمانہ میں مسلمانان ہند کے سامنے کوئی ملی مطمح نظر، کوئی قومی مشق، کوئی سیاسی پروگرام، نہیں رہا۔ انکی سیاست، انکی تعلیم، انکی تنظیم، انکی تبلیغ سب کسی دوسرے کے جواب میں کسی دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے، کسی پر غصہ اتارنے کے لئے رہی ہے۔

اور یہ نہیں کہ یہ مخالفت صرف قومی یا معاشی ہو، اکثر و بیشتر خود مختلف "رہنمایان ملت" کی باہمی رقابت، مزاجوں کی عدم مناسبت، طبیعتوں کی عجلت پسندی، تعاون کی کمی اور رواداری سے بیگانگی اس مصیبت کا باعث ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہماری جماعتی سعی کے تمام میدانوں کا مجموعی حاصل صفر ہے۔ اور یہی نہیں کہ پچھلے زمانہ کی بے ثمری پر ہی آنسو بہائے ہوں آئندہ کی توقعات بھی کچھ بہت حوصلہ افزا نہیں۔ اسلئے کہ جماعتی کاموں میں اہم کام تقریباً سب صبر آزما اور دیر طلب ہوتے ہیں۔ اور ایک نسل کو اپنے کاموں کے چلاتے رکھنے کے لئے آئندہ نسلوں کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے رہنماؤں کی اس نسل نے جس کے ہاتھ میں بظاہر اسوقت ملی زندگی کی باگ ہے۔ جب حال کو بگاڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تو ان سے استقبال کے لئے کیا توقع ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ملی زندگی کے کسی شعبہ پر نظر ڈالئے موجودہ کام کرنے والوں کے جھگڑے مٹتے دکھائی دینگے اور آئندہ کام کرنے والوں کا کال۔ شاید کسی جماعت کے نوجوان اپنے رہنماؤں سے اتنے بیزار ہونگے جتنے مسلمانان ہند کے۔ اس لئے نہیں کہ ہمارے نوجوان کام سے جی چراتے ہیں، قربانیوں سے ڈرتے ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ اس باب میں مسلمان نوجوان کسی سے پیچھے نہیں لیکن جب وہ خلوص و عقیدت، خدمت و ایثار کی نظریں لے کر کبھی اپنے رہنما کے سامنے جاتے ہیں تو انکے دل امیدوں، حوصلوں اور ولولوں سے لبریز ہوتے ہیں۔ مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ یہ جب سے مایوس لوٹتے ہیں۔ پھر جس شدت کی انکی امیدیں تھیں اسی شدت کی مایوسیاں ہوتی ہیں۔ اور یہ شخصی اغراض کو حاصل کرنے میں اپنی قوتیں صرف کرنے لگتے ہیں۔ جماعتی معاملات سے بس اتنا لگاؤ ہوتا ہے کہ فرصت کے اوقات میں اس فطری قوت مبالغہ سے کام لیکر جو شباب کی خصوصیت ہے ان رہنماؤں کی جو سے اپنی مجلسوں میں گرمی یا تفریح کا سامان پیدا کرتے ہیں اور اس طرح قومی کاموں میں بداعتمادی اور مایوسی کی فضا دن بدن قوی تر ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ عقیدہ اب ہندوستان کے مسلمانوں میں عام ہے کہ مسلمانوں کی سیاست ہو یا تعلیم، اصلاح معاشرت کی کوشش ہو

یا تبلیغ دین کی سب کی سب خود پرستی اور شخصی عناد اور ہٹ یا شخصی اغراض کے مظاہر اور پرتو ہیں۔ قومی زندگی کا انتشار اس عقیدہ کی تصدیق کرتا اور تصدیق سے اسے اور قوی بناتا ہے۔

پھر کیا اس قوم کے لئے جس نے دنیا کو چھوڑی خود ہندوستان کے لئے اتنا کچھ کیا کسی اور نے بس اتنا ہی کیا ہوگا اس سے زیادہ نہیں، جس نے اس ملک کے تمدن کی جسم مردہ میں جان ڈالی، جس نے اس کی مذہبی زندگی کو رسمیت کے جمود سے اٹھا کر خلوص کی راہ پر لگایا جس نے اس کی سرزمین پر ایسی عمارتیں کھڑی کر دیں جنہیں آجتک انسانوں کی آنکھیں ہی نہیں آسمان، ستارے بھی حیرت سے دیکھتے ہونگے، جس نے اس کی موسیقی کو جلا بخشا، اس کو ایک نئی زبان دی جو اور سب زبانوں سے زیادہ اس کی قومی زبان بننے کی اہل ثابت ہوئی جس نے اس کی منتشر سیاسی زندگی میں مرکزیت پیدا کی اور اس طرح ایک متحدہ ملک اور قوم کی بنیاد ڈالی، جس کے بہادروں نے اس کی تاریخ کو شجاعت و جوانمردی کے وہ افسانے دیئے جنہیں پڑھ پڑھ کر اسکی آئندہ نسلیں ہمیشہ اپنے دل گرمائیں گی۔ جس کے فقیروں نے بے غرض خدمت خلق کی وہ روایات چھوڑیں کہ اب تک اس ملک میں کوئی مفید سیاسی و سماجی کام ممکن ہے۔ تو کیا اس قوم کے لئے دوسروں کے ظلم و ستم سے نہیں خود اپنی غفلت اور اپنے انتشار سے مستقبل کی کوئی امید نہیں؟ لکھتے ہوئے قلم کانپتا ہے لیکن ہاں، اگر اب اس کے پاس شخصی خودغرضی اور انفرادی خواہش تفوق کے علاوہ جماعتی زندگی کے لئے کوئی تحفہ نہیں تو اس کے رہنما اپنی خودغرضیوں اور خودپرستیوں پر "حقوق المسلمین" کے لاکھ پردے ڈالیں یہ ناگوار حقیقت نہ چھپیگی اور اس بدنصیب جماعت کا وہی حشر ہوگا جو ہر اس مجموعہ کا ہوتا ہے جس کے اجزا میں خودسری پیدا ہوکر اس کے ذرہ ذرہ کو منتشر کر دیتی ہے۔ اور پھر ہوا کا ہر ہلکا سا جھونکا ان دونوں کو جدھر چاہتا ہے اڑائے پھرتا ہے۔

جماعت کے ذروں یعنی افراد میں ارتباط، اشتراک، مقاصد، اشتراک روایات، اشتراک عقائد سے پیدا ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے موجودہ انتشار کو بھی اگر کوئی چیز رفع کرسکتی ہے تو یہی۔ اور جب ہندوستان میں مسلمانوں کی طرف سے ساری گفتگو کی اور حقوق طلبی کی بنا ہی یہ ہے کہ ہم تمدنی شخصیت بھی رکھتے ہیں جسے ہم کسی دوسری سماجی شخصیت میں ضم کرنے کو آمادہ نہیں اور جس کی ہلاکت کو ہم نوع انسانی کا نقصان جانتے ہیں تو مسلمانوں پر اور بھی لازم ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی جماعت کو اپنے مخصوص تمدنی و معاشرتی وظائف سے آگاہ کریں اور انہیں انکے لئے سعی و کوشش کا جذبہ اور اس جذبہ کو بارآور بنانے کے لئے محنت و استقلال کی عادت ڈالیں۔ یہ کام از سرتاپا تعلیمی کام ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک مسلمانان ہند کے لئے وقت کی سب سے بڑی ضرورت انکی ملی تعلیم کا مسئلہ ہے۔

ہندوستان میں سرسید مرحوم کے وقت سے مسلمانوں کی توجہ کم و بیش اس تعلیمی مسئلہ پر رہی ہے لیکن شیرازہ ملی کی عام پراگندگی، معاشی حالت کی پستی، اور حکومت کے شوق نے مسلمانوں کی توجہ تمامتر اسی تعلیم کیطرف رکھی جو انہیں سرکاری ملازمتوں کے لائق بنادے۔ اور اس تنگ نظری کے باعث مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد کے نتائج بہت حقیر اور جماعتی اعتبار سے بہت ہی ناقابل اعتنا رہے۔ اور اس وقت اسی تنگ نظری کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ جب ملک میں جمہوری ادارے قائم ہو رہے ہیں تو مسلمان ان سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ علیگڈھ اور چند دوسری ملی تعلیمگاہوں نے بعض ایسے لوگ تو پیدا کردئے ہیں جو وزارتیں کرنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں اور اہلیت سے زیادہ خواہش بھی۔ لیکن وہ رائے دینے والے ابتک ناپید ہیں جو جداگانہ حلقہائے انتخاب کی صورت میں بھی اچھے نمائندے بھیج سکیں۔ ملک کے موجودہ سیاسی اداروں میں خالص مسلم حلقہائے انتخاب کے چنے ہوئے نمائندوں کے کارناموں پر نظر ڈالئے اور ان کی قابلیت، حالات سے واقفیت، معاملات

کے فہم کا اندازہ لگائیے اور دوسرے نمائندوں سے انکا مقابلہ کیجئے تو سوائے شرم سے سر جھکا لینے کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ غرض ہر لحاظ سے خواہ اپنے تمدنی و مذہبی خصائص کی حفاظت کیلئے خواہ اپنی سیاسی حیثیت کو سنبھالنے کے لئے، ضرورت اس کی ہے کہ مسلمانوں کا تعلیمی نظام اس ملک میں اچھا ہو۔ ہمیں امید ہے کہ اس انتشار کے زمانے میں بھی دو چار مسلمان تو ایسے ہوں گے جو اس اہم مسئلہ پر غور کریں اور مسلمانوں کے تعلیمی پروگرام کو انکی مخصوص ضروریات کے لحاظ سے طے کریں۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر دو چار آدمی ایسے بھی ہونگے جو اپنے بس بھر اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرینگے اور شاید یہی جماعت اپنے کام کی خوبی اور اپنی راہ کی صحت کے سبب بہت سے ساتھی جمع کرلے اور یہ اہم قومی ضرورت پوری ہو جائے

اس باب میں غور طلب مسائل کی تعداد غیر محدود سی ہے لیکن چند چیزیں بہت اہم ہیں اور انپر غور کرنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے وہ مسلمانوں کے لئے سخت مضر ہے۔ سب سے اہم مسئلہ تو غالباً ابتدائی تعلیم کا ہے۔ آیا مسلمانوں کا عام اور لازمی ابتدائی تعلیم کا نظام حکومت کے ہاتھ میں ہونا چاہئے، چاہے وہ پردیسی حکومت ہو چاہے ہندوستانی، انہیں خود اپنا جداگانہ نظام رکھنا چاہئے۔ اس ابتدائی تعلیم میں اپنی مخصوص ضرورتوں کی رعایت کرنا مسلمان ماہرین تعلیم کا نہایت مشکل مگر اتنا ہی ضروری فرض ہے۔ وہ کم سے کم عقیدے کی جگہ ہر مسلمان کے دل میں ہونی ضروری ہے، وہ کم سے کم ملی روایات جن سے آشنائی حیات ملی کے لئے ازبس ضروری ہے۔ وہ ضروری رجحانات جن کے بغیر ایک ملتی ہوئی دنیا میں زندگی ممکن معلوم نہیں ہوتی وہ ضروری عادتیں جنکے بغیر کارزار حیات میں کامیابی کا تخیل بھی ناممکن ہے کسطرح ہر مسلمان میں پیدا کردیجائیں۔ اس ضرورت کو کیسے نصاب تعلیم سے حاصل کیا جاسکتا ہے اور کیسے معلموں کی معرفت یہ سب سوال اپنی جائے کیلئے بہترین قابلیت کے لوگوں کی مخلصانہ فکر کے محتاج ہیں۔

ثانوی تعلیم کے متعلق مسلمانوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ سرکاری پیمانہ پر خود اسکا انتظام کرنے یا

حکومت سے انتظام کرانے کے بجائے اپنی معاشی حالت کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ بہتر نہ ہوگا کہ صنعت و دستکاری کے مدارس کے قیام کی طرف زیادہ توجہ کیجائے۔ اور علمی و ادبی تعلیم کا انتظام صرف ان لوگوں کے لئے ہو جو یا تو اسکی خاص اہلیت رکھتے ہیں یا اپنے وسائل کی فراوانی کے باعث اعلیٰ تعلیم سے بھی فیضیاب ہونا چاہتے ہیں۔ ثانوی تعلیمگاہوں میں اور نیز مخصوص اعلیٰ مذہبی درسگاہوں میں دین کی تعلیم کی طرف بھی فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ کیا دین کی تعلیم کا نام چندے وصول کرنیکے لئے ہی لیا جاتا ہے اور دین کے نام سے غلط سائنس اور نامکمل فلسفہ اور کچھ قانون پڑھایا جائے۔ یا واقعی اس تعلیم سے دین کی عزت و عظمت دل میں پیدا کرائی جائے اور اس سے محبت و تعلق، دل کی صفائی اس کا مقصود ہو یا دماغ پر بوجھ۔ اس ضمن میں موجودہ اسلامیہ اسکولوں اور عربی دینی مدارس کی مذہبی تعلیم کی پوری تحقیق اور اس کے نتائج کی جانچ ازبس ضروری ہے۔ کہ کہیں دین کی جڑ کھوکھلی کرنے کا نامبارک کام بے سمجھے انہیں کی معرفت نہ انجام پا رہا ہو۔

علوم جدیدہ کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق جسپر اب تک مسلمانوں نے اپنی ساری قوت صرف کی ہے، یہ سوچنا ہے کہ اس کے لئے اپنے مخصوص جامعات اور کلیوں کی ضرورت کس حد تک ہے اور اگر ہے تو کیا انہیں سب وہ کچھ کرنا چاہئے جو دنیا کی یا ملک کی اور جامعوں میں ہوتا ہے یا اپنے کام کو محدود کرکے پہلے صرف ان چیزوں پر توجہ کرنی چاہئے جس سے ملت کے اہم فوائد وابستہ ہوں۔ یہ سوچنا ہے کہ ہم اپنی ملی جامعات میں طبعیات و کیمیا، حیاتیات و فلکیات کے اعلیٰ شعبے ایسی حالت میں بھی قائم کریں کہ ان سے چند سو میل پر دوسری تعلیمگاہیں ان چیزوں کی تعلیم کا ویسا ہی یا اس سے بہتر انتظام کر رہی ہیں۔ اور اپنے ملی مدارس کو چلانے کے لئے اچھے معلم تیار کرنیکا کام ہم دوسروں پر چھوڑتے رہیں جو ایسا کام ہے جسے ابھی نہیں کہ دوسرے کرتے نہیں بلکہ کر ہی نہیں سکتے۔ کیا ہم یونان و روما کی تاریخ پر اپنی جامعات میں اس سے بھی پست درجہ کی تعلیم کا انتظام

کرتے ہیں جتنی یورپ کے معمولی سے معمولی مدرسہ میں ہوتی ہے اور ہندوستانی اور اسلامی تاریخ پر تحقیق کا کام پس پشت ڈالکر یورپ کے مستشرقین کیلئے چھوڑ دیں جو باوجود اپنے علم و فضل کے اس تاریخی مواد کے فہم سے بوجہ اختلاف تمدن و اختلاف تخیل بڑی حد تک قاصر ہیں۔

عورتوں کی تعلیم کے متعلق مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آیا وہ اسمیں بھی وہی غلطی کرینگے جو مردوں کی تعلیم میں ان سے ہوئی۔ یعنی اپنی تمدنی متاع کو چھوڑکر دوسروں کے خزانوں سے فائدہ اٹھانیکی ناکام و نامراد کوشش کیا عورتوں کی تعلیم میں بھی کیجائیگی اور اس طرح ایک مضمحل ملت کے بکھرے ہوئے خیرازہ کو بالکل منتشر کردیا جائیگا۔ ہم اپنی عورتوں کو اچھی باتیں بتانے کی کوشش کرینگے یا اچھی دلیل؟ اس سلسلہ میں بھی موجودہ رجحانات بہت خطرناک ہیں اور اگر کسی صحیح رہنمائی نے انکی رفتار کو روکا نہیں تو زیادہ عرصہ نہ گذریگا کہ قیام و بقاء ملت اسلامی کی امید کا یہ آخری مورچہ بھی اندرونی تقلید اور مردہ جمود دونوں کے ہاتھوں سر ہوچکیگا۔ اللھم حفظنا۔

بچوں اور بچیوں، لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے ان مسائل کے علاوہ بالغوں کی تعلیم اور تعلیم عام ضرورت ملی سے دلچسپی اور لگاؤ پیدا کرنیکا مسئلہ بھی مذکورہ بالا مسائل سے کسی طرح کم اہمیت نہیں رکھتا۔ کہ نہ تو اس کے بغیر کم عمر افراد ملت کی تعلیم کا مسئلہ صحیح طور پر حل ہوسکتا ہے اور نہ ملک کے جمہوری اداروں میں شرکت اسکے بدون مسلمانوں کے لئے مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ غرض متعدد مسائل ہیں جنپر غور و فکر کی اشد ضرورت ہے۔ ہم نے صرف چند مسائل کی طرف اس امید سے اشارہ کیا ہے کہ اہل فکر حضرات انکی طرف توجہ کرینگے اور ہم اسے بڑی خوش نصیبی سمجھینگے اگر "جامعہ" کے صفحات ان مسائل پر بحث و نظر کے لئے کام میں لائے جائیں۔ ہمارا قصد ہے کہ ملک کے اہل فکر کو ان مسائل پر اظہار رائے کی علٰحدہ شخصی طور پر بھی دعوت دیں لیکن اس وقت ان سطور کے ذریعہ ناظرین جامعہ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان یا ان جیسے اور مسائل کے متعلق اپنی رائے سے ہمیں مطلع فرماکر ممنون فرمائیں۔

چاند

اور پورا چاند کا دیکھنا اچھا مانا جاتا ہے۔ "دوج" ہو تو مبارک، اور "پورن" ہو تو دلکش ہوتا ہے۔ اردو چاند بھی یہی حال ہے، اس کو دیکھنا صلاح و فلاح کی فال ہے، امن و محبت کا نور پھیلاتا ہے۔ علم و ہنر کی چاندنی چھٹکاتا ہے، آنکھ، دماغ، روح اور دل کے لئے سرمایۂ نور و سرور ہے۔ زن و مرد سب کا خیر خواہ، بچوں کا دل بہلاؤ، بوڑھوں کا ہمدم، جوانوں کا رفیق، اور پژمردہ دلوں کے غنچہ ہائے دل کو کھلانیوالا ثابت ہو رہا ہے۔ آٹھ روپیہ میں ہر مہینہ سوا سو صفحوں سے بھی زیادہ۔ عمدہ کاغذ، صاف لکھائی، اعلیٰ چھپائی، اور نفیس مضامین نثر و نظم کے ساتھ بکثرت دلکش تصاویر کا مرقع دیکھئے اور سال میں ایسی ہی بارہ کتابیں ملاحظہ فرمائیے۔ یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔ نمونہ منگا کر دیکھئے یقین ہے کہ آپ بیحد پسند فرمائینگے، اور دل و جان سے خریدار بنینگے۔ ع "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے"

ایڈیٹر منشی نتھیا لال۔ ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی ایڈووکیٹ۔ چندہ سالانہ مع رشتاہی صرفی جلد بہ رکابی نمونہ بلا قیمت ارسال

نام نامی بلا توقف مندرج فہرست خریداران کرا لیجئے

چاند اردو میں اشتہارات دینا کامیابی کا وسیلہ مقبول ہے مفصل کیفیت نمبر وقر "چاند" (اردو ایڈیشن) چند رلوک، الہ آباد سے دریافت کیجئے۔
ٹیلیفون نمبر ۲۰۵۔
تار کا پتہ "چاند"
خاص نوٹ۔ مضامین نظم و نثر اور تبصرہ یوریل مضامین کی بابت مراسلات بنام ایڈیٹر "چاند" (اردو) ہونا چاہئے۔

نگاہ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں

چاند (اردو) کے دوسرے نمبر کو ایک ہزار زائد شائع کیا گیا۔ اور تیسرا نمبر اور بھی ایک ہزار بڑھایا گیا۔ مگر نمونہ کی مانگ کیلئے کافی نہ ہوا۔ ضرور معلوم ہو گیا کہ پبلک کو "چاند" پسند آیا۔ لیکن چاند کے تو بیز رہنے کیلئے اس کی سخت اور جلد تر ضرورت ہے کہ اس کے مستقل معاون فی ہو جائے تاکہ یہ رسالہ زندہ رہنے کی امید پاکر فراوانی ملک و قوم میں بیش از پیش سرگرمی دکھا سکے۔ اس وقت ہم ذیل میں معاون دوست احباب کی معزز آرا کا خلاصہ دیتے ہیں۔ اس سے پبلک کو چاند اردو کے متعلق صدائے تحسین بلند ہونے کا تصور اظہر ہو جائیگا۔ مالی امداد سے مستفید ہونے کے لئے اس کے قائم و باقی رکھنے کی سرپرستانہ کوشش فرمائیں کیونکہ کوئی رسالہ یا جریدہ جبتک وہ اپنی حیات کی ضمانت نہ پا جائے کبھی گام ہی نہیں دے سکتا۔ اور خدانخواستہ اس کا ابتدائی عمر میں ناکام و معدوم ہو جانا تو اور بھی برا ہے۔ اس سے نہ صرف پریس کا اعتبار جاتا رہتا ہے۔ بلکہ قوم و ملک میں شہرت پر بھی بد نما دھبا لگتا ہے۔ کہ اس کے تغافل سے ہونہار خدمتگار یونہی دنیا سے اٹھ گئے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ناظرین قدردانی اور اعانت سے کام لیکر چاند کی مستقل اشاعت اس قدر بنا دینگے کہ وہ (دراز حال) غروب و زوال کی زد میں نہ آسکے۔ چند آرا کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

معاصرین کی ہمت افزائی

خبار خبردار ہفتہ وار لاہور: "چاند" اردو بھی ہندی چاند کی طرح ہندوستان کی بدرسموں کے دور کرنے میں جد و جہد کر رہا ہے۔ ہم زور سفارش کرتے ہیں کہ اردو داں پبلک اس رسالہ کو ضرور خریدے اور دیکھے کہ وہ خود کہاں ہے اور زمانہ اسے کس جگہ چاہتا ہے؟"

ظام عالم: "ہم بلا خوف ملامت کہہ سکتا ہوں کہ یہ رسالہ جہاں قوم و ملک کے لئے چراغ ہدایت ہے وہاں انفرادی حیثیت سے اس کی سیاسی دنیا کا اچھا حامی اور مذہبی دنیا کا بہترین پیشوا ہے۔ ہم خدا سے پبلک کے دلوں کو اس کی خریداری کی طرف مائل کرنے کی دعا کرتے ہیں۔"

ھنگ سیال لاہور: "اردو علم ادب کی ترقی چاہنے والوں کو بلا جھجک چاند کا خریدار بن جانا چاہیئے۔"

پرکاش لاہور: "چاند (اردو) اس سے بھی زیادہ خوبیوں کے ساتھ اور مقبولیت میں ہندی چاند سے پیچھے نہیں رہیگا۔"

اکالی: "رسالہ کی اٹھان کو دیکھکر اس کی کامیابی یقینی نظر آتی ہے کہ یہ رسالہ بہت ہر دل عزیزی حاصل کریگا۔"

شعلہ ہفتہ وار: "الہ آباد کی ایک یکجان چیز وطن کی یاد اور ملک کی تڑپ اٹھتی ہے۔ اور یکجہتی کی الفت سے اتفاق کے میدان میں پہلی قدم بڑھاتی ہے۔ رسالہ چاند (اردو) ہے۔ اگر ایک طرف ہندو بزرگوں کے اقوال ہیں۔ تو دوسری طرف ہادی اسلام کے بیش قیمت پند و نصائح۔ زبان بھی وہ پسند کیگئی ہے جو کسی کی ملکیت ہے اور نہ مسلمانوں کی۔ بلکہ حقیقت میں تمام ملک کی واحد مشترکہ زبان ہے۔"

حقیقت (روزانہ): "الہ آباد کے رسالہ چاند اردو کو اپنے نام کے مطابق شاندار عید پاتے ہیں۔" (بت سی آرا کا خلاصہ باقی رہ گیا)

ایڈیٹر منشی کنھیا لال ایم اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ۔ الہ آباد

پندرہ سالہ آٹھ روپیہ ششماہی پانچ روپیہ۔ فی طبع ایک روپیہ۔ نمونہ بقیمت نہ جائیگا

چاند (اردو) میں اشتہارات دینا کامیابی کا معقول وسیلہ ہے۔ مفصل

ہم نامی طلا توقف مندرج فہرست خریداران کر لیجئے۔

دفتر چاند (اردو) ایڈیشن اچھند لوک، الہ آباد سے دریافت کیجئے۔

خاص نوٹ۔ مضامین نظم و نثر، تبصرہ، دیگر ایڈیٹوریل مضامین کی مراسلت نام ایڈیٹر چاند اردو ہونا چاہیئے۔

THE NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY
BOOK-DEPOT
DELHI.

The Spirit of Islam: New and revised edition. A History of the evolution and ideals of Islam with a Life of the Prophet. Two new chapters have been added two this new addition, on the Apostolical Succession and on Mysticism, as well as considerable new matter in the Introduction and in the chapter on "The Rationalistic and hilosphical Spirit of Islam" By the Rt. Hon. Syed Amir Ali, P. C., D. L. D. C. I. E.

Rs. 20.

Studies in Persian Literature: An account of the birth of Mohammadan Persia and the Persian Language, and the rise of the Ghazna with a digression on Critics and Persian Literature and a Criticsmof the poetry of Firdawsi, Manuchehri and Unsuri. By Syed Hadi Hasan B.A.,B.Sc.(Cantab)

Rs. 5.

Islamic Culture and National Education: By Dr. Sir P.C. Roy, with a Foreword by A. M. Khwaja, B. A. (Cantab) Bar-at-Law. As. -8-

Lotus and other Poems: Charmingly bound, printed at the Jamia Press in Clear type. The Volume makes an appropriate gift for those who not only appreciate handsome books but desire to read and re-read the books they possess By Eric Dickinson.

Rs. 2-4-

Thoughts on the present Discontent: Reprinted from the "Times of India" and the "Indian Spectator." By Maulana Mohammad Ali.

Re. 1.

اس آنے والے انتخاب میں سیاسی مسائل کو اتنی اہمیت حاصل نہ ہوگی جتنی کہ معاشی مسائل کو۔ ہر امریکی رائے دینے والے کے لئے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ معاشی کساد بازاری کا خاتمہ کیسے ہو، اور پھر سے معمولی صورت حال کیونکر پیدا ہو سکے۔؟ کیا موجودہ صدر مسٹر ہوور کو جو پچھلے انتخاب صدارت کے وقت ہنگامی مشکلات کے حل کرنے میں دنیا کے سب سے بڑے ماہر مانے جاتے تھے، ابھی چند سال اور اس منصب پر رہنے دیا جائے؛ یا انھیں موجودہ مصائب معاشی کا ذمہ دار قرار دیکر رخصت کیا جائے، اور کسی اور کو کام کرنے کا موقعہ دیا جائے؛ امریکن رائے دہندوں میں جو لوگ دونوں مشہور سیاسی جماعتوں سے کوئی گہرا تعلق نہیں رکھتے، وہ ان سوالوں کا جو فیصلہ کریں گے، اسی پر انتخاب کے ادھر یا ادھر ہونے کا انحصار ہے۔

یہ لوگ کسی فیصلہ پر پہونچنے کے لئے ظاہر ہے کہ یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ پچھلے دو سال میں مقدار زر میں کمی کر کے ڈالر کی قیمت کو کیا سہارا دیا گیا ہے یا اس کی ضرورت اس وجہ سے پڑی کہ موجودہ حکومت نے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۹ء تک تجارتی منڈی کی عارضی اور غیر فطری گرم بازاری کی ہر وقت روک تھام نہیں کی تھی؛ دوسرے لوگ پوچھینگے کہ کیا ایسا کرنا ممکن بھی ہوگا، کیا ان حالات پر دنیا کی کوئی حکومت بھی قابو پا سکتی ہے؛ پھر بیچارہ ہوور کا کیا قصور؛ پھر محاصل درآمد کے اضافہ سے درآمد کے ساتھ ساتھ برآمد اجناس میں جو کمی ہوئی ہے اس کا الزام بھی ہوور کے ساتھیوں پر لگایا جائے گا؛ کارخانوں والے ہوور پر الزام لگائیں گے کہ جب کساد بازاری شروع ہوئی تو ہوور نے اس وقت اجرتیں گھٹانے کی سخت مخالفت کی۔ بالآخر یہ تخفیف ہو کر رہی۔ اگرچہ بعد از خرابی بسیار۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اس وقت ہوور نے ایسا نہ کیا ہوتا تو کساد بازاری کی جگہ ایک عام انتشار معاشی رونما ہو جاتا۔ پھر موجودہ حکومت نے بنکوں کو تباہی سے بچانے کے لئے جو فنانس کارپوریشن قائم کی ہے اس کے اثرات و امکانات زیر بحث آئیں گے۔ پھر پچھلی جنگ کے سپاہیوں کے بونس کا مسئلہ ہے کہ انھوں نے حال میں قصر صدارت پر حملہ کر کے ایک عجیب صورت حال پیدا کر دی تھی۔ اسکے بعد انسداد شراب نوشی کا مسئلہ ہے۔ اس باب میں ڈیموکریٹ جماعت میں خود سخت اختلاف ہے۔ بقول امریکنوں کے جنوبی ریاستیں تو بالکل "خشک" ہیں۔ یعنی انسداد کے موافق اور شمالی اور مغربی بالکل "تر" یعنی انسداد کے مخالف۔ انھیں اپنے پروگرام کو ایسی شکل دینی ہے کہ اس خشکی و تری کا امتزاج ہو جائے! ری پبلکن جماعت میں بھی اس مسئلہ پر اختلاف رائے ہے۔ لیکن اتنا نہیں جتنا دوسری جماعت میں۔ صنعتی آبادی زیادہ تر انسداد شراب نوشی کے خلاف ہے۔ اور زرعی آبادی اس کے موافق۔